ماہنامہ

شگوفہ

نصرت ظہیر نمبر

حیدرآباد

قیمت ۳۰۰ روپے

اپریل ۲۰۱۳

www.taemeernews.com

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

اشاعت کا ۴۵ واں سال

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

نصرت ظہیر نمبر

خصوصی مجلد ایڈیشن

جلد ۴۶
شمارہ ۴
اپریل ۲۰۱۳

مہمان مدیر: پروفیسر محمد ظفر الدین

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ــــــ ایڈیٹر اوورسیز: علیم خاں فلکی

سرورق: کے این واصف

اوورسیز کمیٹی

عبدالرحمٰن سلیم (ریاض)
شجاع عاطف (آسٹریلیا)
محمد عمران خاں (ابوظہبی)

مجلس مشاورت

زیندر لوتھر
ایم۔اے۔باسط، آئی پی ایس
سید انوار الہدیٰ، آئی پی ایس
ڈاکٹر محمد علی رفعت، آئی اے ایس

مجلس ادارت

پدم شری مجتبیٰ حسین (صدر)
حمایت اللہ
ڈاکٹر حبیب ضیا
محمد عمران اعظمی
ڈاکٹر نسیم الدین فریس

قیمت مجلد ایڈیشن : ۳۰۰ روپے

کمپیوٹر کتابت: SAM کمپیوٹرس، مغل پورہ
9246 54 3027

شگوفہ انٹرنیٹ پر
www.shugoofa.com

زرِ سالانہ : ۲۵۰ روپے
لائبریریوں سے : ۳۰۰ روپے
بیرونی ممالک سے ۳۵ امریکن ڈالر

Shugoofa Monthly Vol.46 Issue.4 April 2013

Edited and Published by Syed Mustafa Kamal From H.No.10-4-771/82/A/1, Owaisi pura, Masab Tank, Hyderabad-500028. Printed at Daira Press 22-8-43, Chatta Bazar, Hyderabad-2.

Phone: Editor 9885202364, (Off) 24745716, (Res) 23326185.

سب آفس: ۳۱ بچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔ 500001

E-mail: samurdu@yahoo.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

(تعارف)

نصرت ظہیر کی حرکات وسکنات — ادارہ — 7

میں اور ہم — نصرت ظہیر — 10

مہمان اداریہ

نصرت ظہیر۔ ایک خود ساز شخصیت

پروفیسر محمد ظفر الدین — 23

بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں (تنقید)

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا — پروفیسر محمد حسن — 29

نصرت ظہیر، میرا ساتھی — موہن چراغی — 32

نصرت ظہیر اور بقلم خود: ایک جائزہ

ڈاکٹر قمر رئیس — 33

شفیق الرحمن کی طرف...... شجاع خاور — 35

نصرت ظہیر — پروفیسر نثار احمد فاروقی — 36

نصرت ظہیر آدمی خوب ہے

پروفیسر گوپی چند نارنگ — 38

نصرت ظہیر کی ایک کتاب کی رسم اجرا پر

پدم شری مجتبیٰ حسین — 40

نصرت ظہیر کی ظرافت نگاری

اسیم کاویانی — 43

نظر فریب شخصیت اور فن کار

فیاض احمد فیضی — 60

ایک چہرے والا آدمی — حقانی القاسمی — 63

نصرت ظہیر کے طنز میں بے خودی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی — 68

ادیب باشمشیر۔ نصرت ظہیر — اسد رضا — 74

نصرت ظہیر، ایک بے نظیر شخصیت

ظفر عدیم — 77

نصرت ظہیر کا سیاسی طنز ومزاح

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد — 83

نصرت ظہیر کی طنز نگاری — سراج نقوی — 87

نصرت ظہیر کی کثیر جہتی — فاروق ارگلی — 89

www.taemeernews.com

انتخاب مضامین نصرت ظہیر

میں اور میں	نصرت ظہیر	91
امروہے کا جو ذکر کیا	نصرت ظہیر	96
مسلمان اور پیاز	نصرت ظہیر	99
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے	نصرت ظہیر	102
ایک اخباری بیان ہو جائے	نصرت ظہیر	107
ہوئے جی کے ہم جو رسوا	نصرت ظہیر	110
خوابوں کی جھگی بستی	نصرت ظہیر	114
پچیس گز کا مکان	نصرت ظہیر	117
مہنگائی کی ایف آئی آر	نصرت ظہیر	123
طلسمی انگوٹھی	نصرت ظہیر	126
اردو کے ادبی معمے	نصرت ظہیر	128
قصۂ پانچ درویش	نصرت ظہیر	132
ویرپن کا صوتی روزنامچہ	نصرت ظہیر	146
الوداع اے ماہِ رمضاں	نصرت ظہیر	151
شادیاں، ناشادیاں	نصرت ظہیر	153
اف یہ سفرنامے	نصرت ظہیر	158
اکیسویں صدی کی الجھنیں	نصرت ظہیر	161
منشی ثنا احمد صبر و عصر مرحوم	نصرت ظہیر	163
کباڑی بازار کی سیر	نصرت ظہیر	168

کلام نصرت ظہیر

غزلیں	171
نظمیں: ایک نظم اپنے لیے	172
ہم سفر، گریز	173

اردو کی ایک کارٹون ساز جوڑی

میری کارٹون نویسی	نصرت ظہیر	174
نصرت ظہیر، پریش ناتھ کے چند کارٹون		175
دے کے خط	مراسلے	179
	اداریہ	181

شگوفہ کے

حسب ذیل یادگار خصوصی نمبر دستیاب ہیں

مجتبیٰ حسین نمبر	قیمت 200 روپے
یوسف ناظم نمبر	قیمت 200 روپے
پرویز یداللہ مہدی نمبر	قیمت 70 روپے
۳۷ سالہ سالگرہ نمبر	قیمت 60 روپے

خصوصی شمارے رجسٹرڈ پوسٹ ارسال کیے جائیں گے

www.taemeernews.com

With Best Compliments from :

ALAM PRINTERS

\# 1-7-141, MUSHEERABAD,
HYDERABAD - 500 048.

چائے کی دُنیا میں
کامیاب چائے

ہائی ویا چائے

ملنے کا پتہ
نیشنل ٹی ڈپو
نامپلی بازار حیدرآباد
فون 23214076 - 23210072

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر کی حرکات وسکنات

جو اپنا حال ہے سب اپنی حرکتوں سے ہے
دعا کسی کی نہیں بددعا کسی کی نہیں

سردار انور

معروف نام : نصرت ظہیر

اصل نام : ظہیر احمد

اس نام میں بعد کو نصرت کا بطور تخلص اضافہ ہوا، اور ایک کاتب صاحب کی بنائی ہوئی اخباری لوح کی وجہ سے نصرت ظہیر بن کر رہ گیا کیونکہ انہوں نے اوپر نصرت اور نیچے ظہیر لکھ کر ڈیزائن بنایا تھا۔اس ڈیزائن نے انھیں ادب اور صحافت میں نصرت ظہیر بنا دیا اور سرکاری کاغذات میں پورا نام نصرت ظہیر احمد لکھا جاتا ہے

پیدائش : ۹ مارچ ۱۹۵۱ سکندرآباد، ضلع بلند شہر، یوپی

پرورش : سہارنپور

والد : جناب عبدالعزیز قادری، نعت گو، صاحب مجموعہ شاعر (سہارنپور اترپردیش میں مقیم)

والدہ : محترمہ امینہ بیگم، (انتقال پر ملال بعارضہ کینسر ۱۷ دسمبر ۱۹۹۴)

تعلیم : ابتدائی تعلیم مدرسہ مخزن العلوم، و بیسک پرائمری اسکولز، ثانوی تعلیم اسلامیہ انٹر کالج سہارنپور، گریجویشن میرٹھ یونی ورسٹی

ہجرت : دہلی، یکم جنوری ۱۹۸۱

طنز و مزاح :

پہلا مزاحیہ مضمون ۱۹۸۱ میں ماہنامہ 'یوجنا' نئی دہلی کے لیے لکھا، اسی سال انور دہلوی کی ادارت میں شائع ہونے والے روزنامہ ''عوام'' کے لیے چند مزاحیہ مضامین لکھے۔

طنزیہ مزاحیہ کالم نگاری:

۱۹۸۵ میں بات سے بات چلے، کے عنوان سے روزنامہ قومی آواز دہلی کے لیے روزانہ کالم لکھا جو ایک معلوماتی کالم تھا۔

جولائی ۱۹۸۷ میں قومی آواز کے لیے ہفتہ وار کالم 'دہلی ڈائری' لکھنا شروع کیا۔

اکتوبر ۱۹۸۷ سے تحت اللفظ کے عنوان سے یومیہ کالم شروع کیا جس سے طنز و مزاح لکھنے کا باقاعدہ سلسلہ دراز ہوا۔اس دوران کچھ عرصہ 'وغیرہ وغیرہ' کے عنوان سے روزنامہ اخبار مشرق' دہلی کے لیے بھی مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔'بقلم خود' کے عنوان سے قومی آواز کے سنڈے ایڈیشن میں ادبی خاکوں کا ایک مزاحیہ کالم بھی کئی سال تک لکھا۔اسی ایڈیشن کے لیے' ابن بطوطہ کا دوسرا سفر' کے عنوان سے ایک طنزیہ مزاحیہ ناول بھی لکھا جو ۱۹۹۳ سے ۱۹۹۴ کے دوران قسط وار شائع ہوا۔

کارٹون نویسی :

روزنامہ قومی آواز کے لیے ۲۰۰۱ میں انگریزی روزنامہ نیشنل ہیرالڈ کے کارٹونسٹ اور عالمی شہرت یافتہ سیاسی کارٹون نگار پریش ناتھ کے ساتھ مل کر روزانہ کارٹون پیش کئے۔ کارٹون کو conceive کرنا اور اس کا اسکرپٹ لکھنا نصرت ظہیر کا کام تھا۔ یہ سلسلہ ایک سال سے زائد عرصہ تک چلا اور ایڈیٹر سے اختلافات کی بناء پر بند ہوا۔

ٹیلی ویژن :

ای ٹی وی اردو کے لیے ۲۰۰۰ میں مجتبیٰ حسین صاحب کے مزاحیہ مضامین پر مشتمل ۵۲ اپی سوڈ والے سیریل' عجب مزا

غضب مرزا کے ۳۲ اپی سوڈ لکھے۔

ای ٹی وی اردو کے لیے ۲۰۰۲ میں ۱۳ اپی سوڈ پر مشتمل اردو کے مزاحیہ ادب کا سیریل تحریر کیا اور اینکرنگ بھی کی۔

دور درشن کے متعدد مشاعروں، مباحثوں میں شرکت کی اور انٹرویوز میں حصہ لیا۔

ڈی ڈی اردو نے 'قلم کے سپاہی' کے تحت نصف گھنٹے کی ڈاکیومنٹری نصرت ظہیر پر پیش کی (۲۰۱۰)

ریڈیو :

دہلی میں آکاش وانی کی تمام ہندی اردو چینلوں کے لیے (ایم ایف چینلز کے سوا) حالات حاضرہ پر مختلف پروگرام لکھے۔ بے شمار تقریر یں نشر کیں اور مزاحیہ مضامین پڑھے۔

کتابیں :

نثری انتخاب :

تحت اللفظ	(۱۹۹۲)
بقلم خود	(۱۹۹۷)
خرانٹوں کا مشاعرہ	(۲۰۰۲)
نمی دانم	(۲۰۰۸)

دیگر تصانیف:

طنزیہ مزاحیہ ناول:

ابن بطوطہ کا دوسرا سفر (۱۹۹۳ اور ۱۹۹۴ کے دوران روزنامہ 'قومی آواز' نئی دہلی کے ہفتہ وار ضمیمے میں بالاقساط شائع ہوا)

شعری مجموعہ:

دریں اثنا (زیر طبع)

کئی نثری مجموعوں کے مسودے اشاعت کے لیے تیار ہیں۔

صرف آخری نثری انتخاب 'نمی دانم' جو پینگوئن نے شائع کیا اس وقت بازار میں دستیاب ہے۔ دیگر مطبوعہ انتخابات کے نئے ایڈیشن زیر اشاعت ہیں۔

تراجم:

پینگوئن انڈیا نے جو پہلی اردو کتاب شائع کی تھی 'تہاڑ جیل میں میرے شب و روز' اس کا ترجمہ انگریزی سے نصرت ظہیر نے کیا تھا جس پر ۲۰۰۸ میں ساہتیہ اکادمی نے اردو ترجمہ کا ایوارڈ دیا۔

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ انگریزی ناول 'رچ لائک اُس' (Rich Like Us) از نین تارا سہگل کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے جو جلد شائع ہونے والا ہے۔

بیرونی سفر :

۲۰۰۵ میں سفر افغانستان، ملک کے پہلے جمہوری انتخابات کی کوریج کے لیے۔ کابل اور غزنی میں قیام رہا۔

۲۰۰۷ میں کیوبا کا دورہ کیا جہاں راجدھانی ہوانا میں International Conference to Safeguard Cultural Diversity of the World منعقد ہوئی۔ نصرت ظہیر نے ۶ رکنی ہندوستانی وفد میں اردو کی نمائندگی کی۔

۲۰۰۷ میں لندن کا دو مرتبہ دورہ کیا۔ لندن یونیورسٹی میں نصرت ظہیر کے اعزاز میں جلسہ و مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔

۲۰۱۰ میں سعودی عرب کا دورہ کیا، جدہ اور ریاض کے مشاعروں میں شرکت کی اور مکہ و مدینہ میں عمرہ و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ جناب شہریار اس سفر میں ساتھ تھے اور اسی دوران انہیں گیان پیٹھ ایوارڈ دینے کا اعلان ہوا۔ ان کے علاوہ عبدالاحد ساز، وسیم بریلوی، انور جلال پوری، ندیم صدیقی، نصرت مہدی وغیرہ ہمراہ تھے۔

صحافت :

یکم جنوری ۱۹۸۱ سے ستمبر ۱۹۸۴ تک روزنامہ ملاپ نئی دہلی میں سب ایڈیٹر رہے اور جناب فکر تونسوی کی رفاقت نصیب ہوئی۔

ستمبر ۱۹۸۴ سے جولائی ۱۹۸۶ تک روزنامہ تیج دہلی میں میگزین ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

جون ۱۹۸۷ سے مارچ ۲۰۰۸ تک روزنامہ قومی آواز نئی دہلی میں چیف رپورٹر اور اسپیشل کارسپونڈنٹ کے طور پر کام کیا۔

۲۰۰۵ میں قومی اردو کونسل کے دیوناگری رسم الخط میں شائع ہونے والے 'اردو درپن' کی اعزازی ادارت سنبھالی۔

www.taemeernews.com

۲۰۰۶ میں نقوش اور فنون کی طرز پر ضخیم ادبی جریدہ 'ادب ساز' شروع کیا جسے کافی مقبولیت ملی۔

۲۰۰۷ میں 'ادب ساز' کا پہلا خاص نمبر ۱۸۵۷ کے واقعات کی ڈیڑھ صدی پر شائع کیا۔

۲۰۱۰ میں 'ادب ساز' کا دوسرا خاص نمبر ساحر لدھیانوی کے فن اور شخصیت پر شائع کیا جسے ساحر پر سب سے بہتر اور بسیط کام مانا گیا ہے۔

۲۰۰۹ سے ۲۰۱۰ تک 'عالمی سہارا' ویکلی نیوز میگزین کی ادارت کا کام سنبھالا جسے نصرت ظہیر نے ایک بہتر اور نئی شکل دی۔

۲۰۱۰ میں قومی اردو کونسل NCPUL سے وابستگی اختیار کی اور اس کے ماہنامہ 'اردو دنیا' اور سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کے تا حال اعزازی مدیر ہیں۔ ڈائرکٹر نے قومی اردو کونسل کے شعبۂ ادارت کا سربراہ بھی مقرر کیا۔ نصرت ظہیر نے کونسل کے ڈائرکٹروں ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ اور ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کی مدد و نگرانی اور مرکزی وزیر جناب کپل سبل کے مشیر ڈاکٹر عزیز برنی کی ایما پر 'اردو دنیا' کی شکل بھی بدل کر رکھ دی اور آج یہ اردو کا سب سے زیادہ شائع ہونے اور خریدا جانے والا سرکاری رسالہ بن گیا ہے۔

اعزازات:

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ترجمہ ۲۰۰۸ (افتخار گیلانی کی کتاب 'مائی ڈیز ان پریزن' کے انگریزی سے اردو ترجمے 'تہاڑ جیل میں میرے شب و روز' کے لیے)

دہلی اردو اکادمی کا بہترین کالم نگار ایوارڈ (۱۱ ہزار روپے)

دہلی اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے 'تحت اللفظ'، 'بقلم خود' اور 'خراٹوں کا مشاعرہ' کو علی الترتیب ۱۹۹۲، ۱۹۹۷ اور ۲۰۰۳ کی بہترین مزاحیہ کتابوں کے ایوارڈ، نقد رقم، توصیف ناموں اور مومنٹو کے ساتھ۔ بہترین اردو صحافی کا ماتری شری ایوارڈ ۱۹۹۴ میں۔

توصیفات:

پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر نثار احمد فاروقی، شجاع خاور، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر اسلم پرویز، پدم شری مجتبیٰ حسین، جیسے مشاہیر ادب نے نصرت ظہیر کی مزاح نگاری کو اپنی تحریروں میں سراہا۔ پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے تحریروں میں کم لیکن تقریروں میں زیادہ پذیرائی فرمائی۔

اہم کارگزاریاں:

آکاشوانی اور دوردرشن کی اردو خبروں میں شری اور شریمتی، راشٹر پتی، پردھان منتری، مکھیہ منتری اور راجیہ منتری جیسے غیر اردو الفاظ زبردستی اور بر بنائے تعصب استعمال کیے جانے کے سرکاری رویے کے خلاف اردو کے لیجینڈری نیوز ریڈر جناب مصطفیٰ علی اکبر کی 1996 میں فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر بسلسلہ وار رپورٹیں شائع کیں، جن سے حکومت حرکت میں آئی اور تقریباً چالیس سال پرانا حکم نامہ منسوخ کر کے جناب، محترمہ، صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ اور وزیر مملکت جیسے اردو الفاظ اور اردو لہجے کی بحالی کا نیا حکم جاری کیا گیا۔ اسے بھی نصرت ظہیر اپنے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں سمجھتے۔ انجمن ترقی اردو نے اس کارنامے پر ہفتہ وار 'ہماری زبان' میں اداریہ لکھا اور ایک تہنیتی جلسہ منعقد کیا۔

رکنیت:

گورننگ کونسل دہلی اردو اکادمی، 1999 - 2001

پریس ایکریڈیٹیشن کمیٹی، دہلی حکومت 2000 - 2009

پریس کلب آف انڈیا، 1988 سے تا حیات

رابطہ:

ای میل: nusratzaheer@gmail.com

موبائل: 9716145593 اور 9810246182

دفتر: اعزازی سربراہ شعبۂ ادارت، قومی اردو کونسل NCPUL فروغ اردو بھون، جسولا انسٹی ٹیوشنل ایریا، نئی دہلی۔ 110025

رہائش: سی 280 سیکنڈ فلور، فرنٹ سائڈ، ابوالفضل انکلیو پارٹ ـ 2، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

ـــــ ادارہ

www.taemeernews.com

میں اور ہم

میں...

ضلع بلند شہر (اتر پردیش) کی تحصیل سکندر آباد کے محلہ بھائیہ واڑہ میں ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا، مغربی اتر پردیش کے شہر سہارنپور میں آنکھ کھولی مگر احتیاطاً ہوش نہ سنبھالا کہ والد صاحب " کافی غصہ والے آدمی تھے۔ پھر محمد علی جوہر لائبریری، مسجد خانی باغ نخاسہ، میونسپل اسکول محلہ انصاریان محلہ شاہ بہلول اور مدرسہ مخزن العلوم کے لائق ترین مولوی صاحبان اور اساتذہ کرام کی قمچیوں کے سائے میں الف بے تے پڑھی، مگر عقل نہ آئی۔ چنانچہ بالغ ہونے کے لیے اسلامیہ انٹر کالج سے رجوع کیا، جہاں نورانی صورت اور روشن دماغ استادوں نے علم کی ایسی پیاس بڑھائی کہ نکسل باڑی تحریک سے جنم لینے والی باغی انقلابی پارٹی سی پی آئی (ایم ایل) کو باقاعدہ گلے لگا کر مارکس، اینجلس، لینن اور ماؤزے تنگ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرلیا۔ اس کے بعد شاعری کی، خواب دیکھے، دہرہ دون کے تاریک جنگلوں میں سرخ انقلاب کو آواز دی، کوئی جواب نہ ملنے پر دوبارہ بستیوں کا رخ کیا، سی پی آئی (ایم ایل) کو چھوڑ کر سی پی آئی کو اپنایا، ایمرجنسی میں جیل یاترا کی، جنتا پارٹی کی حکومت میں جیل اور مقدمے جھیلے اور نہ جانے کیا کیا ہوا، مگر انقلاب نہ آیا! اس دوران کسی طرح گریجویشن کیا، میکینکل کاموں اور الیکٹرانکس کا شوق ہوا تو آئی ٹی آئی اور ریڈیو انسٹی ٹیوٹ تربیت حاصل کرکے شوق کو روزگار بنالیا۔ ابھی معاملہ کچھ آگے بڑھا ہی تھا کہ نہ جانے کس طرف سے اردو صحافت نے آکر آغوش میں لے لیا اور کسی امربیل کی طرح پورے وجود سے لپٹ گئی۔ شاید یہی دیکھ کر شاعری نے دھڑ سے اپنے دروازے بند کرلیے اور ایک شاعر، سابق شاعر بن گیا۔ اسی کے عشرے کی پہلی تاریخ سے زندگی کا دوسرا سفر دہلی میں شروع کیا۔ روزنامہ ملاپ، تیج، سروتم ریڈرس ڈائجسٹ اور ریڈیو وغیرہ میں جم کر کام کیا، جون 1987 میں وقت کے ہاتھوں نے کان پکڑ کر روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی کے دفتر میں رپورٹر بنا کر بٹھادیا اور ابھی وہاں کام کرتے ہوئے چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھ دیا۔

...اور ہم

شیکسپیئر نے کہا تھا، نام میں کیا دھرا ہے؟ ہم نے یقین کرلیا۔ مگر یہ ایک بھول تھی جس کا احساس تب ہوا جب ہماری نظر خود اپنے نام پر گئی اور ایک قدرداں کا وہ خط ملا جو القاب و آداب کے بعد اس طرح شروع ہوتا تھا... "گستاخی معاف میں ایسے کئی خانوں کو جانتا ہوں جو نصرت ہیں، اور کئی ایسی نصرتوں سے واقف ہوں جو بانو یا بیگم ہیں۔ آپ کیا ہیں یہ بھی بتا دیجیے تاکہ قلب کو اطمینان ہو اور آپ کو صحیح القاب و آداب کے ساتھ خط لکھا جاسکے۔" ایک تعریفی خط کی پیشانی پر ہمارے نام سے پہلے احتیاطاً محترم، محترمہ لکھا گیا چنانچہ ہمیں بھی احتیاطاً خط کو تلف کردینا پڑا۔ ایک صاحب سیدھے مطلب کی بات پر اتر آئے۔ انہوں نے لکھا... "جب سے آپ کی تحریریں قومی آواز میں چھپنا شروع ہوئی ہیں، بے قراری کا عجب عالم ہے۔ نہ دن کو سوسکتا ہوں، نہ رات کو جاگ سکتا ہوں۔ ہر وقت بس آپ کا تصور رہتا ہے۔ ایک تازہ ترین تصویر عنایت فرمادیں تو بڑی عنایت ہو۔ نیز معلوم ہو کہ بندہ آٹے کی دو چکیوں کا مالک اور صاحب جائیداد ہے اور آمدنی چار پانچ ہندسوں کے درمیان ہے۔ پہلی بیوی کو طلاق ہوچکی ہے اور اس سے کوئی بچہ بھی نہیں ہے۔ لہٰذا زیادہ کیا تحریر کروں، سمجھدار کو اشارہ کافی ہے۔ جواب سے مطلع فرمائیں۔" تصویر میں ان کے ایک ہاتھ پر ایک طوطا بیٹھا تھا اور دوسرا ہاتھ مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور مونچھوں کی ری ٹچنگ فوٹوگرافر نے بڑی محنت سے کی تھی۔ اس خط نے ہمیں صورت حال کی سنگین نوعیت کا احساس دلادیا۔ سوچا کیوں نہ مضمون کے ساتھ اپنی تصویر بھی چھپوادیں، شائقین کی غلط فہمی خود بخود دور ہوجائے گی۔ ہم نے فوراً جیب سے اپنا فوٹو نکالا اور ایڈیٹر صاحب کو اپنی تجویز سے آگاہ کردیا فوٹو دیکھتے ہی وہ بولے... "اول تو ہم نیگیٹو نہیں چھاپتے۔ پھر تم مونچھیں بھی نہیں رکھتے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تصویر چھپنے کے بعد یہ غلط فہمی کوئی تیسرا رخ اختیار کرلے۔ تمہارا تو خیر کچھ نہیں۔ البتہ اخبار پر حرف آجائے گا۔" ہم منہ لٹکائے ان کے کمرے سے باہر آگئے۔ آپ ہی بتائیے ہم کیا کریں؟

(بقلم خود سے)

www.taemeernews.com

والد محترم جناب عبدالعزیز قادری

والدہ محترمہ امینہ بیگم (انتقال 17 دسمبر 1994)

نصرت ظہیر 1973 سہارنپور

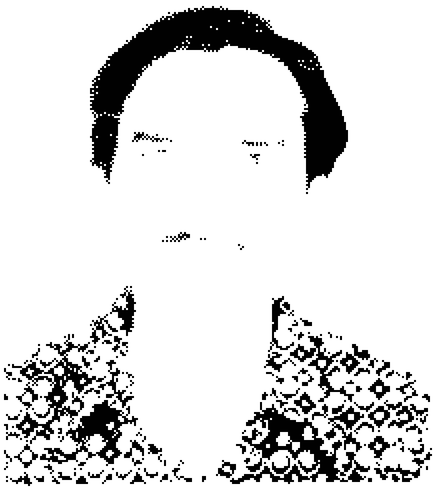

نصرت ظہیر 1969 سہارنپور

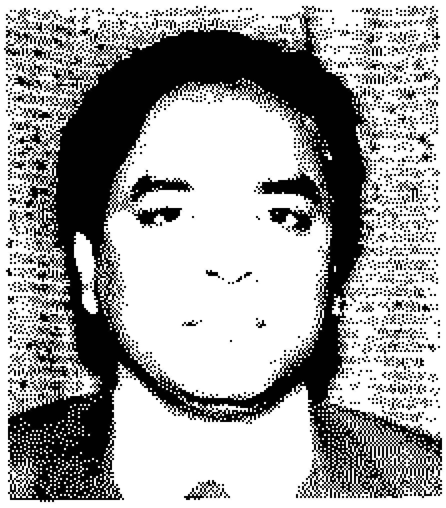

مزید تصاویر: 1982 دہلی

اپریل 2006 ممبئی (از شاہد کمال)

جون 2007 لندن (از [illegible] تقوی)

اگست 2012 (از [illegible])

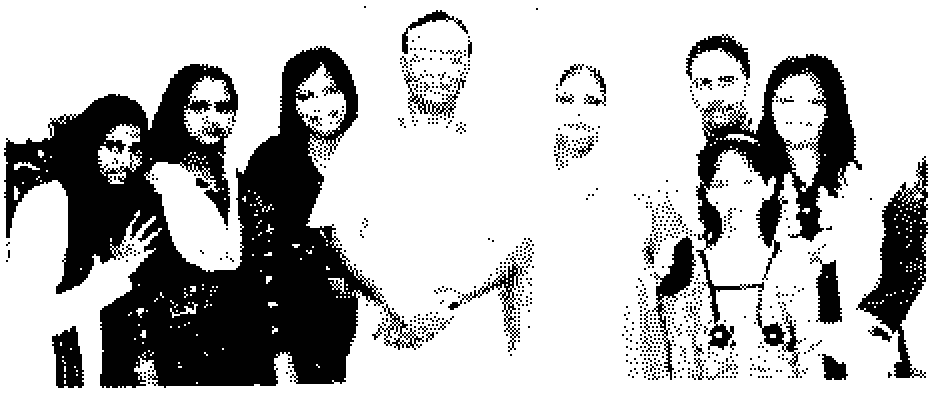

تاج محل کے سائے میں: نصرت ظہیر اور بیگم ظہیر (ستارہ بانو) بیٹی ثمینہ محمد فیضان (داماد)، شبنم، روشن آرا (مسز فیضان) اور ترنم کے ساتھ، دوسری تصویر میں چاروں بیٹیاں 2012

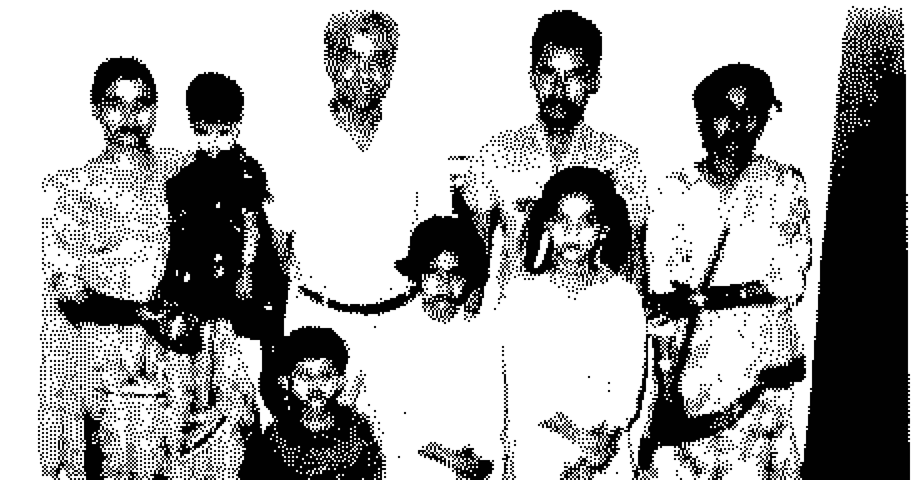

(دائیں تصویر) چاروں بیٹیوں کے ساتھ 2000 دہلی (بائیں) خالہ زاد بھائی مرحوم شمشاد برنی (پاکستان) مسز شمشاد، ان کی بچی، ستارہ بانو اور تین بیٹیوں کے ساتھ 1986 دہلی

www.taemeernews.com

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما سے راشٹرپتی بھون کی تقریب بسلسلہ نقشِ خود میں مصافحہ کرتے ہوئے، ساتھ میں اسرار جامعی اور منصور آغا (پیچھے) 1997

مشاعرہ جشنِ ساحر میں نظم خواں 2010 لدھیانہ۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی قیادت میں ڈاکٹر شنکر دیال شرما کو نقشِ خود کا نسخہ پیش کرتے ہوئے، ساتھ میں ڈاکٹر شفیق الحسن

مشاعرہ جشنِ ساحر میں نواز دیوبندی، حسیب سوز اور کیول دھیر کے ساتھ 2010

دہلی اردو اکادمی کی تقریب میں ضمیر حسن دہلوی، طراج کول، پروفیسر نصیر احمد کے ساتھ اسٹیج پر 2001 دہلی

www.taemeernews.com

مئی 1981 میں روزنامہ ملاپ دہلی کے لیے شیخ حسینہ واجد کا انٹرویو ریکارڈ کرتے ہوئے جو ڈھاکہ میں آرہی ہوں کے عنوان سے پورے صفحے پر شائع ہوا۔ بعد میں وہ بنگلہ دیش کی حکمراں بنیں

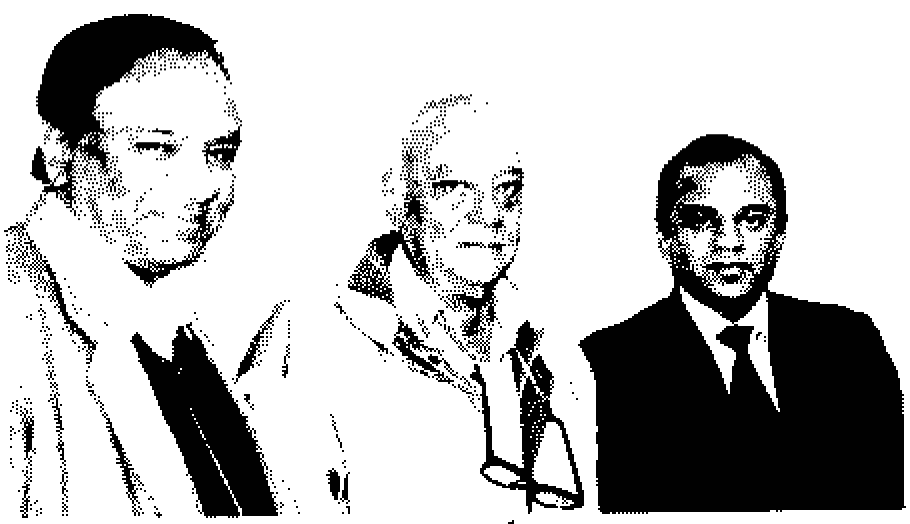

میڈیا پرسنالٹی منوج رستوگی اور فکشن نگار انل ٹھکر کے ساتھ 2009 دہلی

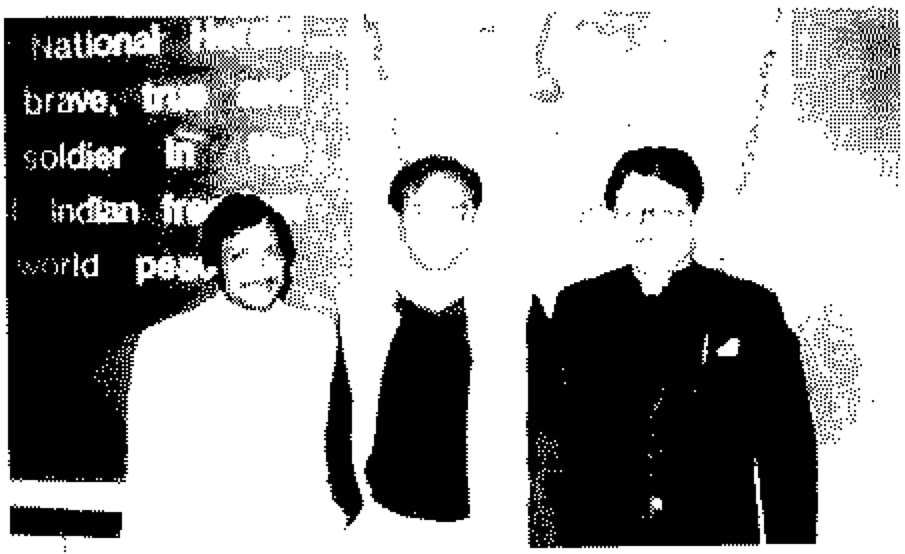

شاعر دوستوں پارس ناتھ اور دیویندر ماجھی کے ساتھ ہیرالڈ ہاؤس نئی دہلی میں 1992

جدہ کے مشاعرے میں شعرا کے ساتھ ستمبر 2010

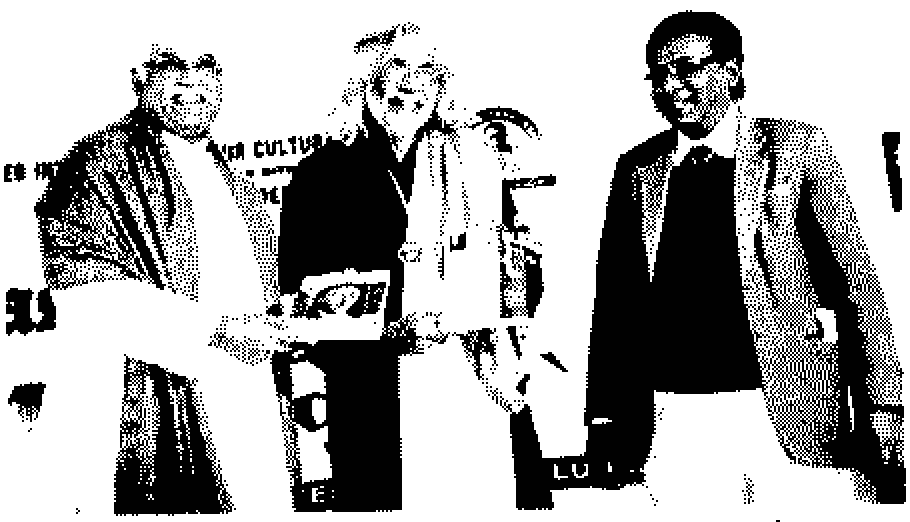

جشن ساحر میں فلم ساز مظفر علی اور ڈائریکٹر نیل بھارتی کے ہمراہ راکیش متل کو ادب ساز کا ساحر لدھیانوی نمبر پیش کرتے ہوئے 2010 لدھیانہ

www.taemeernews.com

ساحر لدھیانوی پر ادب ساز کا خاص شمارہ جاری کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ان کے ساتھ، اسد رضا، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ، پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر عزیز برنی، چندر بھان خیال، ڈاکٹر کیول دھیر، نصرت ظہیر اور ڈاکٹر اطہر فاروقی۔ یہ تقریب، ساہتیہ اکادمی کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی، 2011 نئی دہلی

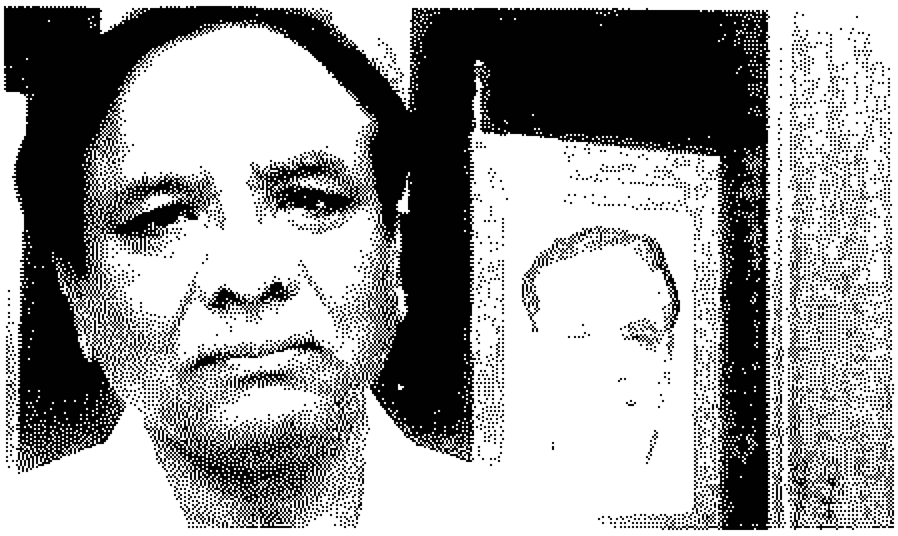

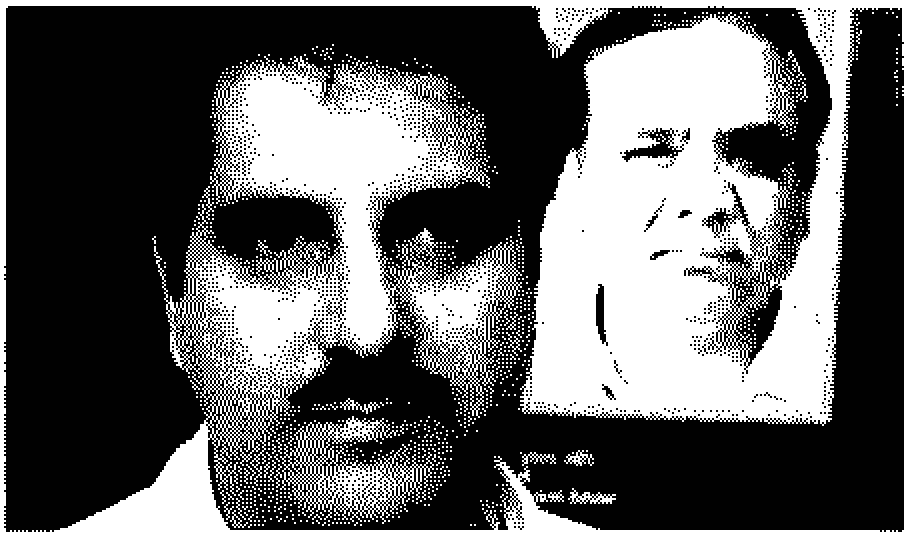

افتخار گیلانی (بائیں) کی کتاب مائی ڈیز ان پریزن کے اردو ترجمے تہاڑ میں میرے شب و روز پر ساہتیہ اکادمی کا ترجمہ ایوارڈ ملنے کی تقریب میں نصرت ظہیر اور مصنف۔ بنگلور 2009

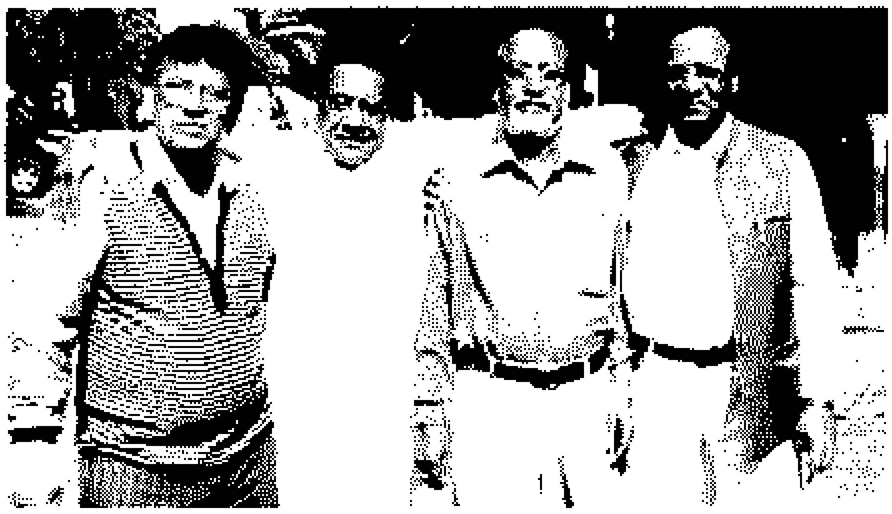

چندر بھان خیال، پروین کمار اشک اور جمشید مسرور (ہالینڈ) کے ساتھ کولکاتا میں 2011

ساہتیہ اکادمی کی تقریب میں پروفیسر وہاب اشرفی کی تقریر بغور سنتے ہوئے ڈاکٹر مولا بخش کے ساتھ، 2011 دہلی

شمالی ریلوے کے پریس ٹور پر ہماچل میں 2003

www.taemeernews.com

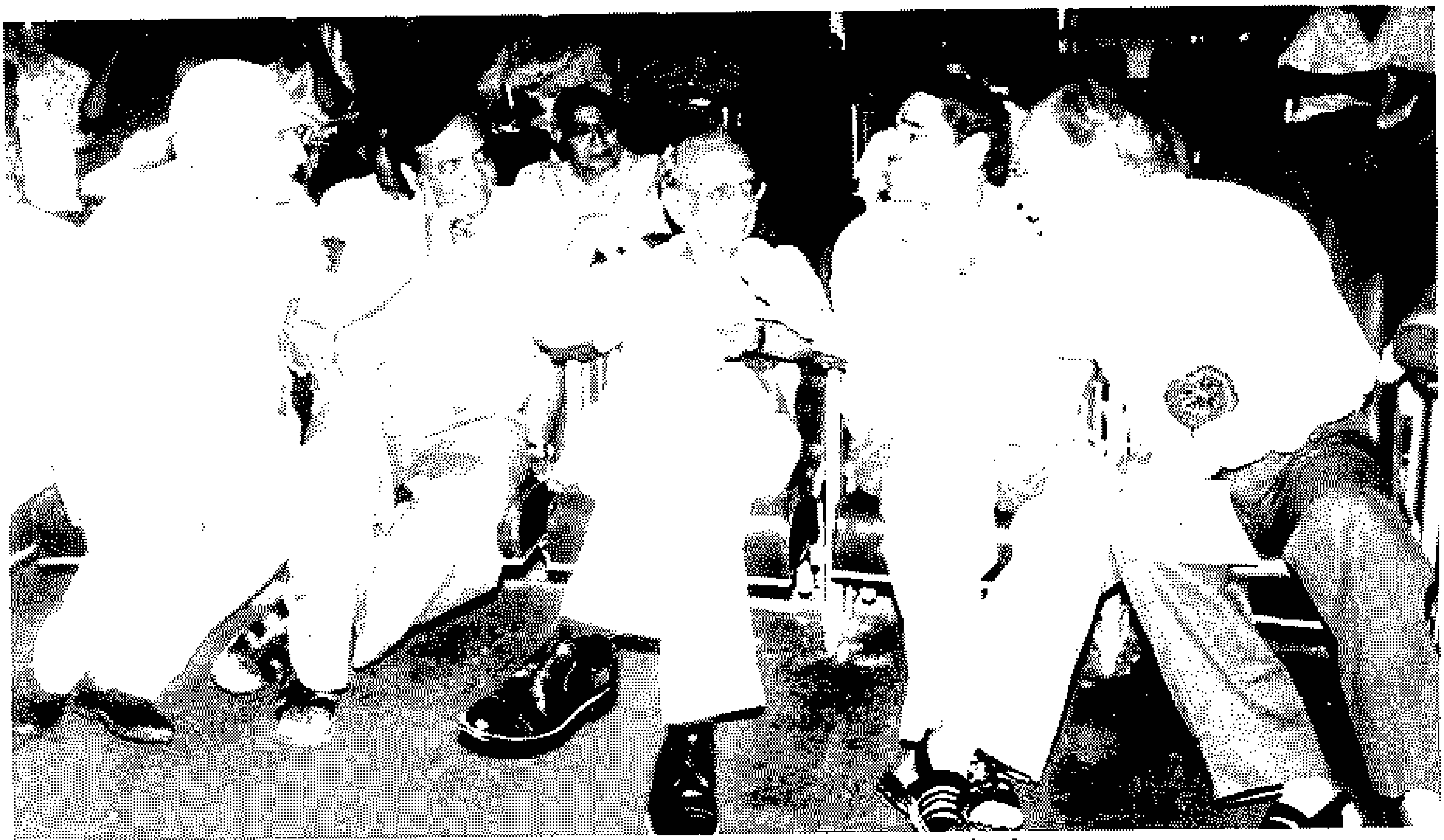

ایک بولتی ہوئی تصویر: پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر محمد حسن اور پروفیسر اشتیاق عابدی کی باتیں سنتے ہوئے۔ 2000 نئی دہلی

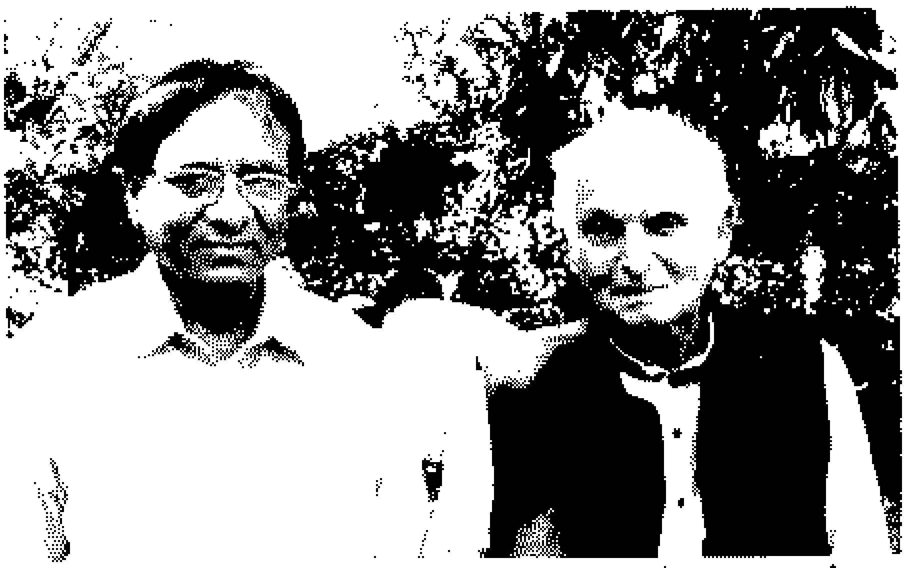

گلزار صاحب کے ساتھ کولکاتا میں، 2010، بائیں: انتظار حسین کے ساتھ ممبئی یونیورسٹی میں 2006

گلشن کھنہ کے ساتھ ان کی تخفتاوی گی قیمیں میں ہیتھرو ہوائی اڈہ لندن پر بوقت رخصت تصویر کھنچواتے ہوئے

2007

کولکاتا میں ماہنامہ انشا کی سلور جوبلی پر منعقدہ

ایک بین الاقوامی سیمینار میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، چندر بھان خیال اور عطاء الحق قاسمی کے ساتھ 2010 کولکاتا

www.taemeernews.com

ماہنامہ انشاء کی سلور جوبلی پر منعقدہ تقریب میں مدیر انشاء ف س اعجاز پر ایک خاکہ پڑھتے ہوئے۔ 2010 کولکاتا

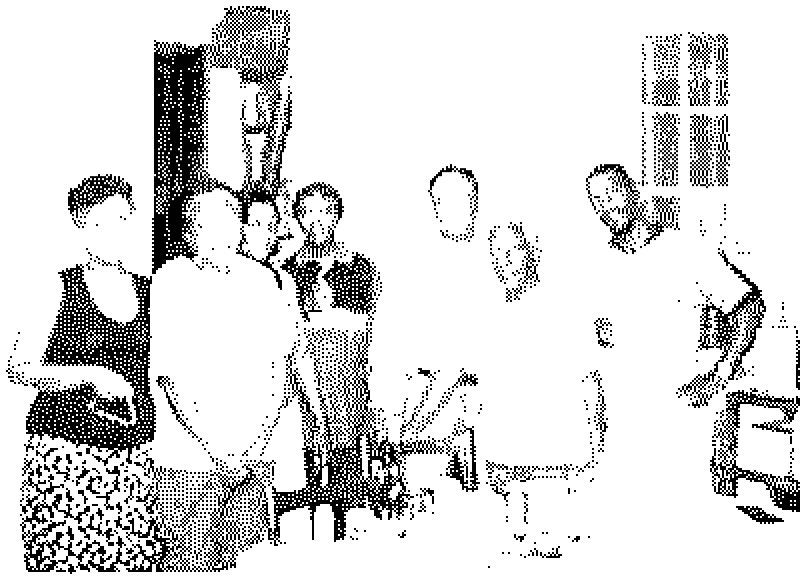

ہوانا میں کیوبا کے ایک شاعر اور ان کے کنبے کے ساتھ عشائیے پر۔ 2007

ہوانا (کیوبا) میں انگریزی ادیب کے این دارووالا (بائیں) کے ساتھ اس مقام پر جہاں کولمبس آیا تھا 2007

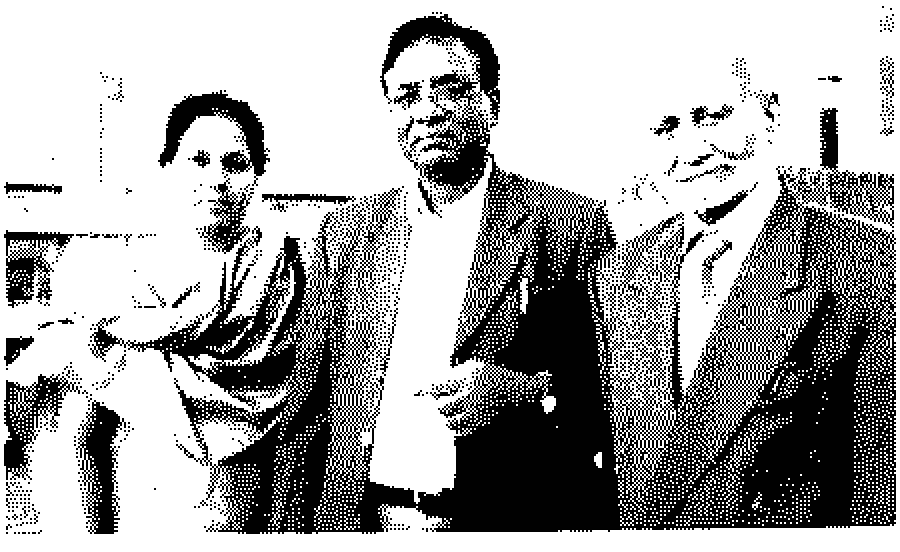

برطانوی ادیب عبدالغفار عزم اور شاعرہ منزہ شاد کے ساتھ لندن میں

www.taemeernews.com

ساہتیہ اکادمی کے پہلے کل ہند مزاحیہ ادب سیمینار میں کلیدی خطبہ پڑھتے ہوئے۔ ستیہ پال آنند، شہزاد انجم، تقی عابدی، خالد محمود، وہاب اشرفی وغیرہ بھی ہیں۔ ستمبر 2011، دہلی

لندن یونی ورسٹی میں دیے گئے استقبالیے میں مقامی شعرا کے ساتھ

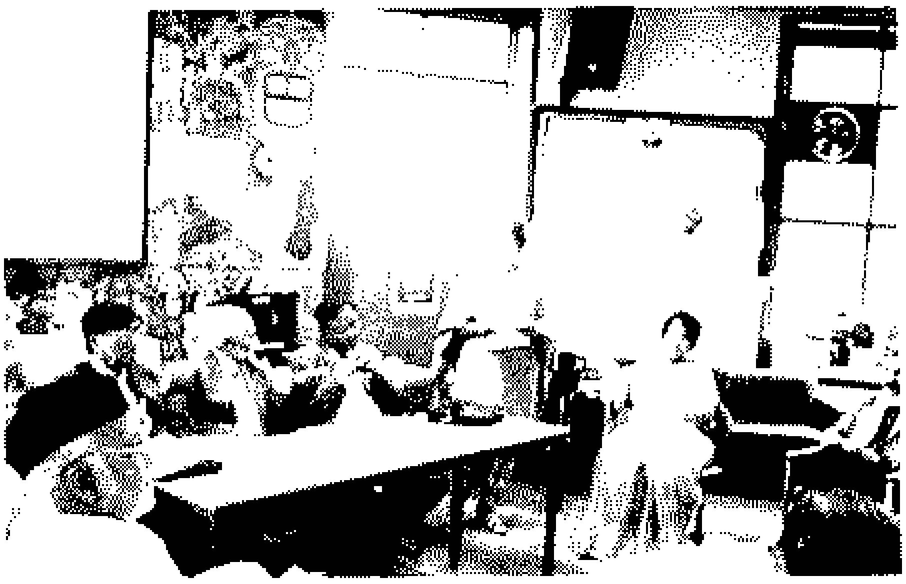

اسی استقبالیے میں محترمہ منزہ شاد کا کلام سنتے ہوئے۔ 2007

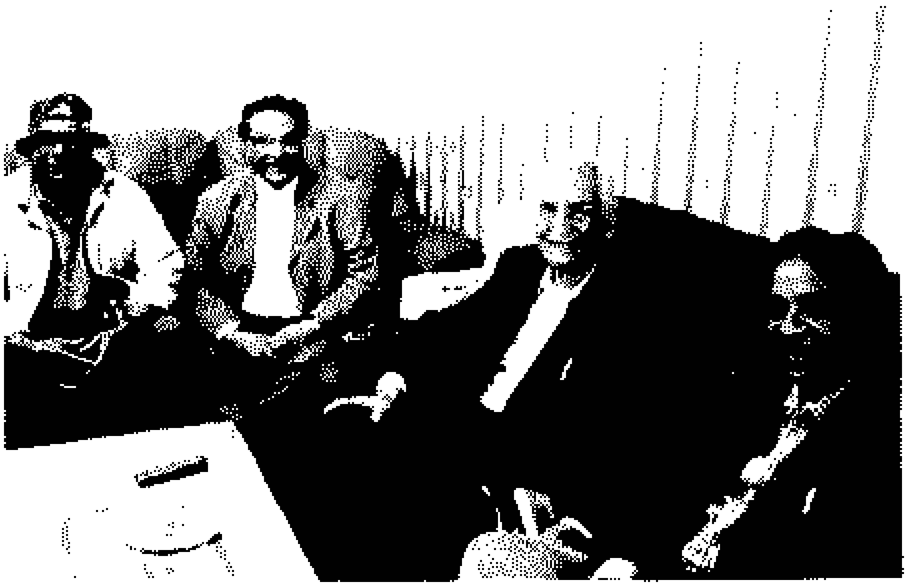

ہونسلو، لندن میں گلشن کھنہ (دائیں سے تیسرے) کی رہائش گاہ پر یاور عباس اور جتیندر بلو (بائیں) کے ساتھ

جتیندر بلو، ساقی فاروقی اور نصرت ظہیر، لندن، 2007

www.taemeernews.com

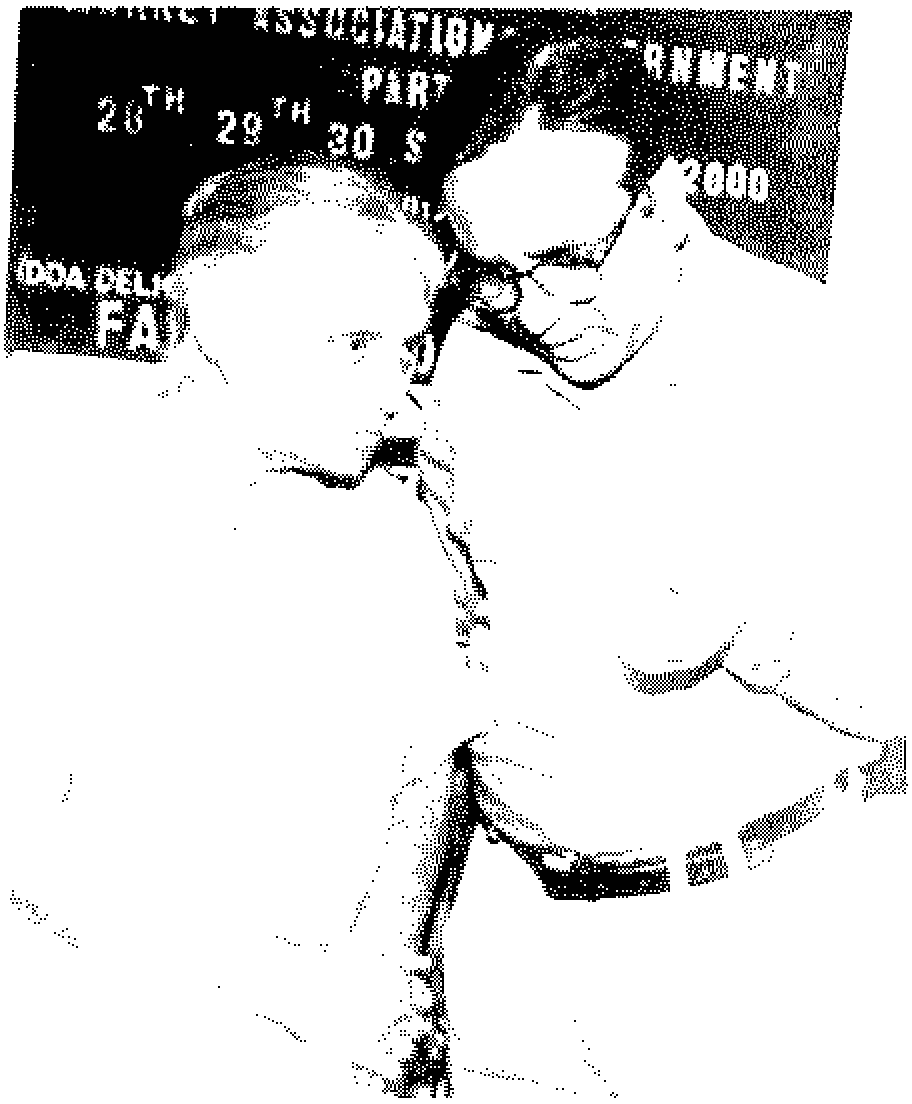

وزیراعلیٰ دہلی شیلا دیکشت سے اہم موضوع پر بات کرتے ہوئے، 2000 دہلی

پروفیسر وسیم بریلوی، عبدالاحد ساز کے ساتھ مکہ سے مدینہ جاتے وقت، کافی خانے میں، 2011

ہوانا، کیوبا میں ارنسٹ ہیمنگوے کے مجسمے کے ساتھ ان کے محبوب بار میں، ازامحتی نوبی 2007

عبدالغفار عزم لندن یونیورسٹی میں دیے گئے استقبالیے سے خطاب کرتے ہوئے

جتیندر بلو، گلشن کھنہ اور سوہن راہی کے ساتھ ایک نیم ادبی محفل میں، 2007 لندن

گلشن کھنہ کے ساتھ ہونسلو کے بازار میں، 2007 لندن

اقوام متحدہ کی عالمی کانفرنس برائے تحفظ نیرنگیٔ ثقافت، ہوانا، کیوبا میں ہندوستانی مصنفین کے وفد کے رکن کی حیثیت سے کے این دارووالا (انگریزی ادیب) اور ممتا ساگر (کنڑ شاعرہ) کے ساتھ اردو کی نمائندگی کرتے ہوئے

www.taemeernews.com

اس شمارے کے قلم کار

پروفیسر محمد حسن

پروفیسر گوپی چند نارنگ

پروفیسر نثار احمد فاروقی

ڈاکٹر قمر رئیس

www.taemeernews.com

پدم شری مجتبیٰ حسین

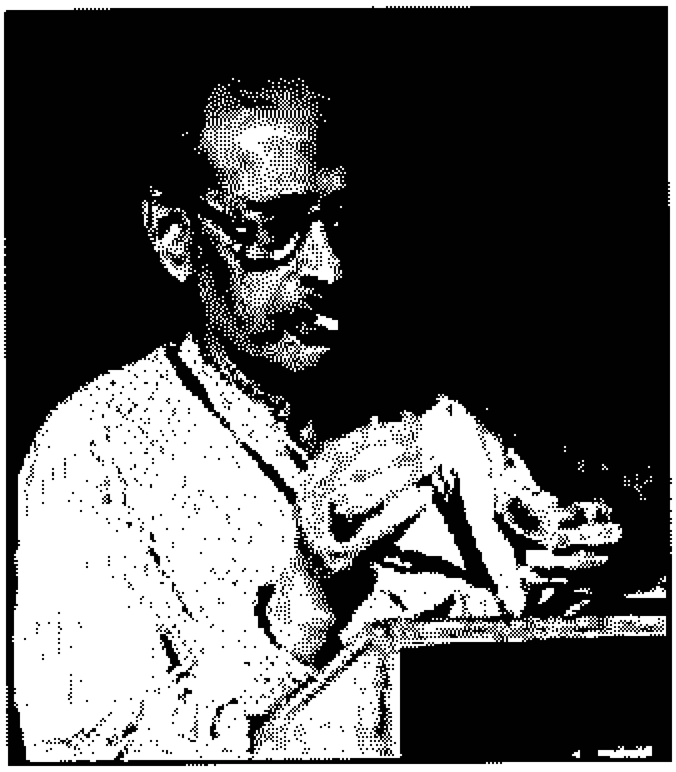

موہن چراغی

اسیم کاویانی

فیاض احمد فیضی

www.taemeernews.com

اسد رضا

حقانی القاسمی

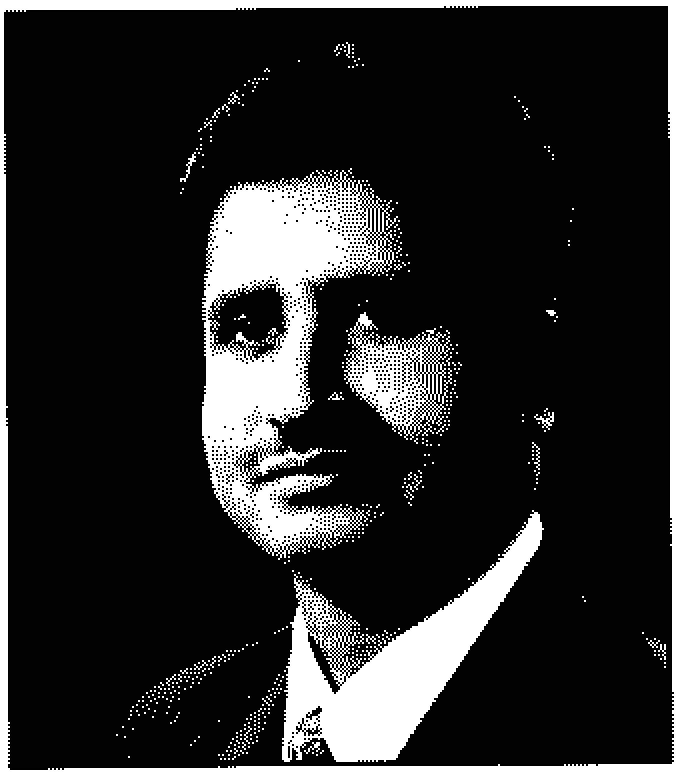

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

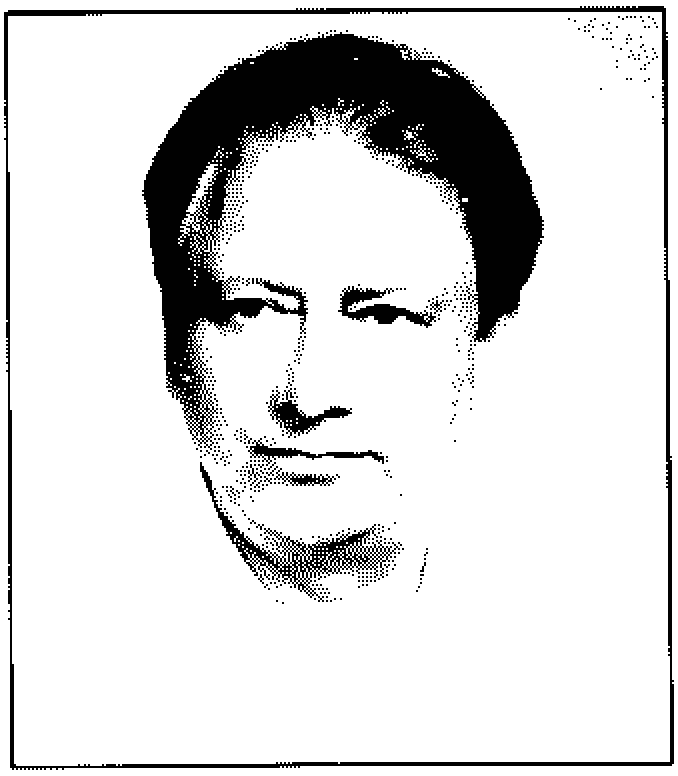

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

www.taemeernews.com

سراج نقوی

پریش ناتھ، عالمی شہرت یافتہ سیاسی کارٹونسٹ

پروفیسر محمد ظفر الدین
مہمان مدیر

www.taemeernews.com

مہمان اداریہ

نصرت ظہیر۔ایک خودساز شخصیت

شگوفہ کا نصرت ظہیر نمبر پیش خدمت ہے۔اس مشہور ومعروف اور تاریخ ساز رسالے کے ایڈیٹر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب نے جب مجھ سے نصرت ظہیر نمبر نکالنے کی بات کی تو میں نے فوری طور پر تائید کردی بلکہ کہا کہ یہ کام تو بہت پہلے بھی کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے جب انہوں نے کہا کہ ''میں اس نمبر کے لیے آپ کو مہمان مدیر بنانا چاہتا ہوں'' تو میں ذرا رک سا گیا۔ایک طرف مصطفیٰ کمال صاحب جو حیدرآباد کے میرے اولین کرم فرماؤں میں شامل ہیں تو دوسری طرف نصرت ظہیر جو قومی آواز کے دور کے میرے رفیق وشفیق ساتھی ہیں۔وہ قومی آواز میں تو میرے بعد آئے تھے لیکن دُنیا میں زیست کرنے اور اخبارات میں کام کرنے کا اُن کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔میں نے صحافت کی ابجد جن لوگوں سے سیکھی ہے اُن میں محفوظ صاحب (دعوت۔خبر ونظر) موہن چراغی اور ظفر زاہدی کے علاوہ نصرت ظہیر صاحب بھی شامل ہیں۔ نہ کہنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔میں ان چند خیالات کے ساتھ فلیش بیک میں جانے ہی والا تھا کہ کمال صاحب نے کہا کہ میں آپ کی ہمہ جہت مصروفیات سے واقف ہوں مگر پھر بھی چاہتا ہوں کہ آپ ہی ادارت کی ذمہ داری سنبھالیں ۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گا اور میرا دفتر بھی پورا تعاون کرے گا۔میری ہمت بندھی اور میں نے حامی بھر لی۔جس کے نتیجے میں یہ شمارہ نصرت ظہیر نمبر کی شکل میں تیار ہوا۔

نصرت ظہیر ایک مقبول عام صحافی اور ادیب ہیں۔دونوں ہی میدانوں میں انہوں نے ایک ساتھ طبع آزمائی کی اور بہت جلد دونوں ہی میدانوں کے شناور بن گئے۔انہوں نے 1981ء کے اوائل میں دہلی کے روزنامہ ملاپ سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور اُسی کے ساتھ ظرافت کے گل کھلانے بھی شروع کر دیے۔انہوں نے اپنی پہلی مزاحیہ تحریر 1981ء ہی میں ماہنامہ یوجنا نئی دہلی کے لیے قلم بند کی۔اس کے بعد بہت تیزی کے ساتھ انہوں نے ذرائع ابلاغ کے تمام شعبوں میں اپنا مقام بنا لیا۔پرنٹ میڈیا کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں بھی اُن کا استقبال کیا گیا اور ان کے صحافتی کام اور ادبی جودت طبع بیک وقت اپنی جلوہ سامانیاں بکھیرتی رہی۔صحافت میں طنز ومزاح کی چاشنی اور طنز ومزاح میں صحافتی موضوعات کو اختیار کرنا اُن کے مزاج کا خاصہ رہا ہے۔یہ معاملہ قدیم روایتوں سے مربوط ہے۔ہم سبھی واقف ہیں کہ اردو صحافت کی قدآور شخصیات عام طور پر طنز ومزاح میں بھی اپنے جوہر دکھاتی رہی ہیں۔ دراصل طنز ومزاح ایک ایسا میدان ہے جہاں صحافی یا عام قلمکار وہ باتیں بھی کہہ جاتا ہے جس کی گنجائش سنجیدہ تحریروں میں نہیں ہوتی ۔ اگر مقصد محض مزاح پیدا کرنا ہو یا اپنی تحریروں کو محض تفریح اور تفنن کا ذریعہ بنانا ہو تب تو کسی بھی موضوع سے کام چلایا جا سکتا ہے۔لیکن اگر اپنی تحریروں کے ذریعے کوئی پیغام دینا ہو اور منظر پس منظر میں اصلاح بھی مقصود ہو تو اُس کے لیے طنز بہترین تحریری رویہ ہے۔مگر ہمارے قلمکاروں نے ایک درمیانی راہ یوں وضع کی ہے کہ تحریر میں مزاح بھی ہو اور وہ طنز کے عناصر سے بھی مملو ہو۔اس طرح کی تحریر تفریح کا سامان بھی مہیا کر دیتی ہے اور اشاروں اشاروں میں تنقیدی و اصلاحی مقاصد بھی پورے ہو جاتے ہیں۔نصرت ظہیر کی بیشتر اچھی تحریریں اسی زمرے میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

نصرت ظہیر جب تک نئی دہلی کے روزناموں ملاپ' تیج اور قومی آواز میں خدمات انجام دیتے رہے اُسی وقت تک وہ گویا سرگرم صحافت سے وابستہ رہے ۔ یہ مدت جنوری 1981ء سے مارچ 2008ء تک یعنی 27 برسوں پر محیط ہے۔ان 27 برسوں کے درمیان گرچہ وہ شاعری' طنز ومزاح اور ترجمے میں اپنے ذوق وشوق اور صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے البتہ قومی آواز چھوڑنے کے بعد پھر انہوں نے سرگرم صحافت کی طرف توجہ نہیں دی جہاں بعض

www.taemeernews.com

ادبی خبروں سے قطع نظر سیاست' قتل و غارت' جرائم و حادثات اور ہنگامی واقعات سے ہر وقت اُلجھنا پڑتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس اثنا میں نصرت ظہیر کی طبیعت عمومی یا سرگرم صحافت سے بتدریج مُڑتی ہوئی ادبی صحافت کی جانب مائل ہو چکی تھی اور گزشتہ پانچ چھ برسوں سے اُنہوں نے خود کو ادب اور ادبی صحافت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اُن کی موجودہ ملازمت (قومی کونسل برائے فروغ انسانی وسائل) اور ذاتی سرگرمی (ادب ساز) دونوں ہی ادبی صحافت سے علاقہ رکھتی ہیں۔

نصرت ظہیر کو شاعری سے بھی خصوصی شغف رہا ہے۔ اُنہوں نے خصوصی شعری محفلوں کے ساتھ ساتھ بڑے مشاعروں میں بھی شرکت کی اور کلام سُنا کر داد و تحسین حاصل کی ہے۔ گزشتہ صدی کے آخری دہے میں اُن کی شاعری شباب پر تھی اور ملک کے موقر جرائد کی زینت بنی رہتی تھی۔ اُن میں اب بھی شاعری کا ذوق باقی ہے مگر جنون اور طمطراق کی جگہ سنجیدگی' استحکام اور ٹھہراؤ نے لے لی ہے۔ اب بس ایک شعری مجموعے کی کسر رہ گئی ہے جو ''دریں اثنا'' کی شکل میں جلد پوری ہونے والی ہے۔

نصرت ظہیر ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے مکمل طور پر خود کو بنایا ہے۔ اُتر پردیش کے مشہور شہر سہارنپور سے اُنہوں نے تیس سال کی عمر میں نقل مکانی کی اور دہلی میں آباد ہو گئے۔ دہلی میں وہ صحافتی اور ادبی سفر کے ساتھ معاشی سفر بھی طے کرتے رہے۔ اُن کی ایسی کوئی تعلیم نہیں تھی جس کی بنیاد پر کوئی اعلیٰ مقام حاصل کر سکتے۔ اُنہیں اپنے خاندانی بزرگوں سے ایسا کوئی سہارا حاصل نہ تھا جو اُنہیں اچانک بلندیوں پر پہنچا دے۔ اُن کی شناسائی کسی ایسی سیاسی شخصیت یا افسر اعلیٰ سے نہ تھی جس کی اُنگلی پکڑ لینے سے زندگی کی سنگلاخ راہوں کا سفر آسان ہو جائے۔ اُنہیں پانی پینے کے لیے خود کنواں کھودنا تھا۔ ایک طرف اُنہیں اپنے اندر کے ادیب و صحافی کو صحیح مقام دلانا تھا تو دوسری طرف دہلی جیسے شہر میں رہ کر معاش کا مسئلہ بھی حل کرنا تھا۔ اُنہوں نے ملاپ اور تیج اخبارات میں ملازمت کی۔ اُردو اخبارات میں عام طور پر اتنی تنخواہیں ہوتی تھیں (آج بھی صورتحال بہت نہیں بدلی ہے) جن سے کوئی صحافی بمشکل نان و نفقہ کی حاجت پوری کر سکتا تھا۔ البتہ اُس زمانے میں ہندوستان بھر میں قومی آواز واحد اخبار تھا جو اپنے ملازمین کو ویج بورڈ کی سفارشات کے مطابق تنخواہیں اور دیگر مراعات دیا کرتا تھا۔ سیاسی اور ایڈمنسٹریٹو حلقوں میں بھی اخبار کے طوطی بولتے تھے۔ 1987ء میں نصرت ظہیر جب قومی آواز سے وابستہ ہوئے تو اُن کی ذاتی زندگی میں بھی استحکام آیا۔ اس دوران مزاح نگار اور کالم نگار کی حیثیت سے بھی اُن کی شناخت قائم ہو چکی تھی اور اُن کا نام ''پیاز کے چھلکے'' والے فکر تونسوی کے ساتھ لیا جانے لگا تھا۔ قومی آواز میں آنے کے بعد پھر اُنہوں نے کبھی مڑ کر نہیں دیکھا اور صحافتی و ادبی حلقوں میں اُنہیں وقار حاصل ہوتا چلا گیا۔ کئی کتابوں کی اشاعت' کئی ایوارڈس کا حصول' اخبارات کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں پروگراموں کا لامتناہی سلسلہ' ٹی وی سیریلس کے لیے اسکرپٹ لکھنا، ترجمے' بیرونی اسفار اور نجانے کیا کیا کچھ۔ ان خدمات کا ہر سطح پر اعتراف بھی کیا گیا۔ اُنہیں ''تہاڑ جیل میں میرے شب و روز'' کے ترجمے پر 2008ء میں ترجمے کا ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا اُس کے بعد یہاں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے شعبہ ترجمہ میں بھی مدعو کیا گیا۔ 30 مارچ 2009ء کو اُنہوں نے ''ترجمے کے عصری منظرنامہ اور صحافتی تراجم'' کے موضوع پر لکچر دیا جسے طلبہ و اساتذہ نے کافی پسند کیا۔ گرچہ نصرت ظہیر تقریر یا لکچر سے زیادہ لکھنے اور لکھے ہوئے کو پڑھنے میں سہولت محسوس کرتے ہیں لیکن جہاں کہیں ضرورت ہوتی ہے' کام چلا ہی لیتے ہیں۔ پھر بھی' وہ اسٹیج کے غازی نہیں بلکہ قلم کے سپاہی ہیں۔

سہارنپور کے نوجوان نصرت ظہیر کو موجودہ نصرت ظہیر تک پہنچانے میں جس امر نے کلیدی کردار کیا ہے وہ اُن کی محنت' لگن' جستجو اور وقت پر کام کی تکمیل کا جذبہ ہے۔ اُنہوں نے اپنی محنت کو کبھی بریک نہیں دیا۔ ہر کام کو ایک مشن کی طرح مکمل کیا۔ جس کام کی ذمہ داری لے لی یا جو کام کرنے کی ٹھان لی' اُسے مکمل کر کے ہی دم لیا۔ اُن کا سب سے مشہور کالم تحت اللفظ ہے جو قومی آواز میں روزانہ شائع ہوتا تھا۔ وہ ہر روز پابندی سے' خواہ وہ مصروف ہوں' سفر میں ہوں' چھٹی پر ہوں' حتیٰ کہ بیمار ہوں مگر روزانہ کسی نہ

www.taemeernews.com

کسی طرح اپنا کالم دفتر قومی آواز پہنچا دیا کرتے تھے۔ اُس میں بھی ناغہ نہیں ہوا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم لوگ رات کے دس گیارہ بجے تک کسی محفل میں شریک رہے اور پھر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے' مگر دوسرے دن جب وہ دفتر آتے تو تحت اللفظ کا مسودہ اُن کے ساتھ ہوتا۔ کبھی آخری پیراگراف یا سرخی راستے میں سوچتے ہوئے آتے اور دفتر پہنچ کر اُسے مکمل کر کے ایڈیٹر کے حوالے کرتے۔ اس کالم کے ساتھ معمول کی دفتری ڈیوٹی اور اگر باہر کا کوئی کام ہے (ریڈیو' ٹی وی' ترجمہ وغیرہ) تو وہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہتا۔ غرضیکہ مشق سخن بھی جاری تھی اور چکی کی مشقت بھی ۔۔۔ یہ وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے اُنہیں عام طور پر لوگ ''سیلف میڈ'' یا خود ساز شخصیت تسلیم کرتے ہیں۔

نصرت ظہیر اُصولوں کے انسان ہیں۔ اُن کے اندر ایک انسان دوست شخص بیٹھا ہوا ہے۔ جو ہمہ وقت ظاہر نہیں ہوتا مگر اکثر مناسب وقت پر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ہر بات کے لیے اپنی ایک رائے رکھتے ہیں۔ کسی بھی معاملے پر اُن کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ اور وہ اُس نقطۂ نظر پر قائم رہتے ہیں۔ نصرت ظہیر کی شخصیت میں ایک اضطراب کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اُن کے اندر موجیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ اُن کے یہاں تالاب کا ٹھہراؤ نہیں بلکہ ندی کی روانی ہے۔ وہ ہر دم تلاش و جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ ذکر بھی مناسب ہے کہ اُنہیں مشینوں سے غیر معمولی لگاؤ ہے۔ جیسے بعض بچے کھلونوں کو اندر دیکھے بغیر چین نہیں لیتے ویسے ہی نصرت ظہیر ہر مشینری کو اندر سے دیکھنے اور جاننے کی تمنا رکھتے ہیں۔ ریڈیو' ٹی وی' موبائیل' کمپیوٹر اور دیگر کئی اشیاء نے اُن سے آپریشن کا شرف حاصل کیا ہے۔ نصرت ظہیر کے مزاج کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کبھی کبھی کسی بات پر فوری ردعمل دیتے ہوئے اپنے سامنے والے کو ناراض کر بیٹھتے ہیں۔ مگر وہ ناراض کو منانے اور دوست بنانے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔ فوری دوستی و استواری بھی اُن کے مزاج کا حصہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اچھی مثال معروف شاعر اور قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے سابق وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال کی ہے۔ دراصل نویں دہائی میں قومی آواز کے ایک کمرے میں چار افراد بیٹھتے تھے۔ ڈاکٹر شاہد پرویز' جناب نصرت ظہیر' جناب چندر بھان خیال اور راقم الحروف۔ واقف کار اُس کمرے کو بڑا بابرکت مانتے ہیں کہ اُس کمرے کے چاروں مکینوں کو اللہ نے عزت عطا کی۔ بہر حال ذکر نصرت ظہیر اور چندر بھان کے تعلقات کا تھا۔ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ آج اُن دونوں کی دوستی ہے یا گئی۔ ہمیں پتہ تب چلتا تھا جب نصرت صاحب کوئی پریس ریلیز مجھے دیتے ہوئے کہتے کہ ''یہ اُنہیں دے دیجئے''۔ اس انداز اور جملے سے میرا ماتھا ٹھنکتا تھا اور تصدیق تب ہو جاتی جب خیال صاحب ایک جھٹکے سے مجھے کہتے ''کہہ دیجئے بہت کام ہے' خود کر لیں۔'' یہ ناراضگی عموماً دو ایک دن سے زیادہ نہیں چلتی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ چندر بھان خیال بھی بڑے سادہ لوح' معصوم اور پیارے انسان ہیں۔ اُن دنوں وہ کئی بار چھوٹی چھوٹی بات پر بگڑ جاتے بلکہ روٹھ جاتے اور اُتنی ہی آسانی سے من جاتے تھے۔

نصرت ظہیر محبتوں کے انسان ہیں۔ اُن کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل ہے جس میں اپنائیت اور لگاؤ ہے۔ اُنہیں اپنے سکندرآباد اور سہارنپور سے بے پناہ محبت ہے۔ اُنہوں نے جن لوگوں کے ساتھ کام کیا اُن کے لیے ہمیشہ نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اپنے اردگرد کے بظاہر معمولی نظر آنے والے کرداروں کو بھی یاد کرتے ہیں۔ بزرگوں اور احباب کے ذکر میں اکثر جذباتی ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت نصرت ظہیر کے مضامین میں بھی جا بجا ملتی ہے۔ اُن کے کئی مضامین طنز و مزاح کے پیرائے میں شروع ہوتے ہیں' بتدریج آگے بڑھتے ہیں لیکن کلائمکس تک پہنچتے پہنچتے سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے قاری کو حیران اور کبھی دم بخود کر دیتے ہیں۔ قاری اُن کی تحریروں اور اُن کی فکر میں شامل ہو جاتا ہے' ڈوب جاتا ہے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دہلی مہاجروں کا شہر ہے۔ اُس شہر نے لاتعداد لوگوں کو پناہ دی ہے۔ روزگار کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ لیکن وہاں کی چمک دمک میں مقیم افراد بھی خوابوں میں اپنے گاؤں محلوں' چوپالوں اور چوباروں کو سجائے رہتے ہیں۔ اُنہیں اپنے وطن عزیز (محدود معنوں میں) ہی کا ہر ذرہ دیوتا معلوم ہوتا ہے۔ نصرت ظہیر نے تاریخی شہر ''امروہہ'' کے حوالے سے ''بقراطی'' کا کردار تراشا ہے۔ یہ ایک ایسا

www.taemeernews.com

کردار ہے جو گرچہ ہجرت کر گیا ہے لیکن اُس کے حواس پر امروہہ طاری ہے۔ مضمون 'امروہے کا جو ذکر کیا' اس طرح ختم ہوتا ہے:

"ایک دن میں، پتہ نہیں کس ذہنی کیفیت میں تھا کہ ان کے امروہے پن پر خفہ آ گیا۔" یار بقراطی صاحب، مجھے لگتا ہے آپ کو امروہہ کی بیماری ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے آپ جلدی سے کسی ماہر نفسیات سے رجوع کیجئے۔ ایک ہی زندگی میں اتنا سارا امروہہ ٹھیک نہیں ہے۔"

میری بات اور لہجے کا ایسا اثر ہوا کہ چائے کا برتن اٹھاتا ہوا ان کا ہاتھ رک گیا اور عجیب سی خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر دھیمی آواز میں بولے: "میاں آپ امروہے کے نہیں ہیں اس لئے کہہ رہے ہیں۔ ذرا اندر تک جھانک کر دیکھئے۔ ایک امروہہ ہر دل میں جا کر بتا پائیں گے۔ کہیں اس کا نام لکھنؤ ہوگا، کہیں بجنور، کہیں سہارنپور تو کہیں سکندرآباد۔ کوئی اسے لاہور کہتا ہے کوئی کلکتہ۔ یہ سب امروہے ہماری ہجرتوں نے آباد کئے ہیں۔ ان میں ہمارے ماں باپ بھی رہتے ہیں بھائی بہن بھی۔ ہمارا بچپن بھی ہمارا لڑکپن بھی۔ غور سے دیکھئے یہ امروہہ آپ کے اندر بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ وہ گانا یاد ہے مناؔ دے کا؟

ماں کا دل بن کر کبھی سینے سے لگ جاتا ہے تو
اور کبھی ننھی سی بیٹی بن کے یاد آتا ہے تو
جتنا یاد آتا ہے مجھ کو اتنا تڑپاتا ہے تو
تجھ پہ دل قرباں...

یہ رومال لے لیجئے۔ شاید آنکھ میں کچھ گر گیا ہے۔"

میں نے ان کے ہاتھ سے رومال لے لیا۔ مجھے واقعی اس کی ضرورت تھی۔۔"

ایسا ہی ایک مضمون "الوداع اے ماہ رمضاں" ہے جو ظاہری طور پر قدیم اور چھوٹے علاقوں میں رمضان کے الوداعیہ مناظر اور ایک بچے کے پہلے روزے کی کہانی بیان کرتا ہے لیکن رمضان سے مخاطب ہو کر لکھا گیا یہ مضمون صحیح معنوں چھوٹے اور بڑے شہروں کی تہذیبی و معاشرتی تفریق پر روشنی ڈالتا ہے۔ مضمون کے 85-80 فیصد حصے میں ماہ رمضان کے مختلف مناظر دکھانے کے بعد قلمکار آخری حصے میں تہذیبی بُعد کی طرف لے جاتا ہے۔ چھوٹے شہر میں کوئی پہلا روزہ رکھ لے تو گلی محلے کے لوگ اُس میں پوری طرح شریک ہو جاتے ہیں۔ مگر بڑے شہروں میں معاملہ اس سے برعکس ہے۔ مضمون کا آخری حصہ ملاحظہ کیجیے:

" روزہ دار بچہ آج دہلی شہر کے ایک عالیشان علاقے میں دوسری منزل کے فلیٹ نمبر 37 میں رہتا ہے جہاں اسے یہ نہیں معلوم کہ 36 نمبر میں کون مقیم ہے اور 38 نمبر میں کس کی رہائش ہے؟ ہر دروازے سے روزانہ کچھ چہرے باہر نکلتے ہیں، پھر پتہ نہیں کب ان ہی دروازوں کے پیچھے جاکر گم ہو جاتے ہیں۔ خیر...... زندگی رہی تو اگلے سال پھر ملاقات ہوگی۔ بس اتنی سی گزارش ہے کہ اس بار تشریف لائیں تو اللہ میاں سے کسی ایسی منزل یا فلیٹ کا پتہ ضرور لیتے آئیں جہاں چہرے اجنبی، دروازے ناآشنا اور کھڑکیاں گونگی بہری نہ ہوں..."

نصرت ظہیر کے مضامین میں لفظیات کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ یہ اور بھی اُن کے عمیق مشاہدے اور اپنے گرد و نواح سے غیر معمولی جذباتی لگاؤ کا غماز کرتا ہے۔ اُن کے مضامین میں مغربی اتر پردیش کی لفظیات' محاورے' بول چال کے الفاظ' مختلف پیشوں سے جڑی ہوئی اصطلاحات' رسوم و رواج' کھانے پینے کی اشیا' برتنوں کے نام' مختلف مواقع پر استعمال ہونے والی اشیا و ساز و سامان کے نام بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ عام قاری کے لیے معلومات میں اضافے کا سبب ہیں تو اُس علاقے سے تعلق رکھنے والوں کو یادِ ماضی سمیٹنے اور سنوارنے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ یہ اور ایسی بے شمار خوبیاں ہیں جو نصرت ظہیر کی تحریروں کا وصف ہیں۔ ان خوبیوں کا ارتقائی سفر جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ "شگوفہ" نصرت ظہیر نمبر شائع کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔

میں اُن تمام لوگوں کا شکر گزار ہوں جن کے مضامین و مقالے اس شمارے میں شامل ہیں اور جن کی بدولت اس نمبر کے ایک یادگار نمبر بن جانے کی قوی اُمید ہے۔☆

پروفیسر محمد ظفر الدین
صدر شعبہ ترجمہ۔ ڈین اسکول برائے السنہ'
لسانیات و ہندوستانیات۔ پراکٹر
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد

www.taemeernews.com

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Maulana Azad National Urdu University
(A Central University Established by an Act of the Parliament in 1998)
Gachibowli, Hyderabad 500 032.

نیشنل اسسمنٹ اینڈ ایکریڈیشن کونسل سے بحیثیت 'اے' گریڈ تصدیق شدہ

اعلان برائے داخلہ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے تعلیمی سال 14-2013 کیلئے درج ذیل اُردو میڈیم کورس (روایتی طرز تعلیم) میں داخلوں کیلئے اہل اور نتائج کے منتظر طلبہ سے درخواستیں مطلوب ہیں۔

کورسس	
ایم اے: i. اردو# ii. فارسی# iii. عربی# iv. ہندی' v. انگریزی#' vi. ٹرانسلیشن اسٹڈیز☆ vii. پبلک ایڈمنسٹریشن' viii. ویمن اسٹڈیز' ix. ماس کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم☆ x. پولیٹیکل سائنس، xi. اسلامک اسٹڈیز☆' ماسٹر آف سوشیل ورک☆☆' ماسٹر آف بزنس اڈمنسٹریشن☆' ماسٹر آف ایجوکیشن☆' ماسٹر آف کمپیوٹر اپلیکیشن☆' ماسٹر آف کامرس' ماسٹر آف سائنس (ریاضی)'	سرٹیفکیٹ پروگرامس: i. خوش خطی ii. آموزش اردو iii. تحسین غزل' iv. عربی v. فارسی
بیچلر آف ٹیکنالوجی (کمپیوٹر سائنس)☆ بیچلر آف ایجوکیشن☆ ڈپلوما ان ایجوکیشن☆ ڈپلوما ان یونانی فارمیسی	ڈپلومہ پروگرامس: i. عربک ii. عربک ٹرانسلیشن iii. تحسین غزل' iv. فارسی
ایم فل☆: i. اُردو' ii. فارسی' iii. عربی' iv. انگریزی v. ہندی vi. پبلک ایڈمنسٹریشن' vii. ویمن اسٹڈیز viii. سوشیل ایکسکلوژن اینڈ انکلوزیو پالیسی ix. مینجمنٹ x. ٹرانسلیشن اسٹڈیز	پی۔جی ڈپلوما پروگرامس: i. فنکشنل اردو ii. فنکشنل ہندی اور ٹرانسلیشن
پی ایچ ڈی☆ (فل ٹائم اور پارٹ ٹائم): i. اردو' ii. فارسی' iii. عربی iv. ہندی' v. انگریزی vi. ویمن اسٹڈیز vii. پبلک ایڈمنسٹریشن' viii. ایجوکیشن' ix. سوشیل ایکسکلوژن اینڈ انکلوزیو پالیسی' x. مینجمنٹ' xi. ٹرانسلیشن' xii. کمپیوٹر سائنس	ڈپلوما پروگرامس برائے پالی ٹکنیک☆ حیدرآباد: i. سیول انجینئرنگ' ii. کمپیوٹر سائنس انجینئرنگ' iii. الکٹرانک اینڈ کمیونیکیشن انجینئرنگ اور iv. انفارمیشن ٹیکنالوجی
	آئی ٹی آئی حیدرآباد: i. ڈرافٹسمین سیول' ii. الکٹرانک میکانک' iii. الکٹریشین' iv. ریفریجریشن اینڈ ایئر کنڈیشننگ اور v. پلمبنگ۔ آئی ٹی آئی بنگلور: i. الکٹرانک میکانک ii. ریفریجریشن اینڈ ایئر کنڈیشننگ۔ آئی ٹی آئی دربھنگہ: i. الکٹریشین' ii. پلمبنگ
# سٹیلائٹ کیمپس لکھنؤ میں دستیاب کورسز۔ ☆ داخلہ بذریعہ انٹرنس ٹسٹ ۔ ☆☆ داخلہ بذریعہ انٹرویو	

پراسپکٹس اور درخواست فارم 5/اپریل 2013ء سے یونیورسٹی کیمپس' گچی باولی' حیدرآباد یا سٹی سنٹر نج باغ' حیدرآباد یونیورسٹی کے ریجنل و سب ریجنل سنٹرس' کالجس آف ٹیچر ایجوکیشن اور سٹیلائٹ کیمپس لکھنؤ سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر بعوض -/100 روپے ڈیمانڈ ڈرافٹ یا بذریعہ ڈاک 150 روپے کے ڈیمانڈ ڈرافٹ کی ادائیگی پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ڈیمانڈ ڈرافٹ کسی قومیائے ہوئے بینک سے ''مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی'' کے حق میں حاصل کردہ ہو اور حیدرآباد میں ادا شدنی ہو۔ ایس سی/ایس ٹی اور دیگر پسماندہ طبقات کیلئے تحفظات حکومت ہند کے اُصول وضوابط کے مطابق ہوں گے۔ پراسپکٹس اور درخواست فارم یونیورسٹی کی ویب سائٹ www.manuu.ac.in سے ڈاؤن لوڈ کیے جاسکتے ہیں اور تفصیلی جانکاری بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ متعلقہ شعبوں اور سٹیلائٹ کیمپس لکھنؤ پر درخواست فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ درج ذیل ہے:

-تمام پی جی/ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرامس مانو کیمپس' حیدرآباد کیلئے 6/مئی 2013' -سٹیلائٹ کیمپس لکھنؤ کے تمام پی جی پروگرامس کیلئے 19/جولائی 2013ء -ڈی ایڈ/بی ایڈ/ایم ایڈ/پی ایچ ڈی (ایجوکیشن) کیلئے 25/اپریل 2013' -ڈپلوما/پی جی ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ پروگرامس کیلئے 5/اگست 2013' -پالی ٹکنیک حیدرآباد کیلئے 2/مئی 2013' - آئی ٹی آئی حیدرآباد' بنگلور اور دربھنگہ کیلئے متعلقہ ریاستی حکومت یا این سی وی ٹی نوٹیفکیشن کے مطابق۔

کورسز کی تفصیلات پراسپکٹس میں دی گئی ہیں۔ حسب گنجائش کی صورت میں ہاسٹل کی سہولت مہیا کی جاسکتی ہے۔ پوسٹ گریجویٹ طلبہ کو فنڈس کی دستیابی کی صورت میں ماہانہ 1000 روپے کی اسکالرشپ دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ایم فل و پی ایچ ڈی اسکالرس کو بالترتیب 5000 اور 8000 روپئے یو جی سی فیلوشپ بھی دی جائے گی۔

مورخہ: 26/مارچ 2013ء

رجسٹرار

www.taemeernews.com

تاریخ ساز دہلی کے تہذیب وتمدن اور روایات واقدار سے متعلق

اُردو اکادمی، دہلی کی چند اہم مطبوعات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف/مرتب	صفحات	قیمت
1	دہلی کی آخری شمع	مرزا فرحت اللہ بیگ/ڈاکٹر صلاح الدین	147	45/-
2	دلّی والے (جلد اوّل)	ڈاکٹر صلاح الدین	357	120/-
3	دلّی والے (جلد دوم)	ڈاکٹر صلاح الدین	506	130/
4	دلّی والے (جلد سوم)	ڈاکٹر صلاح الدین	272	75/-
5	دلّی والے (جلد چہارم)	اظہار عثمانی	340	120/-
6	دلّی کا آخری دیدار	سید وزیر حسن دہلوی/سید ضمیر حسن دہلوی	74	30/-
7	قلعہ معلی کی جھلکیاں	عرش تیموری/ڈاکٹر اسلم پرویز	72	25/-
8	رسوم دہلی	سید احمد دہلوی/ڈاکٹر خلیق انجم	208	40/-
9	بزم آخر	منشی فیض الدین/ڈاکٹر کامل قریشی	124	50/-
10	سوانح دہلی	شہزادہ مرزا احمد اختر گورگانی/مرغوب حیدر عابدی	64	25/-
11	عالم میں انتخاب دلّی	مہیشور دیال	531	150/-
12	دلّی کی تہذیب	ڈاکٹر انتظار مرزا	84	35/-
13	چراغ دہلی	میرزا حیرت دہلوی	536	150/-
14	دلّی کی آخری بہار	علامہ راشد الخیری/سید ضمیر حسن دہلوی	127	40/-
15	لال قلعہ کی ایک جھلک	حکیم خواجہ سید ناصر نذیر الدین فراق دہلوی/ڈاکٹر انتظار مرزا	109	40/-
16	دہلی اور اس کے اطراف	مولانا حکیم سید عبدالحی/ڈاکٹر صادقہ ذکی	134	45/-
17	دلّی کے آثار قدیمہ	ڈاکٹر خلیق انجم	296	100/-
18	واقعات دارالحکومت دہلی (تین جلدوں میں)	مولوی بشیر الدین احمد، مقدمہ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی	1760	1500/-
19	آثار الصنادید	سر سید احمد خاں، مقدمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی	728	240/-
20	دہلوی اُردو	سید ضمیر حسن دہلوی	272	90/-
21	دہلی اور آزادی	ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ	304	225/-

رابطہ: سی۔پی۔او۔بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی Ph : 23863858, Fax : 23863773

www.taemeernews.com

پروفیسر محمد حسن

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا...

یہ چند سطریں لکھنے بیٹھا ہوں اور جاگتی جگمگاتی روشنیوں کا جلوس نظروں کے سامنے گزرنے لگا ہے۔ اس میں سروینٹس اور سوفٹس ہیں، مونتان اور ری بیلے ہیں۔ کہیں وڈہاؤس اور جمیس تھربر ہیں۔ اپنے اردگرد کے حلقے میں جعفرزٹلی سے لے کر مشتاق یوسفی تک یہ کارواں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کہیں فرحت اللہ بیگ تو کہیں عظیم بیگ چغتائی اور پطرس بخاری کہیں حاجی لق لق اور سند باد جہازی تو کہیں رشید احمد صدیقی اور شفیق الرحمٰن۔ کہ ہنساتے ہیں اور ہنسی ہنسی میں غور وفکر کے وہ وہ رمز سمجھاتے ہیں کہ بقول شاعر "برسوں پڑھو تو یاد نہ ہووے سبق مرا"۔

ہنسی ہنسی میں بات کہہ جانا جتنا مشکل فن ہے اس فن کا مذاق اڑانا اتنا مشکل نہیں۔ اسی لئے طنز ومزاح کو انعام و اکرام سے تعبیر کیا گیا ہے جو قوموں کو بڑی محنت اور ریاضت سے ملتا ہے۔ اپنے اردگرد آپ لوگوں کو معمولی سے معمولی بات پر قہقہہ لگاتے دیکھیں گے اور اسی سے ان کے ظرف اور مزاج کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ کوئی کس بات پر ہنستا ہے اور کیسے ہنستا ہے۔ یہی ان کی تہذیبی سطح کو متعین کرنے کے لئے کافی ہے۔

اخبار کے مزاحیہ کالم کے لئے طنز ومزاح لکھنا اور بھی دشوار ہے۔ روز روز کی ملاقات سے یونہی تازگی جاتی رہتی ہے اور پڑھنے والا پہلے ہی سے کچھ چوکنا کچھ متوحش ہونے لگتا ہے۔ اس میں قدرے کمی کرسکتا ہے تو اخبار کے دوسرے مندرجات کا بھاری پن کہ پڑھنے والا اس کی ضرب شدید سے گھبرا کر عارضی ہی سہی ابر مزاح کے سائے میں کھسک آتا ہے۔

نصرت ظہیر نے جب لکھنا شروع کیا یا یوں کہئے کہ جب میں نے انہیں پڑھنا شروع کیا وہ میرے لئے بڑی مایوسی اور دل گرفتگی کا دور تھا۔ اخبارات ناخوشگوار بلکہ دلخراش خبریں اگل رہے تھے۔ اداریئے اداس تھے اور الفاظ سیاہ ماتمی پیکر اوڑھے ہر روز ملنے آتے تھے اور پھر اردو کے اخبار کہ ان میں نہ نامہ نگاری شخصیت کا وفور تھا نہ اسلوب کا خروش۔ مدتوں سے جو اخبار پڑھتا آیا تھا اس میں رفتہ رفتہ نصرت ظہیر کے انداز گفتگو نے متوجہ کیا کہ اس کبھی نہ ختم ہونے والے ریگستان میں نخلستان کا قرینہ بھی کہیں نہ کہیں نظر آنے لگا تھا۔

جو بات مجھے اچھی لگی وہ یہ تھی کہ ان تحریروں میں کوئی شور، شرابا، کوئی دعویٰ، کوئی بڑبولا پن نہیں تھا، یہ تو تازہ ہوا کے ایک ہلکے جھونکے کی طرح تھے۔ نہ کوئی طمطراق، نہ کوئی طوفانی پیچ و تاب۔ یہ ادا اس وقت مجھے اور بھی اچھی لگی جب دل کئی پہلو سے دکھا ہوا تھا۔ ایک ملک کے سیاسی رخ سے کہ جس ظلمت پسندی کے خلاف صف آرائی میں زندگی گزاری تھی وہی اب بقول شاعر سب کی زباں ٹھہری تھی۔ دوسرے پاکستان میں طنز ومزاح کے جاگتے جگمگاتے نصف النہاری سورج ایک ایک کر کے گہنا گئے تھے۔ شفیق الرحمٰن، ابن انشاء، کرنل محمد خاں، مشتاق یوسفی۔ ہاں لکھ رہے تھے تو مشفق خواجہ "خامہ بگوش" کے نام سے لکھ رہے تھے۔ مگر اس میں مزاح کم اور چبھن زیادہ تھی۔ اپنے ملک میں مجتبیٰ حسین نے تقریباً بساط تہہ کردی تھی۔ یوسف ناظم اور کبھی کبھار دلیپ سنگھ کے سہارے کام چل جاتا تھا۔ گویا چراغ گل، پگڑی غائب کا مضمون تھا۔ یہ اس کارواں کا پایان سفر تھا جو جعفرزٹلی سے لے کر رتن ناتھ سرشار تک اور وہاں سے کنہیا لعل کپور تک

www.taemeernews.com

پہنچا تھا۔ یہ نصرت ظہیر کہاں سے نکل آئے؟ مجھے ان کے بارے میں قطعی علم نہ تھا اور اب بھی بہت ناقص سی معلومات فراہم ہوئی ہیں جو انہوں نے اس مجموعے میں دیباچے کے طور پر ارزانی کی ہیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ کم سے کم میرے لئے نصرت ظہیر کے مضامین قومی آواز کے جہازی صفحوں میں ڈوبتے کو تنکے کا بہانہ تھے کہ میں انہیں کے ذریعے چبھتی ہوئی معاندانہ خبروں کے اس بحرِ اوقیانوس کو پار کرلیتا تھا اور یہی طنز و مزاح دونوں کی میرے نزدیک سب سے کھری پہچان ہے کہ کچھ دیر کے لئے آپ کو زیادہ گہرائی اور گیرائی سے حقیقتوں کا ادراک کرانے کے لئے وہ حقیقت کی تلخ موجودگی کو گوارا بنادے۔

چنانچہ نصرت ظہیر طلوع ہوئے۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس پر ہوئی کہ بغیر کسی پوز، یا بناوٹ کے طلوع ہوئے۔ نہ تو انہوں نے رسمی اور روایتی لطیفوں کا سہارا لیا نہ ادبیت کا۔ بڑی ہی واقعاتی یا نیم واقعاتی نیم تاثراتی قسم کے نثر کے میدان میں قدم رکھا اور پھر بھی دلچسپی اور دل بستگی قائم کی اور آنسوؤں کو قہقہوں میں نہ سہی کم سے کم مسکراہٹوں میں سموتے چلے گئے (یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے لئے بڑا دل گردہ چاہئے) اور اس بے تکلفی کے ساتھ کہ پڑھنے والے یہ طے نہ کرپائیں کہ کہاں نثر ختم ہوتی ہے اور کہاں مسکراہٹ شروع ہوتی ہے۔

یہ لطیف تاثر کبھی کبھی جی کو چھو لیتے ہیں کہ ان میں اپنائیت کی بوباس ہے اور ہمارے اپنے روز و شب یہاں بھید بدل کر ہم سے ملنے کو آجاتے ہیں اور اس انداز سے کہ ان کی تلخی اور تندی کے ڈنک جھڑ چکے ہوتے ہیں اور صرف ان کی چھیڑ چھاڑ کی لذتیں باقی رہتی ہیں۔ البتہ مجھے نصرت ظہیر سے ایک شکایت ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے روایاتی بیساکھیاں کیوں چن لیں۔ نہ مرزا ان کے نہ عبدالقدوس بیگ ان کے، یہ دونوں کردار تو ان سے پہلے پطرس بخاری اور مشتاق حسین یوسفی (علی الترتیب) برت چکے ہیں۔ ان سے تو ان کی انفرادیت پر حرف آتا ہے۔ یہ نہ ہوتے تو اچھا ہوتا۔ مگر اس کے باوجود لفظوں کے پیچ و خم، مکالموں کی جوکھیڑ پچھاڑ اور جملوں کی جو دھر پکڑ ان کے مضامین میں لطف اور کبھی کبھی حوصلہ دیتی ہے، وہ ان کی اپنی اپج ہے، جس کو کوئی مرزا کوئی عبدالقدوس ماند نہیں کرسکتا۔

نصرت ظہیر کا مزاج زود ہضم قسم کا مزاح ہے مگر اس کے لئے جس زود حسی اور تازگی احساس کی ضرورت ہے اس کی فراہمی بہت دشوار ہے۔ یعنی پڑھیں تو ایسا لگے کہ ہم خود بھی ایسا بلکہ اس سے بہتر لکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب قلم لے کر بیٹھیں تو اپنے کو عاجز اور بے بس پائیں، قلم ایک جنبش آگے نہ بڑھے اور دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو جائے اور اس پر بھی اصرار کرکے دو چار جملے لکھیں تو وہ مضحکہ خیز حد تک اپنی ناکامی اور نامرادی کا اعلان کرنے لگیں۔

نصرت ظہیر کی شادابی فکر اس اعتبار سے قابلِ رشک ہے کہ وہ ہماری آپ کی زندگی کے اردگرد سے موضوعات اٹھاتے ہیں اور پھر انہیں تجربات اور مشاہدات کی چمکتی دھوپ میں لاکر رکھ دیتے ہیں اور خود کو کم و بیش "معمول" کی سطح پر لے آتے ہیں۔ گویا بولنے والے یہ خود ہیں مگر بلوانے والا کوئی اور ہے اور اس تکنیک سے گویا آورد کی مدد سے آمد پیدا کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر مضامین میں ایک وارفتہ قسم کی بے تکلفی چھائی ہوئی ہے جو اردو طنز و مزاح میں بھی ایسی اور اتنی ارزاں نہیں ہے جتنی عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔

نصرت ظہیر کے انشائیے ہمارے منقسم اور متصادم معاشرے میں معقولیت کا حرف احتجاج ہیں۔ جب معاشرہ بہت الجھ جاتا ہے اور فرد کی جائز خواہشات اور ارمانوں سے تقریباً متصادم سا ہونے لگتا ہے تو افراد کا اور خاص طور پر سوچنے سمجھنے والے افراد کا قافیہ تنگ اور حال بے حال ہوتا ہے۔ قدریں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور ارمانوں اور آرزوؤں کے فلک بوس محل زلزلے میں آجاتے ہیں اور احساس اور ادراک والوں کی نظروں کے سامنے دیواروں پر مایوسی کے سائے ہاتھ پھیلائے رقص کرنے لگتے ہیں۔ اچھے خاصے معقول اور سمجھدار لوگ بھی خودکشی اور موت کے موضوعات پر سوچنے لگتے ہیں یا پھر شکست خوردگی کی نذر

ہوجاتے ہیں۔

جی ہاں! نصرت ظہیر کے مزاحیہ انشائیے بھی ایسے ہی جاں کاہ دور کی تخلیق ہیں۔ آنکھوں میں آنسو اور دل میں اتھاہ درد لئے یہ فن کار ہنسنے اور ہنسانے کے بہانے جینے اور جیتے رہنے کا جواز تلاش کررہا تھا۔ وہ جو حافظ نے کہا تھا ۔

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نشود
بزہد ہم چو توئی یا بفسق ہمچو منے

وہ بھی ایسے ہی ایک دور کی سچائی تھی جس کی ایک جھلک بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہندوستان میں دکھائی دی اور جس کی یادگار اور نہیں کم سے کم اس مجموعے کے دو مضامین میں بڑے دل دوز پیرائے میں جاگزیں ہوگئی ہے۔ ایک ''سارے جہاں سے اچھا'' (حالانکہ اس کا عنوان ''رہیئے اب ایسی جگہ چل کر'' بھی ہوسکتا تھا) جس میں میاں عبدالقدوس دل برداشتہ ہوکر آسٹریلیا ہجرت کرجانے کا ارادہ صرف نہاری کے لالچ میں ملتوی کردیتے ہیں۔ اور دوسرا ''اداسی'' جس کے پیچھے بے پناہ کرب کا احساس چھپا ہوا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ قہقہوں کے پیچھے چھپا ہے۔ یہ وہ کتھارسس ہے جسے ارسطو نے ٹریجڈی میں گویا محافظ کے طور پر متعارف کرایا تھا کہ یہ سہارا بھی نہ ملے تو بقول جمیل مظہری ''اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا''

سچائی بھی یہی ہے کہ ہمارا قہقہہ یا ہلکی سی مسکراہٹ زندگی کی چیرہ دستی کے خلاف ایک دفاعی حربہ ہے۔ بریڈ لے نے شیکسپیرین ٹریجڈی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اگر شیکسپیئر کے المیہ کرداروں میں (مثلاً میکبتھ اور ہیملٹ میں) ذرا سی حس مزاح ہوتی تو وہ المیے سے بچ جاتے اور چڑیلوں اور بھوتوں کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتے۔ دراصل ان کرداروں کے المیہ ہونے کی بنیاد ہی وہ عدم توازن ہے جو ان کے ہاں حس مزاح کی کمی سے پیدا ہوا ہے۔

اور یہ کوئی ادبی تنقید کا مفروضہ نہیں عملی زندگی کی سچائی ہے۔

تقسیم کے بعد کے ہندوستان میں اقلیتوں پر جو کچھ گزری ہے خاص طور پر اردو اقلیت پر جو بیتی، اسے برداشت کرنا اور جزوی طور پر ہی سہی اپنے ہوش وحواس برقرار رکھنا بغیر حس مزاح کے ممکن نہ تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ کنھیا لعل کپور ہوں یا مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر ہوں یا بھارت چند کھنہ، فکر تونسوی ہوں یا دلیپ سنگھ، یوسف ناظم ہوں یا احمد جمال، ان میں سے اکثر کی حس مزاح قبل تقسیم کے محرکات کی پروردہ ہے اور ان پر جغرافیہ اور تاریخ کی گرفت سخت ہے۔

نصرت ظہیر کا مزاح رشید احمد صدیقی کی اصطلاح میں زود ہضم ہے اور چہرے پر مسرت نہ سہی تو رونق چھوڑ جاتا ہے۔ اس سے ہمیں اس محافظ جھوٹ کی پناہ فراہم ہوجاتی ہے جو زندگی کی تپتی دوپہر میں ہمارا پیچھا کرتا رہتا ہے۔

ہندوستان کی تلخ اور تند حقیقتوں کی آندھیوں کی زد پر مزاح کا چراغ جلانا دل گردے کا کام ہے اور وہ بھی اردو میں جس کے بولنے اور جاننے والے اب صرف مرثیے کی زبان میں گفتگو کرنے کے عادی ہوگئے ہیں اور مزاح سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں تو ماتمی لے میں۔

قوموں اور زبانوں کے زوال کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کی تمام تر توانائیاں محض صرف ماتم ہونے لگتی ہیں۔ ان کے چہرے سے اعتماد تو کیا زندگی کی تمنا غائب ہونے لگتی ہے اور سچ پوچھیے تو یہی تمنا، یہی اعتماد ہے جو قوموں کے تہذیبی شعور کو ان کی زبان وادب کی رعنائیوں کو آب وتاب بخشتا ہے اور انہیں مدفون ہونے سے بچاتا ہے۔

نصرت ظہیر کی اس کاوش کو اسی ضمن میں شمار کرتا ہوں اور سب باتوں کو جانے دیجئے ذرا ان نئی تراکیب پر ہی غور کرلیجئے جو اس زندہ رہنے کے عزم سے وجود میں آگئی ہیں۔

زیر استقبال ''پس تولیہ'' ''تہنیتی حوالہ'' ''وسیلۂ ظفر'' ''مقصود منزل'' ''سرخ رنگ کی سبز قدم بس'' ''ازمنہ ریڈ لائن سے قبل کا دور'' ''ہیوں میں نہ شیوں میں یعنی نہ He اور نہ She، اکادمی یعنی اک + آدمی'' ''ہمہ شامی رسالہ ہما اور رسالہ

www.taemeernews.com

شع پڑھنے والا عام اردوداں" "عطیہ بالجبر یا بالصبر"۔

یہ صرف چند تصرفات ہیں جو ان مضامین کے ذریعے ہماری زبان میں آئے ہیں۔ کچھ جان بوجھ کر کچھ اتفاقیہ۔ مگر ان سے یہ ضرور اندازہ ہوگا کہ یہ طنزومزاح کے جزیرے مملکت ادب کی کس طرح توسیع کرتے ہیں۔

1945ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تھی۔ اس کی پچاس سالہ سال گرہ ان دنوں منائی جارہی ہے۔ اس جنگ عظیم میں برطانیہ نے بہت سختیاں جھیلی تھیں۔ آخر کار جب ہٹلر کو ناکامی ہوئی اور برطانیہ کے دونوں ایوانوں کا جلسہ ہوا تو چرچل نے کہا تھا:

"جنگ تو میں نے نہیں برطانیہ نے جیتی ہے۔ میں نے تو صرف اتنا کیا ہے کہ مایوسی کے کڑے سے کڑے لمحات میں بھی فتح کا نشان بلند کرتا رہا اور یہ کہتا رہا کہ فتح ہماری ہی ہوگی۔"

اردو والوں میں ماتمی آوازیں بہت بلند ہونے لگی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ چند استقامت پسند اس کی فتح مندی کی بشارت بھی دیں، اور اچھی طنزیہ اور مزاحیہ تخلیق سے زیادہ کسی زبان کی زندگی کا اور کوئی ثبوت نہیں ہوسکتا کہ مسکراہٹ زندگی کی دلیل ہے اور قہقہہ فتح مندی کا ثبوت۔ اگر ہنسنے کا عمل نصرت ظہیر سے اور کھیلنے کا عمل ان کے مخاطبین سے منسوب کردیا جائے تو اصغر گونڈوی کا یہ شعر حسب حال ہے، ان کے بھی اور ان کے قارئین کے لئے بھی:

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا بحر حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

8 مئی 1995 (بقلم خود)

موہن چراغی

نصرت ظہیر۔ میرا ساتھی

نصرت ظہیر میرا ساتھی ہے وہ مجھے اپنا ساتھی سمجھتا ہے یا نہیں اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ سرراہ بھی کوئی ملتا اُسے بھی اپنا ساتھی بنالیتا تھا لیکن آج کے زمانے میں کون کسی کا ساتھی بن سکتا ہے، مدتوں تک ساتھی ہونے کا رشتہ نبھا سکتا ہے۔ اس کی کتاب تحت اللفظ پر تبصرہ کرنا مرے لیے مناسب نہیں۔ خود کسی بت کو تراشا ہو اور خود ہی اس کی تعریف کروں، دانش مندی نہیں۔۔

رہا سوال نصرت ظہیر کا۔ وہ ایک اچھا صحافی بھی ہوسکتا ہے ایک باصلاحیت مزاح نگار بھی لیکن مرے لیے وہ ایک ایسا بچہ ہے جس سے معلوم نہیں کب کس نے کیوں کوئی من پسند کھلونا چھین لیا ہے۔ اور آج تک وہ چھینے جانے کا درد محسوس کررہا ہے۔ نصرت ظہیر بے حد جذباتی بھی ہے اور حساس بھی۔ معمولی سی چوٹ لگے آنسو بہہ نکلتے ہیں اور میں نے کئی بار اس کے یہ آنسو دیکھے ہیں۔ نصرت اور چراغی میں ایک فرق ہے چراغی بھی بے حد جذباتی ہے، معمولی معمولی باتوں سے زخمی ہوجاتا ہے۔ زندگی کی معمولی معمولی ضرورتوں کی محرومی سے نڈھال بھی ہوچکا ہے لیکن چراغی نے اپنے اوپر ہنسنے کا گر سیکھ لیا ہے۔ اسی لیے چاہتے ہوئے بھی آنسو بہہ نہیں پاتے۔ نصرت ظہیر کو بھی یہ گر سیکھنا ہوگا، اگر وہ ایک بامقصد مزاح نگار بننا چاہتا ہے۔ نصرت ظہیر کو ہی نہیں ان تمام دوستوں کو جو زخم پر زخم کھاتے ہیں۔ تڑپتے ہیں اپنے اوپر ہنسنے کا گر سیکھنا ہوگا۔ اور اگر ہم اپنے اوپر ہنسنے کا گر نہ سیکھ پائے تو آنسو بہتے رہیں گے۔ سیلاب آئے گا اور پھر نہ نصرت ظہیر کسی موڑ پہ ملے گا اور نہ موہن چراغی کسی چوراہے پر ملے گا۔ میں آنسو بہانے سے کبھی روکتا نہیں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آنسو پونچھنے والے محفل سے اٹھ نہیں گئے ہیں۔ یہاں تو آنسو بہانے والے کو یا تو پاگل سمجھا جاتا ہے یا پھر مگرمچھ، جو مگرمچھ کے آنسو بہاتا رہتا ہے۔

میں ہرگز یہ بددعا نصرت ظہیر کو نہیں دوں گا کہ وہ ایک بہت بڑا صحافی بن جائے۔ بہت بڑا مزاح نگار بنے۔ ڈھیر ساری کتابیں شائع کرے۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ بہت بڑا صحافی بننے کے لیے اپنے اندر کے انسان کو مارنا پڑتا ہے۔ کامیاب ادیب بننے کے لیے ضمیر کو لوریاں سناسنا کر سلانا پڑتا ہے اور تب جاکر بڑا صحافی سماج میں بلند مقام حاصل کرسکتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ نصرت ظہیر نہ اپنے اندر کے انسان کو مارنے کی کوشش کرے اور نہ ہی اپنے ضمیر کو لوریاں سناسنا کر سلادے۔ نصرت جیسا ہے ویسا ہی رہے تو ایک دن ضرور اچھا باوقار مزاح نگار بن جائے گا۔۔(۱۹۹۳)

www.taemeernews.com

ڈاکٹر قمر رئیس

نصرت ظہیر اور بقلم خود: ایک جائزہ

نصرت ظہیر صورت سے دلی کے خلیفہ لگتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے جیسے بر دکھائی کو آئے ہوں۔ طبیعت سے سخت گاندھیائی معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی تحریریں پڑھ کر یقین ہوتا ہے کہ ان کے وجود میں کوٹلیہ اور رشید احمد صدیقی کی روحیں حلول کر چکی ہیں اور ایک دوسرے میں ضم ہو چکی ہیں۔ کوٹلیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ پیر میں ایک کانٹا چبھ جانے سے اس نے کیکر اور کانٹوں کی ساری نسل کو نیست و نابود کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس کی تصنیف 'ارتھ شاستر' اس حقیقت کی شاہد ہے کہ وہ سیاست، سماج اور انسانی نفسیات تینوں کی نبض ایک ساتھ دیکھتا تھا اور تب اپنی تشخیص سامنے رکھتا تھا۔ نصرت ظہیر کے انشائیوں اور مزاحیوں سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر اُس کانٹے کو نابود کرنے کے درپے ہیں جو انہیں انسان اور انسانیت کے تلوے میں چبھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے گرد و پیش کی زندگی کے ہر منظر اور ہر مرض کو بظاہر ایک کھلنڈرے تماشائی لیکن بباطن ایک شاطر حکیم اور چونچال ظریف کی عقابی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کی روح نے ان کو زبان و بیان کے ایسے پینترے اور شعبدے سکھائے کہ وہ اپنے قاری کو اپنے قلم کی رو اور روانی کے ساتھ جدھر چاہتے ہیں لے اُڑتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے ہر اکھاڑے اور ہر پیشے میں وہ بے تحاشہ اور بے محابا داخل ہو جاتے ہیں اور وہاں ایسے عجوبے دکھاتے ہیں کہ قاری عش عش کر جاتے ہیں۔

اس حقیر کے نزدیک طنز کی چاشنی کے بغیر ظرافت ایک ایسی الھڑ حسینہ ہے جو گونگی ہو۔ جو جنت نگاہ تو ہو، لیکن فردوس گوش و ہوش نہ بن سکے۔ جو انسانی تہذیب کی بوالعجبیوں کے بارے میں سرگوشی میں بھی کچھ کہنے سے معذور ہو۔

نصرت ظہیر کے انشایئے اور کالم، شوخیٔ فکر و بیان کی ایک اچھوتی لہر سے قاری کے دل میں نشاط و انبساط کی کیفیت جگاتے ہیں۔ لیکن اس شگفتہ نگاری میں اکثر طنز کی ہلکی سی تلخی اور چبھن بھی پنہاں ہوتی ہے جو کبھی سرگوشی میں اور کبھی بلند گفتاری کے ساتھ قاری سے کچھ کہتی ہے، اسے زندگی کے مظاہر کے بارے میں زیر لب سوچنے پر اکساتی ہے۔ دراصل یہی وہ مقامات آہ و فغاں ہیں جہاں نصرت ظہیر کی دردمندی کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی اور سماجی شعور کی چنگاریاں بھی اڑتی نظر آتی ہیں۔ رشید صاحب کا طنز و مزاح بے شک خواص پسند تھا لیکن نصرت ظہیر اخباری کالم نگاری سے جڑے ہونے کے باوجود عوام و خواص دونوں کے ذوق کو یکساں طور پر اپیل کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ زندگی کے آشوب اور اتھل پتھل کے ان مظاہر سے نقاب سرکاتے ہیں، جو عہد حاضر کے ہر انسان کو مضطرب رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے humorous vision میں کہیں بھی تصنع، تلخ گفتاری اور زہر خند کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس سادگی، سہل پسندی، لطیف اشارات اور زبان کا ہنرمندانہ استعمال ان کے مزاحیہ اسلوب کے اجزائے خاص ہیں۔ اس پر مستزاد ان کے مشاہدہ کی باریکی جو زندگی کی ناہمواریوں کو دور سے دیکھ لیتی ہے اور تخیل کی تدبیر کاری سے ان کو دلچسپ، چٹ پٹے اور چٹیلے انداز سے پیش کرتی ہے۔

نصرت ظہیر نے بھی طنز و مزاح کے میدان میں، رشید صاحب کی طرح کئی طرح کے حربے اور پینترے آزمائے ہیں۔

www.taemeernews.com

مثلاً انہوں نے ظریفانہ اسلوب کی آبیاری میں پیروڈی سے بھی کام لیا ہے۔ مزاحیہ یا نیم مزاحیہ میاں عبدالقدوس جیسے کردار بھی گڑھے ہیں۔ جگہ جگہ قول محال کے انداز پر معنی خیز جملے بھی تراشے ہیں۔ بطرس کی طرح محاکاتی رنگ کی ڈرامائی واقعہ نگاری سے بھی مزاح پیدا کیا ہے۔ مکالموں کی شوخی اور بذلہ سنجی سے بھی فیض اٹھایا ہے۔ انہوں نے شعر و ادب کے مواد سے بھی مزاح کا رنگ جمایا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ انہوں نے عصر حاضر کی سیاسی اور سماجی ناہمواریوں پر مشتمل جراحی کر کے اپنے قارئین کا دل جیتا ہے اور اپنے کالموں کی ایک ایسی پہچان بنائی ہے جو انہیں فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین دونوں سے متمائز کرتی ہے۔

'بقلم خود' میں شامل نصرت ظہیر کے مزاحیوں اور مزاحیہ حربوں میں اتنا تنوع ہے کہ اس مختصر تبصرہ میں ان کی مثالیں دینا ممکن نہیں ہے۔ وہ مختلف پیشوں کے ماہرین کی استحصالی اور احتجاجی ذہنیت کو بھی بڑی مہارت سے پیش کرتے ہیں اور یہاں ان کا بالواسطہ طنز بڑا قاتل ہوتا ہے۔ مثلاً دہلی میں وکیلوں کی بار بار کی ہڑتال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'ہڑتال کا سماجی زندگی پر اتنا زبردست اثر پڑا کہ ہر طرف امن چین ہوگیا۔ پڑوسی آپس میں جھگڑتے، مگر فوراً ہی صلح کر لیتے کہ عدالتیں تو بند تھیں۔ میاں بیوی کے جھگڑے رک گئے۔ طلاقوں کا سلسلہ بند ہوگیا۔ جائیدادوں سے متعلق تنازعے لوگ خود ہی حل کرنے لگے۔ مکان مالک اور کرایہ دار سکون سے رہنے لگے اور یہ سب اس لیے تھا کہ وکیلوں نے وکالت بند کر رکھی تھی'۔ (ص ۹۴)

'سفر وسیلہ'، صفر اردو کے شاہکار مزاحیوں میں ہمیشہ جگہ پائے گا۔ اس میں ریل اور ہوائی جہاز کے علاوہ دہلی میں چلنے والی بسوں کی روداد بیان کی گئی ہے۔ اس میں ایک جگہ وہ بس کے اندر آسانی سے داخل ہونے کے لیے ایک سائنسی تھیوری پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

'جیسے ہی بس آئے اور لوگ اس میں داخل ہونے کے لیے دروازہ پر ٹوٹ پڑیں تو...... تھوڑی سی طاقت استعمال کر کے یا کسی کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل کر کسی طرح بھیڑ کے بیچ میں اٹک جائیں۔ بس اس کے بعد آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ چپ چاپ بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں بند کر لیجئے۔ چند لمحوں میں ہی آپ کا وجود کشش ثقل سے آزاد ہو جائے گا اور آپ اپنے پورے وجود کے ساتھ اوپر اٹھنے لگیں گے۔ اس طرح کسی کے کندھے، کسی کے بازو اور کسی کے سر پر سواری کرتے کرتے آپ بھیڑ کی کیومولیٹو فورس کے سائنسی اصول کے تحت بس کے اندر پہنچ جائیں گے۔' ص ۵۰

نصرت ظہیر لفظی الٹ پھیر، تکرار، محاورہ میں تصرف اور صوتی غرابت سے بھی خوب صورت مزاح پیدا کرتے ہیں صرف چند جملوں کی تراش اور تہہ داری پر غور کیجئے۔

'اچھی تنقید وہ ہوتی ہے جس میں تھوڑی سی ظوئے انصاریت ہو'۔

'اردو جیسی شاعرانہ زبان بولنے والا آدمی شاعری نہیں کرے گا تو کیا چھولے بھٹورے بیچے گا'۔

'پھر چاہے وہ بشیر بدر ہی کیوں نہ ہو پہنچنے کے لیے اردو شاعر کو مابعد الشعری سہاروں کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے'۔

'اچھا ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جس کا تحریر کردہ نسخہ صرف اس کے کمپوڈر یا دوا فروش کی سمجھ میں آئے لیکن بہت اچھا ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جس کا نسخہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔'

ادیبوں کے ایک استقبالیہ جلسہ میں مجمع کی کثرت کا حال بیان کرتے ہوئے مزاح نگار جو تشبیہ دیتا ہے ذرا اس کی ندرت ملاحظہ ہو۔

'ابھی زیر استقبال ادیب اندر آ چکے تھے اور پورا ہال جامع مسجد سے سیلم پور جانے والی ڈی ٹی سی بس میں تبدیل ہو چکا تھا سب لوگ اس بری طرح ایک دوسرے سے سٹ کر بیٹھے اور کھڑے تھے کہ ہلنے تک کی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ایک صاحب نے جماہی لی تو جماہی کی واپسی میں دوسرے صاحب کی ناک اور تیسرے کا کان ان کے دانتوں میں آتے آتے رہ گیا۔ (ص ۲۴)

کہتے ہیں اچھی ظرافت اسی ادیب کا حصہ ہوتی ہے، جو خود اپنی

www.taemeernews.com

ذات پر یا اپنی پیشہ وارانہ حیثیت پر ہنسنے کا ظرف اور حوصلہ رکھتا ہو۔ نصرت ظہیر نے اپنے قلم سے اہل قلم کا مضحکہ اڑانے میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ اس میدان میں ان کے قلم میں غضب کی جولانی۔

'ایک مباحثے کی پیروڈی' میں لکھتے ہیں۔

'ناظم مباحثہ نے اعلان کیا۔ اس محفل میں پروفیسر...... بھی موجود ہیں جو لسانیات کے ایک بڑے ماہر ہیں اور حال ہی میں اردو زبان پر بحر اوقیانوس کی زبانوں کے لسانیاتی عمل اور ردعمل کے بارے میں تحقیق کر کے ہونولولو سے واپس آئے ہیں۔ لہذا میں پروفیسر لولو معاف کیجئے پروفیسر...... سے درخواست کروں گا کہ وہ مصنف کے لسانی رجحانات پر روشنی ڈالیں۔

دعوت سخن ملتے ہی پروفیسر مذکور نے جیب سے رومال نکال کر ناک صاف کی۔ منہ صاف کیا۔ دانت صاف کیے بالوں کو ٹھیک طرح جمایا اور کیمرے کا رخ اپنی جانب تبدیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جیسے ہی کیمرا اور لائٹوں کا رخ ان کی جانب ہوا انہوں نے کولگیٹ کے اشتہار کی طرح مسکرا کر دانت دکھائے اور بولنے کے لیے منہ کھولنے ہی والے تھے کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔

'میں پروفیسر صاحب سے پورا اتفاق رکھتا ہوں'۔

'مگر قبلہ میں نے تو ابھی کچھ کہا ہی نہیں'۔ پروفیسر صاحب نے مسکرا کر کہا۔

'کوئی بات نہیں مجھے معلوم ہے آپ کیا کہنے والے ہیں۔ گذشتہ پانچ مذاکروں سے آپ ایک ہی بات گھما پھرا کر کہہ رہے ہیں'۔

بعض جانی پہچانی سیرتوں کے خاکے بھی نصرت ظہیر نے تخلیقی حسن کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ وہ افسانویت کے بجائے پیکر تراشی اور مرقع نگاری پر زور دیتے ہیں۔ لیکن زندگی کی سچائیوں سے وہ سرمو انحراف نہیں کرتے۔ بدلتے ہوئے انحطاط پر انسانی رشتے اور ٹوٹتی بکھرتی تہذیبی قدروں کی المناکی، ان کے انشائیوں میں جس ظریفانہ ڈھنگ سے بصیرت کا سامان بہم پہنچاتی ہے وہ ان کی شناخت بنتی جا رہی ہے۔ ☆......☆

شفیق الرحمٰن کی طرف...

شجاع خاور

پہلے یہ کہ میرے خیال سے مزاح تخلیقی ادب کی ایک صنف سے زیادہ اس کا ایک اسلوب ہے۔ گویا یہ تخلیقی ادب کی زبان کا ایک رسم الخط ہے۔

دوسرے یہ کہ بیسویں صدی کے اواخر کا سخت گیر اور ہوشیار قاری سپاٹ اور پھس مزاح کو زیر لب تبسم سے بھی نہیں نوازتا، بے ساختہ قہقہے تو گیا۔

تیسرے یہ کہ نصرت ظہیر ایسے زمانے میں لکھ رہے ہیں جس میں مزاح کے نام پر سپاٹ، پھیکی اور پھس پھسی تحریروں کی بھر مار ہے۔ پھر قلم کار کہلائے جانے کے لالچ میں آ کر بعضوں نے ادھیڑ عمری میں اور کچھ نہیں تو مزاح نگاری کے بہانے ہی قلم کاری شروع کر دی ہے۔

اور چوتھے یہ کہ ایک طرف تو مزاح کے نقاد اور مبصروں نے شاید ہمارے سب سے قدآور شاہ مزاح نگار شفیق الرحمٰن کو ہمارے ذہنوں سے نکالنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف بعد کے معروف مزاح نگاروں نے ہمیں اپنا کچھ خاص بھی کم ہی دیا ہے۔

اس لیے یہ خوش آئند بات ہے تعجب نہیں کہ نصرت ظہیر نہ صرف ہمارے مزاحی مذاق کو شفیق الرحمٰن کی طرف لے جانے میں کامیاب ہو رہے ہیں بلکہ ہمیں اب اپنا کچھ خاص بھی دینا شروع کر رہے ہیں۔ اچھا مزاح جتنا سطور میں ہوتا ہے اس سے زیادہ بین السطور میں۔ نصرت ظہیر مزاح کے اس معیار سے نہ دور ہیں نہ بے خبر۔ مزاح کے تربیت یافتہ اور سخت گیر قاری کو بھی ان کی ایک تحریر میں دو تین اچھے پنچ Punch مل جاتے ہیں۔ غیر تربیت یافتہ قاری کو تو اس سے زیادہ ہی مل جاتے ہوں گے۔ اچھا مزاح کون نہیں پڑھنا چاہتا۔ خوب سے خوب تر کی امید نصرت ظہیر سے بھی مجھے بھی ہے اور ہمیں بھی۔ ☆ (تحت اللفظ ۱۹۹۲)

www.taemeernews.com

پروفیسر نثار احمد فاروقی

نصرت ظہیر

اردو زبان کے امتیازات میں ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے ابتدائی دور میں ہی طنز و مزاح کی تخم پاشی بھی ہو چکی تھی جس کے برگ و بار امیر خسرو سے منسوب چٹکلوں سے لے کر جعفر زٹلی، امیر خاں انجام، محمد رفیع سودا، انشاء اللہ خاں انشاء وغیرہ کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ پھر نثر میں غالب، سرشار، وغیرہ کے بعد اودھ پنچ کے لکھنے والوں کا عہد شروع ہوتا ہے تو محفوظ علی، بھوتی، منشی سجاد حسین وغیرہ کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد کے طلوع ہونے کے بعد تو نظم و نثر دونوں میدانوں میں ایسی قد آور شخصیات سامنے آتی ہیں جنھوں نے اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں روشن ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شفیق الرحمن، کنہیالال کپور، مشتاق احمد یوسفی، ابراہیم جلیس، احمد جمال پاشاہ یہ سب وہ اہل قلم ہیں جن کی تحریروں نے طنز و مزاح کی تاریخ کو زندہ و تابندہ کر دیا ہے۔

اردو صحافت نے بال و پر نکالے تو اودھ پنچ نے سیاسی اور معاشرتی مسائل پر چھینٹے اڑانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اُس نے اردو اخبارات میں 'کالم نویسی' کی ایک نئی صنف کی بنیاد ڈالی۔ عبدالمجید سالک، مجید لاہوری، فکر تونسوی، ابن انشاء، عطاالحق قاسمی، مجتبیٰ حسین جیسے بہت سے حضرات نے اس صنف کو پروان چڑھایا۔ پاکستان میں کالم نویسی کا فن زیادہ مقبول ہوا، اس کے کچھ سیاسی اسباب بھی تھے۔ ادبی کالم نویسی میں اس وقت بھی پاکستان میں مشفق خواجہ اور ہندوستان میں مجتبیٰ حسین بہ قولِ غالب، 'کوس لمن الملکی بجار ہے ہیں'۔

ہماری بزم ادب سے رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور، فکر تونسوی اور احمد جمال پاشاہ کے رخصت ہو جانے سے نہ صرف یہ کہ بڑا خلا پیدا ہو گیا ہو گیا بلکہ حالات کچھ مایوس کن ہو چلے تھے۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ اردو کا چلن رک گیا، اُس کی تہذیبی بنیادیں ہلنے لگیں۔ اخبار اور رسالے زیادہ تر تجارتی انداز میں سیاسی مصلحتوں کے مطابق رہ گئے، رہی سہی کسر ٹی وی نے پوری کر دی کہ ذوق خواندگی جو پہلے ہی ضعیف تھا اب اور بھی مضمحل ہو گیا۔ ان حالات میں اگر انصاف کی نظر سے دیکھیں تو آج سے پچاس سال پہلے اردو دنیا میں جیسے طنز و مزاح لکھنے والے تھے اور جس طرح کا شگفتہ، شائستہ، نوک پلک سے درست اور آراستہ پیراستہ مزاحیہ ادب لکھا جا رہا تھا، اُس کے مقابلے میں آج بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ 'غنیمت ہے'!

اردو میں ایک کہاوت ہے: 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' آج سے دس بارہ سال پہلے جب نصرت ظہیر کی تحریریں پہلی بار نظر سے گذریں تو پہلا تاثر یہی تھا کہ یہ ذہن زرخیز ہے اور اس قلم میں توانائی ہے۔ اب تو وہ ایک اچھے منجھے ہوئے اور مانے ہوئے مزاح نگار اور کالم نویس ہیں۔ اُن کا ایک مجموعہ 'تحت اللفظ' ۱۹۹۲ء میں آیا تھا اور دوسرا اب نومبر ۱۹۹۶ء میں 'بقلم خود' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کی معنوی خوبیوں پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ کہہ دوں کہ ۱۹۹۶ء میں شاید ہی اردو کی کوئی کتاب اس سے زیادہ حسن اور نفاست سے شائع ہوئی ہو۔

نصرت ظہیر کے فن کی چند نمایاں خوبیاں اور خصوصیات ہیں، اور ان خوبیوں میں ہندوستان کی حد تک مجتبیٰ حسین کے سوا ان کا کوئی حریف نہیں۔ پہلی بات تو اُن کی تہذیب اور شائستگی ہے۔

www.taemeernews.com

دراصل مزاح کا محرک بھی شائستگی ہوتی ہے ورنہ وہ ہجو، پھکڑ، گالم گلوج بن کر رہ جاتا ہے۔ نصرت ظہیر کی تحریروں کا مزاج اردو کلچر کا مزاج ہے۔ صرف یہی ایک خوبی دوسری خصوصیات پر بھاری ہوسکتی ہے، لیکن اُن کے اُسلوب میں اضافی اوصاف بھی ہیں۔ وہ درازنفسی اور لاطائل نویسی سے بور نہیں کرتے، گھسے پٹے موضوعات کا انتخاب نہیں کرتے، دوسروں کی نقل اتارنے کی کوشش نہیں کرتے اور اُن کی تحریروں کے بین السطور میں یا ان کے ماورا ایک اصلاحی مقصد بھی پوشیدہ ہوتا ہے جسے 'دردمندی' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ قہقہوں میں آنسوؤں کی آمیزش فن مزاح نویسی کی معراج ہے۔ اور کہیں کہیں ان کی تحریروں میں اس کی ایسی جھلک نظر آتی ہے کہ اگر یہ ملکہ راسخ ہوگیا تو وہ آنے والے دور میں بھی اس عہد کے نمائندہ مزاح نگار تسلیم کیے جائیں گے۔۔

نصرت ظہیر چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایسی نکیلی بات کہہ جاتے ہیں کہ 'تیرنیم کش' کا مزہ آتا ہے۔ چند جملے بطور نمونہ لکھنا اس لیے ضروری ہے کہ 'دعوے بے دلیل' کو دلیل حماقت نہ سمجھا جائے۔

میاں عبدالقدوس اقلیدس کا سبق دیتے ہوئے لکیر (خط) کی تعریف کررہے ہیں:

'جس میں لمبائی تو خوب ہو مگر موٹائی، چوڑائی اور گہرائی بالکل نہ ہو اُسے کیا کہیں گے؟'

'آج کا مسلمان'

'لاحول ولاقوۃ۔ میں مسلمان کی نہیں، لکیر کی بات کررہا ہوں'۔

'کوئی بات نہیں۔ آج کا مسلمان لکیر کا فقیر ہی تو ہے!' (ص ۴۵)

'محلے کے پہلوان خلیفہ امداداللہ کی مدد بھی ہوتی رہتی ہے جو پہلے ہڈیاں توڑنے میں کمال رکھتے تھے۔ اب بڑھاپے میں ہڈیاں جوڑنے کا کام کرتے ہیں۔ (ص ۵۰)۔

'اکادمی! وہ ادارہ جو عموماً زبان وادب کی ترقی کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اس ادارے کے بغیر کوئی زبان ترقی نہیں کرسکتی۔ اگر کرلے تو اس کی خوب پٹائی کرنی چاہئے'۔ (ص ۵۹)۔

'جھگی بستیوں میں رہنے والے ..... دوپہر کو روکھی سوکھی کھانے کے بعد شام کو کام سے نمٹ کر گھر آتے ہیں اور رات کو پھر روکھی سوکھی یا تبدیلی ذائقہ کے لیے سوکھی روکھی کھا کر مزے سے سوجاتے ہیں'۔ (ص ۶۲)۔

'کبھی کبھی تو ناسمجھی کے معاملے میں تم اردو صحافیوں سے بھی آگے نکل جاتے ہو'۔ (ص ۱۰۳)

'ہمیں لباس اور وضع قطع سے آزاد خیال دکھائی دینے والی ایک شاعرہ نظر آئیں جو کئی بھاری بھرکم شاعرات کے پہلو میں اسٹیج پر بیٹھی تھیں۔

'خدا کی پناہ، کیا دعوتِ سخن دیتا ہوا انداز ہے'۔ (ص ۱۰۴)

ایسے رنگین، چلبلے، شوخ وشنگ مگر پھر بھی دائرہ تہذیب میں بند فقرے اس کتاب کے ہر مضمون میں قدم قدم پر ملتے ہیں، جنہیں ٹھٹھک کر بار بار پڑھنے اور ہر بار نیا لطف حاصل کرنے کا جی چاہتا ہے۔ کسی حد تک اردو صحافت بھی ہمارے ادب کا حصہ رہی ہے اور ہے، مگر فرق یہ ہے کہ اس کی عمر مختصر ہوتی ہے۔ نصرت ظہیر کو محض 'کالم نویس' کہنا میں اس لیے پسند نہیں کرتا کہ میں اُن کی درازیِ عمر کا خواہاں ہوں اور مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ اُن کی تحریریں آنے والے زمانوں میں بھی انبساط کا ذریعہ رہیں گی۔ اردو کے مزاحیہ ادب کے ذخیرے میں 'بقلم خود' ایک خوشگوار اور قابل قدر اضافہ ہے۔۔

☆

منی آرڈر فارم میں مقررہ جگہ پر اپنا مکمل پتہ،
پن کوڈ نمبر، فون نمبر کے ساتھ لکھیں
نیز رقم کس لیے بھیجی گئی صراحت کریں

پروفیسر گوپی چند نارنگ

نصرت ظہیر آدمی خوب ہے

نصرت ظہیر آدمی نہیں جن ہیں۔ ان کے دو نہیں شاید چار ہاتھ ہیں۔ دن رات لکھتے ہیں اور قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ کہتے ہیں 'نمی دانم' لیکن جانتے یہ خوب ہیں کہ اخبار جو صبح سے شام تک ردی کے ڈھیر پر چلا جاتا ہے، اس کا قاری کیا پڑھنا چاہتا ہے۔ دراصل اخبارات بالخصوص اردو اخبارات میں آج کل کوڑا بہت ہوتا ہے۔ سنسنی خیزی، تشدد اور جرائم کے واقعات، فرقہ پرستی، ذات برادری، سستی جذباتیت، سیاسی بازیگروں کی لغو اور بے معنی بیان بازی، آئے دن کے بم دھماکے، فسادات، قتل و غارت، لغو اشتہار بازی، صارفیت، گندگی ہی گندگی، نہایت مبالغہ آمیز جانب دارانہ اداریے جو اخبارات کے بزعمِ خود دانشور مدیرانِ مکرم لکھتے ہیں، اس سب عفونت کے اتار کے لیے جو قاری کے ذہن کو آئے دن مسموم کرتی رہتی ہے، یعنی اس ذہنی آلودگی کا بہترین توڑ وہ مزاحیہ کالم یا فکاہیات یا ہلکے پھلکے قطعات ہوتے ہیں جو تھوڑی دیر کو فرحت بخشتے ہیں اور ذائقہ بدل دیتے ہیں۔ نصرت ظہیر سنجیدہ بھی خوب لکھتے ہیں لیکن نام انھوں نے مزاحیہ کالم نگاری ہی میں کمایا ہے۔

دراصل اخبارات بالخصوص اردو اخبارات میں آج کل کوڑا بہت ہوتا ہے۔ سنسنی خیزی، تشدد اور جرائم کے واقعات، فرقہ پرستی، ذات برادری، سستی جذباتیت، سیاسی بازیگروں کی لغو اور بے معنی بیان بازی، آئے دن کے بم دھماکے، فسادات، قتل و غارت، لغو اشتہار بازی، صارفیت، گندگی ہی گندگی، نہایت مبالغہ آمیز جانب دارانہ اداریے جو اخبارات کے بزعمِ خود دانشور مدیرانِ مکرم لکھتے ہیں، اس سب عفونت کے اتار کے لیے جو قاری کے ذہن کو آئے دن مسموم کرتی رہتی ہے، یعنی اس ذہنی آلودگی کا بہترین توڑ وہ مزاحیہ کالم یا فکاہیات یا ہلکے پھلکے قطعات ہوتے ہیں جو تھوڑی دیر کو فرحت بخشتے ہیں اور ذائقہ بدل دیتے ہیں۔

نصرت ظہیر زندگی کی 61 بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ دہلی کے نواحی علاقے بھی خوب ہیں، سکندرآباد ضلع بلندشہر، کیسے کیسے جیالے وہاں سے نکلے۔ والد بزرگوار ان کے نعت گو ہیں۔ موصوف انقلابی بننے چلے۔ برسوں خوب خوب پارٹی لائن عینیت پسندی کے چکر میں رہے۔ تبھی تو اپنے کالموں میں وہ ایسے ایسے جملے نکالتے ہیں جو وہی لکھ سکتا ہے جو اس دشت کی صحرانوردی کر چکا ہو:

"اس ملک میں کمیونسٹ پارٹیوں کے موجود رہتے ہوئے انقلاب آنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ ہماری سبھی کمیونسٹ پارٹیاں ماشاء اللہ ساٹھ سال سے اسی عظیم جدوجہد میں لگی ہوئی ہیں کہ ملک میں اللہ نہ کرے انقلاب نہ آجائے۔ اسی طرح ملک کی آزادی اور جھما جھم کرتی جمہوریت واپس انگریزوں کو سونپنے یا غلامی کا زریں دور واپس لانے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ کیونکہ انگریزوں کی تو صرف ایک ہی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی جس نے ہمیں غلام بنا رکھا تھا۔ جبکہ آج کی تاریخ میں

www.taemeernews.com

ہم نے اس سے بڑی نہ جانے کتنی ملٹی نیشنل ایسٹ انڈیا کمپنیوں کو غلامی میں لے کر اپنا آقا تسلیم کرلیا ہے کہ آؤ دونوں ہاتھوں سے ہمیں لوٹو کھسوٹو، ہماری ہڈیوں کا گودا تک چبا کھاؤ اور جتنے داموں پر چاہو ہم ایک سو پچیس کروڑ ہندستانیوں کو بیچ کر مزے اڑاؤ۔''

نصرت ظہیر سکندرآباد سے دہلی براستۂ میرٹھ یونیورسٹی آئے۔ آتے ہی ماہنامہ 'یوجنا' کے لیے پہلا مضمون لکھا۔ اس کے بعد پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔ 'بات سے بات چلے' کے عنوان سے تیج دہلی کے لیے روزانہ کالم لکھنا شروع کیا۔ 1987 سے روزنامہ 'قومی آواز' کے لیے 'دہلی ڈائری' لکھنے لگے۔ اسی سال 'تحت اللفظ' کے عنوان سے فکاہیہ کالم لکھنے لگے۔ یوں طنز و مزاح وہ اب تقریباً تیس برس سے لکھ رہے ہیں۔ اس دوران 'اخبار مشرق' دہلی کے لیے بھی 'وغیرہ وغیرہ' لکھا۔ ان کا ایک مزاحیہ ناول 'ابن بطوطہ کا دوسرا سفر' بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب تک نثری مجموعے چار آئے ہیں۔ 'تحت اللفظ'، 'بقلم خود'، 'خراٹوں کا مشاعرہ' اور 'نمی دانم'۔ اب شعری مجموعہ بھی شائع کیا چاہتے ہیں۔ لیکن مشاعرے یہ صرف بین الاقوامی پڑھتے ہیں۔ ان کے کیے ہوئے ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ 'تہاڑ جیل میں میرے شب و روز' کے انگریزی سے ترجمے پر انھیں 2009 میں ساہتیہ اکادمی کا ترجمہ ایوارڈ دیا گیا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے ہیں۔ روزنامہ ملاپ، روزنامہ تیج، روزنامہ قومی آواز کے علاوہ روزنامہ راشٹریہ سہارا کے 'عالمی سہارا' کی ادارت بھی کر چکے ہیں۔ قومی اردو کونسل سے دیوناگری سے شائع ہونے والے 'اردو درپن' کی ادارت بھی انھوں نے کی تھی۔ اب انھیں کے ماہنامہ 'اردو دنیا' اور سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کی ادارت کا کام بھی دیکھتے ہیں۔

ان کا جو کالم مجھے سب سے زیادہ پسند ہے اس میں سرکاری اعزازات اور پدم شری کی جو دُرگت بنائی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہاکی کے ناکام کھلاڑی، ایسے فلم ڈائریکٹر جن کی فلمیں کوئی نہیں دیکھتا، یا ایسے ایسے ڈاکٹر اور سرجن جنھوں نے وزیراعظموں کی ٹانگوں کو بیکار کردیا، ان پر خطابات کی تہمت رکھی جاتی ہے۔ اور تو اور مزاح نگاری میں ان کے سینئر مجتبیٰ حسین بھی خدا خدا کر کے پدم شری تک جا پہنچے۔ ایک دن ان کی مراد بھی بر آئے گی۔ ایوارڈ و اعزاز ایسی چیز ہے کہ مل جائے تو ہو، نہ ملے تو تھو کروا۔ ذرا فضیل جعفری اور زبیر رضوی جیسوں کو دیکھیے کہ آج تک سینہ کوبی کر رہے ہیں۔ مزاح میں تو مضحک بنانے کے لیے حقیقت کو معکوس کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ حسنِ ظرافت کا لازمہ ہے۔ مزاح نگاری میں میں ان لوگوں کا خاص طور سے قائل ہوں جو ذاتی طنز یا تلخی سے کام نہیں لیتے اور زعفران زار نوعیت کا مزاح لکھتے ہیں جبکہ اردو کی اکثریت زیادہ تر طنز و مزاح کے ذریعہ حساب بے باق کرتی رہتی ہے۔ ذرا پطرس بخاری، کنہیا لال کپور، راجا مہدی علی خاں جیسوں کو دیکھیے جن کا مزاح زندہ جاوید اور باغ و بہار ہے۔ نصرت ظہیر بھی اپنے معاصرین میں اسی خصوصیت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔

آخر میں ایک بات اور، پچھلے پانچ برسوں سے یہ ایک ضخیم ادبی رسالہ 'ادب ساز' کے نام سے نکال رہے ہیں جس کا ضخیم اور کارآمد 'ساحر لدھیانوی خاص نمبر' ابھی دو برس پہلے آیا ہے۔ یہ رسالہ ادبی جرائد میں کئی خصوصیات کا حامل ہے لیکن کاش وہ اس کو باقاعدگی سے نکال سکیں اور اس پر بھی اتنی توجہ کرسکیں جتنی توجہ وہ آئے دن کے کالموں پر کرتے ہیں جن میں سے بیشتر کی حیثیت ریت پر نقش بنانے کی سی ہے۔ بات صرف ترجیحات طے کرنے کی ہے۔ مگر مزاح نگار سے بھلا کہے کون، چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی۔۔

☆......☆......☆

قلمی معاونین سے درخواست

● مسودات صاف اور خوش خط ارسال فرمائیں ● سطریں قریب قریب نہ ہوں ● لفظوں کو جوڑ کر نہ لکھیں جیسے:

اندنوں، ہمکو، تمکو، چاہیئے، انکو، رہینگے، دیگے، ایسکے، انکی، اسکی، کیلئے

● نئے نام اور غیر مانوس الفاظ واضح لکھیں۔

www.taemeernews.com

پدم شری مجتبیٰ حسین

نصرت ظہیر کی ایک کتاب کی رسم اجرا پر

مجھے یاد ہے اور آپ میں سے بہت سے حضرات کو بھی یاد ہوگا کہ چار سال پہلے میں نے اسی غالب اکیڈیمی میں نصرت ظہیر کی پہلی کتاب 'تحت اللفظ' کی رسم اجرا انجام دی تھی اور آج تیسری کتاب 'بقلم خود' کی رسم اجرا انجام پا رہی ہے۔ میں اس ادبی سانحہ پر بہ قلم خود دم بخود ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے آج تک جب بھی کسی ادیب کی کتاب کی رسم اجرا انجام دی اس بچارے ادیب کی کوئی اور کتاب بعد میں شائع نہیں ہوئی۔ کتنے ہی ادیب ہیں جن کی اولین کتابوں کی رسم اجرا میں نے انجام دی اور آج وہ خدا کے فضل و کرم سے نہایت آرام سے گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس راز کو میں نے مفاد عامہ کے پیش نظر آج تک فاش ہونے نہیں دیا کہ میرے ہاتھوں کسی کتاب کی رسم اجرا اصل میں مصنف کی ادبی زندگی کے تابوت میں آخری کیل کا درجہ رکھتی ہے بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر میں کسی ادیب کی کتاب کی رسم اجرا انجام دوں تو سمجھئے کہ اس ادیب کی 'نس بندی' عمل میں آگئی۔ میں خود بھی اپنی اس تاثیر پر اکثر خوش ہو لیتا تھا کہ اس طرح اردو ادب میں نئی کتابوں کے چھپ کر آنے کا سلسلہ کم ہو جائے گا کیوں کہ ہمارے دوست باقر مہدی کا خیال ہے کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل محض اس لیے تاریک نظر آتا ہے کہ یہاں کثرت سے اردو کتابیں شائع ہونے لگی ہیں۔ کتابوں کو بھلے ہی کوئی پڑھے یا نہ پڑھے لیکن بلا وجہ اس کا انبار لگتا چلا جائے، تو یہ بھی اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن نصرت ظہیر کی اب جو یہ تیسری کتاب شائع ہو رہی ہے تو اس سے میرا بھرم ٹوٹ گیا ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب میں بھی 'فیملی پلاننگ' کے طریقے ناکام ہونے لگے ہیں۔۔

پھر یہ کتاب اس قدر خوب صورت ڈھنگ سے شائع ہوئی ہے کہ کسی زاویے سے اردو کی کتاب نہیں لگتی۔ بلا مبالغہ یہ اتنی دیدہ زیب ہے کہ لاکھ کوشش کے باوجود میں اب تک اسے پوری طرح نہیں پڑھ پایا۔ جب جب کتاب کو کھولتا ہوں تو میں اس کے ظاہری حسن میں کھوسا جاتا ہوں اور کتاب کا متن کہیں پیچھے رہ جاتا ہے۔ میرے ایک مرحوم دوست اکثر کہا کرتے تھے کہ اردو کتابوں کی گھٹیا طباعت اور کتابت کی وجہ سے ہی انہیں، ان کتابوں کو نہایت توجہ اور غور سے پڑھنا پڑتا ہے۔ علم کتنی مشکل سے حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ اردو کتابوں کو پڑھنے کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔ زیور طبع سے آراستہ ہونے کے بعد اگر کسی کتاب میں کتابت کی غلطیاں نہ ہوں، صفحات کی جز بندی میں گھپلا نہ ہو اور طباعت اچھی ہو تو وہ اسے اردو کی کتاب ماننے سے انکار کر دیتے تھے۔ اردو میں خوب صورت اور دیدہ زیب کتابیں چھاپنے کے بھی کئی نقصانات ہیں۔ یادش بخیر! بہت عرصہ پہلے ممبئی میں ایک صنعت کار ہوا کرتے تھے جو اردو میں شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ ایک بار ان کا ایک ضخیم شعری مجموعہ نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ ایسا حسین و جمیل اور دیدہ زیب مجموعہ تھا کہ ننگے ہاتھوں اسے چھونے کی ہمت نہیں پڑتی تھی بلکہ جی چاہتا تھا کہ اس مجموعے کو رحل پر رکھ کر پڑھیں۔ ہمارے وہی مرحوم دوست کہا کرتے تھے کہ کتاب کے ظاہری حسن اور آب و تاب کو دیکھ کر ان کی ہمت نہیں پڑی کہ بنا وضو اس کتاب کو ہاتھ لگائیں۔ لہذا وضو کر کے ہی کتاب ہاتھ میں لی اور پھر کھولی۔ یہ

www.taemeernews.com

اور بات ہے کہ دو چار غزلوں کے بعد ہی ان کا وضو ٹوٹ گیا۔ کہتے تھے کہ توبہ شکن کتابیں تو بہت دیکھی ہیں لیکن وضو شکن کتاب پہلی بار دیکھی۔ بعد میں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس صنعت کار شاعر کا مذکورہ مجموعہ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگیا۔ اس کی بے پناہ مقبولیت کا ہم نے کسی سے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ اس کتاب کے زیادہ تر نسخے تو وہ لوگ لے گئے جو اردو پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے تھے کیوں کہ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ ایسی دیدہ زیب کتاب ان کی لائبریری میں ضرور موجود ہو۔ جس سے علم میں اضافہ ہو یا نہ ہو لائبریری کی زینت میں ضرور اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب تو اس مجموعے کے دو نسخے صرف اس بنا پر لے گئے کہ ان کی جلد کا رنگ ان کے دیوان خانے میں لٹکنے والے پردوں کے رنگ سے 'میچ' کرتا ہے۔۔

میں نہیں کہتا کہ نصرت ظہیر کی کتاب کو پڑھنے سے پہلے آپ کو وضو کرنا چاہئے لیکن جی تو ضرور یہی چاہتا ہے۔ یوں بھی ہمارے پاس ادبی کتابوں کی اشاعت کے لیے اس طرح کے اہتمام کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ میں سب سے پہلے نصرت ظہیر کے پبلیشر 'اسکائی گروپ' کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ایک ادبی کتاب کو آسمانی کتاب کی طرح چھاپا ہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کے معاملے میں وہ کتنا تجربہ رکھتے ہیں لیکن جس طرح انہوں نے یہ کتاب شائع کی ہے اس سے تو یہ لگتا ہے کہ Sky group کے سامنے Sky is the limit. والا معاملہ ہے۔ ایسے اشاعتی اداروں کو اردو والوں کی طرف سے بھر پور تعاون ملنا چاہئے۔ ہمارے ہاں عموماً تعاون کو تین خانوں میں بانٹا جاتا ہے۔ دامے، درمے، سخنے۔ اگر وہ چاہیں تو سخنے والا تعاون مجھ سے لے لیں اور اپنے دامے، درمے والے تعاون سے میری کتاب بھی چھاپ دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔۔

مجھے اس وقت ایک اور بات کی بھی خوشی ہو رہی ہے اور وہ یہ کہ میں نے ایک لمبے عرصے بعد اردو کی ایک ایسی کتاب دیکھی ہے جس کے اندرونی صفحہ پر یہ عبارت درج نہیں ہے' یہ کتاب فلاں ادارے کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔' یقین مانیے میں جس کتاب پر بھی یہ عبارت دیکھتا ہوں اسے حتی الامکان پڑھنے سے گریز کرتا ہوں۔ اردو معاشرے کو کرپٹ کرنے کے لیے آج ایسے کئی ادارے منظر عام پر آچکے ہیں جو اپنے 'جزوی' مالی تعاون کے ذریعہ اردو زبان اور اس کے ادب کو 'کلی' نقصان پہنچانے کے لیے ہر دم تیار رہتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ نصرت ظہیر نے یہ کتاب نہ صرف 'بقلم خود' لکھی ہے بلکہ اسے 'بزعم خود' چھپوایا بھی ہے۔ کسی کا جزوی مالی تعاون حاصل کر کے اپنی انا کا سودا نہیں کیا ہے۔ میں انہیں اس بات پر بھی مبارک باد دیتا ہوں۔۔

اب رہی بات نصرت ظہیر کی مزاح نگاری کی تو اس وقت مجھے مشتاق احمد یوسفی کی ایک بات یاد آ گئی۔ یوسفی نے اپنی پہلی کتاب 'چراغ تلے' کے دیباچہ میں لکھا ہے' اگر آپ اس کتاب کو پڑھ کر نہ مسکرائیں تو یہ فال نیک ہے کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بھی مزاح نگار ہیں۔' یوسفی کے اس بلیغ قول کی روشنی میں مجھے اصولاً اس کتاب کو پڑھتے ہوئے مسکرانا نہیں چاہئے تھا لیکن میری مجبوری ملاحظہ کیجئے کہ مجھے اس کتاب کو پڑھتے ہوئے بار بار مسکرانا پڑا۔۔

نصرت ظہیر کو میں اس لیے بھی پسند کرتا ہوں کہ مجھ میں اور نصرت ظہیر میں بعض مماثلتیں ہیں۔ ایک مماثلت تو یہ ہے کہ وہ بھی 'کالم نگاری' کے راستہ سے 'مزاح نگاری' کے میدان میں آئے ہیں۔ میں نے بھی کم و بیش سترہ برسوں تک حیدرآباد کے روزنامہ 'سیاست' میں کالم نگاری کی ہے۔ اس پورے عرصے میں ہفتے کے چھ دنوں میں میرا کالم نہایت پابندی سے چھپتا تھا۔ روزانہ کالم نگاری کتنا جان لیوا کام ہے اس کا مجھے اندازہ ہے۔ کیسی کیسی حالتوں میں بہر حال میں یہ کالم لکھ لیتا تھا۔ ایک بار تو یہ بھی ہوا کہ میری چھ سالہ بیٹی دنیا سے رخصت ہوگئی۔ قبرستان سے واپس ہوا تو قبر کی مٹی ہاتھوں سے جھاڑے بغیر ہی مزاحیہ کالم

www.taemeernews.com

لکھنے بیٹھ گیا۔ اس دن مجھے پہلی بار ادراک ہوا کہ سچے مزاح کی سرحد اپنے شخصی غموں کو پی لینے اور انہیں اپنے اندر انگیز کر لینے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد سے میں نے یہ معمول سا بنا لیا ہے کہ جب بھی سماج کے روبرو ہوتا ہوں تو اپنی خوش دلی اور خندہ پیشانی کو برقرار رکھتا ہوں اور زمانہ کو اپنے شخصی غموں کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ظرافت نگاری کے لیے آدمی کا ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یہ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ جس آدمی میں ظرف نہیں ہوتا وہ سچا ظریف ہو ہی نہیں سکتا۔۔

۱۹۸۸ء میں نصرت ظہیر کے کالم جب 'قومی آواز' میں چھپنے لگے تو کالم نگاری سے اپنی دیرینہ وابستگی کے باعث میں نے انہیں نہایت ذوق وشوق کے ساتھ پڑھا۔ اتنے ذوق وشوق کے ساتھ کہ ان کا کالم پہلے پڑھتا تھا اور موہن چراغی کا اداریہ بعد میں۔ نصرت ظہیر مزاح نگاری کی نزاکتوں اور باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ روزمرہ کے چھوٹے موٹے واقعات کے اطراف مزاح کا تانا بانا بُننا اور انہیں لطیف پیرایہ میں اس طرح بیان کرنا کہ قاری کو اس میں اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے، مزاح نگار اور کالم نگار کا بنیادی منصب ہوتا ہے۔ بظاہر روزمرہ کے واقعات اور موضوعات اتنے اہم نہیں ہوتے لیکن ایسے ہی واقعات کے تسلسل اور اجتماع سے تاریخ بنتی ہے۔ 'بقلم خود' ایک ایسا آئینہ ہے جس میں آپ کو عصر حاضر کی وہ شکل نظر آئے گی جس میں آپ ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔ روزمرہ کی ضرورتوں اور مسائل میں الجھے ہوئے حیران، پریشان، بے بس آدمی کی شکل آپ کو اس میں نظر آئے گی اور یوں لگے گا جیسے آپ خود اپنے آپ کو دیکھ رہے ہوں اور یہی نصرت ظہیر کی تحریر کا کمال ہے۔۔

آخر میں ایک اور بات عرض کرتا چلوں کہ طنزیہ کالم نگاری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کالم نگار کو زبان اور بیان پر پوری قدرت حاصل نہ ہو اور وہ ادب کی کلاسیکی قدروں سے واقف نہ ہو۔ نصرت ظہیر سیدھی سادی، شگفتہ، دل نشین اور رواں دواں زبان کے سہارے اپنے اچھوتے موضوعات کی آڑ میں بات میں سے بات پیدا کرنے اور ضرورت پیش آئے تو بات کا بتنگڑ بنانے تک کی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں اپنے نوجوان دوست نصرت ظہیر کو 'بقلم خود' کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔۔ (فروری ۱۹۹۷ء)

Mujtaba Hussain
H.No:11-5-152/3, Flat No. B-107
Royal orchid, Red Hills, Hyd.500001

پروفیسر ظہور محمد خاں

شعبہ سیاسیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اس کو محض اتفاق ہی کہیئے کہ نصرت ظہیر صاحب کے مسودہ کو پڑھنے سے پہلے جو کتاب طنز ومزاح پر نظر سے گزری وہ مشتاق یوسفی صاحب کی 'آب گم' تھی۔ اب جو دونوں کو ذہن میں گھماتا ہوں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون سی تحریر کس کی ہے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ نصرت ظہیر کی یہ کتاب ضرور مقبول ہوگی اور اردو ادب کی معیاری کتب میں اپنا مقام بنائے گی۔ اچھی کتاب ہونے کی جملہ خصوصیات اس کتاب میں ہیں۔ اچھی سمجھ میں آنے والی کلاسک اردو، موجودہ دور کے کردار و مسائل، چست جملے اور مضمون میں ربط اور دلچسپ تواتر، دل کو چھو لیتے ہیں۔

میرے نزدیک بات یہاں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین اردو ادب کے مزاح کی غمازی کرتے ہیں۔ اچھے شعر پر زبان سے داد و تحسین میں واہ نکلتی ہے لیکن ان مضامین پر ہنسنے میں بھی آنسو نکل پڑتے ہیں اور تاثر 'واہ' کی جگہ 'آہ' کا ہو جاتا ہے۔ مزاح نگاری اگر سلیقہ سے کی جائے تو ادب کی جگہ سوشیولوجی کے درجہ میں چلی جاتی ہے۔ سماج کی حسی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکتی ہے اور تعمیر کا پہلو اس میں نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے نہ جانے کیوں اس کتاب سے اچھے نتائج کی قوی توقع ہے۔ مقصد میں کامیاب ہو اور نصرت ظہیر اس میدان میں نمایاں حیثیت حاصل کریں۔ آمین۔۔

www.taemeernews.com

اسیم کاویانی

نصرت ظہیر کی ظرافت نگاری

(1)

زندگی ایک طربیۂ خداوندی ہے اور جب تک ہم اس حقیقت تک نہیں پہنچیں گے داخلی افسردگی اور تقشف کا شکار رہیں گے۔ عام مشاہدہ ہے کہ مرتاضیت انسان کو انسان سے کچھ کم تر بنا دیتی ہے، جب کہ خوش مزاجی کچھ برتر۔ جو شخص اپنے اصول و نظریات میں راسخ الیقین اور شدت پسند ہو، دوسروں کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے، اس لیے کہ بے لچک اور بے مروت ہونا، مزاح سے خالی ہونے کے مترادف ہے اور یہ انسانیت کی بنیادی شرطوں سے منہ موڑنا ہے۔ مزاح ناموزونیت اور ناہمواریوں کے ردِّعمل میں ضرور جنم لیتا ہے، پر اس میں امن کا اشارہ پنہاں ہوتا ہے اور قربت کی نوید بھی، جیسا کہ لوئس کرونبرگر (Louis Kronenberger) نے لکھا ہے:

''مزاح بہ یک وقت چوٹ بھی پہنچاتا ہے اور مرہم بھی۔ ماخوذ (کسی تصور میں) بھی کرتا ہے، معاف بھی، اس طرح ہمیں پست بھی کرتا ہے بلند بھی اور یوں وہ ہمارے داخلی ارتقا کو (مزاح کی پیدا کردہ) بیرونی قیمت پر متعین کرتا ہے۔ سلیقہ مندی سے مزاح کو برتنے والا عموماً بہتر نتیجہ حاصل کرلیتا ہے۔'' مزاح کو ایک انسان کے میلان اور نکتہ رسی کا آمیزہ بھی کہا گیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ جو کوئی ہنسنا بھول جاتا ہے، اپنی صلاحیتِ فکر بھی کھو دیتا ہے۔

مزاح کا قوی احساس ہمیں اپنی زندگی کی ناہمواریوں کو جھٹک دینے، نامانوسیتوں کو انگیز کرنے، ناخوش گواریوں کا متحمل ہونے، غیر متوقعات کو زیر کرنے اور ناقابلِ برداشت پر غالب آنے میں مدد دیتا ہے۔ گویا ایک طرح سے مزاح انسانی برتری کا ثبوت ہے کہ چاہے جو بھی بلائیں نازل ہوں، انسان اُن پر فائق ہے۔ جیسا کہ سارا ڈیوڈسن (Sara Davidson) نے بھی کہا ہے کہ 'مزاح جو ہمیں زندگی پر ہنسنے کا حوصلہ دیتا ہے، ہماری زندگی کے لوازمات میں محبت اور رفاقت کے پہلو بہ پہلو ایک اونچے درجے پر فائز ہے۔ یہ ہمارے درد کا درماں تک ثابت ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ مزاح ہماری تشویشات اور ناہمواریوں کے احساس کو ایسے مبالغے کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ اُن کے اور ہمارے بیچ فاصلہ حائل ہوجاتا ہے اور اس میں ہنسی ساجاتی ہے، جو راحت رساں ثابت ہوتی ہے۔' ایک اور مغربی مفکر کا کہنا ہے کہ 'اُن لوگوں میں، جن کا میں مداح ہوں، اور جن کی عزت کرتا ہوں، مجھے کوئی قدرِ مشترک نظر نہیں آتی، البتہ جن لوگوں سے میں محبت کرتا ہوں، اُن سب کے ساتھ ہنس سکتا ہوں۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ ہنسی فاصلے کم کرتی ہے اور اعتماد بخشتی ہے جب کہ اس کا عدم، تناؤ یا تنازعے کو جنم دیتا ہے۔

ایک مفکر نے ہنسی کو داخلی جوگنگ کی ایک صورت کہا ہے، جو ہمارے اندرونی اعضا کو متحرک کرتی ہے، جس سے ہماری سانس کی آمد و رفت تیز تر ہوتی ہے اور اس سے حاصل تپش و توانائی ہماری توقعات اور تمناؤں کے شعلے کو بھڑکاتی ہے۔

اگر یہ دنیا واقعی ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اداکار، تو یہ بات مان لینی چاہیے کہ ہم میں سے بہت لوگ اڈھنگے پن سے اور بغیر ریہرسل کے چلے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں ہنسنے ہنسانے کے مواقع کی کبھی کمی نہیں رہی، اور غالباً انسان بھی اسی

www.taemeernews.com

لیے انسان سے کہ وہ ہنس سکتا ہے۔ بقول کلیم الدین احمد: 'اگر وہ اسباب نیست و نابود ہو جائیں جن کی وجہ سے ہم ہنستے ہیں، تو پھر انسان ممکن ہے کہ فرشتہ بن جائے لیکن وہ انسان باقی نہ رہے گا۔ غالباً فرشتے ہنستے نہیں ہیں اور نہ ہنسی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جہاں ہر شے مکمل، موزوں اور متناسب ہو جائے وہاں ہنسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہنسی تو عدم تکمیل، بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہوتی ہے۔'

انسان کو ازل سے ابد تک ایک خوب سے خوب تر جہاں کی جستجو میں سرگرم سفر رہنا ہے۔ اس سفر میں ظرافت کا جذبہ اُس کے شوق سفر کو مہمیز کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی کار جہاں کی کلفتوں کا مداوا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے ظرافت بھی انسان کی طرح ایک ازلی سفر پر گام زن ہے۔

درج بالا معروضات کی روشنی میں ظرافت کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں طنز و مزاح کی اصناف کو قبول عام حاصل رہا ہے۔ اردو زبان کا دامن بھی اس سے کبھی خالی نہیں رہا۔ اس صحبت میں دورِ حاضر کے طنز و مزاح کے چند معتبر ناموں میں سے ایک نصرت ظہیر کے فکر و فن کا سرسری جائزہ پیش کرنا میرا مقصود ہے۔

نصرت ظہیر سکندر آباد کے ایک متوسط طبقے کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُس دور کے اردو خاندانوں کی روایت و روش کہیے یا ماحول کا اثر کہ طالب علمی ہی کے زمانے میں اُن کے سر میں سخن وری کا سودا سمایا اور وہ شاعر بن گئے۔ چوں کہ وہ اپنے دلِ شیدا کے ساتھ ایک حقیقت آشنا نظر اور زندگی کی نامعقولیتوں سے مقابلے کا عزم بھی رکھتے تھے، اس لیے اُنھوں نے زلفِ جاناں سے لے کر زنجیر و سلاسل تک کی گرفتاری کا ایک طویل فاصلہ طے کیا۔ نوجوانی میں کبھی سی پی آئی سے وابستہ رہے، کبھی سی پی آئی (ایم ایل) سے۔ کوچۂ عشق کی اسیری و ابتلا کی تفصیل کا تو مجھے پتا نہیں، البتہ سیاستِ زمانہ کے ہاتھوں تین بار داخلِ زنداں ضرور کیے گئے۔ پہلی بار 1971 میں، دوسری بار ایمرجنسی کا شکار ہو کر اور تیسری بار 1979 میں (ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے خلاف مظاہرے کے سلسلے میں جنتا پارٹی حکومت کی حلیف جماعت اسلامی کی طرف سے) دائر کیے گئے ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسائے گئے اور باعزت بری ہو کر نکلے۔

اُن کی صحافتی زندگی کا سفر چار دہائیوں پر [1972 میں بطور مُدیر 'فیصلہ' ویکلی (سہارن پور) سے لے کر تا حال 'راشٹریہ سہارا' کے کالمسٹ اور 'اردو دربن' 'اردو دنیا' 'فکر و تحقیق' و 'ادب ساز' کی اڈیٹری تک] پھیلا ہوا ہے۔ 1981 میں دہلی میں آ بسنے کے بعد اُن کی سرگرم صحافت کا سلسلہ روزنامہ 'ملاپ' میں فکر تونسوی کی رفاقت اور رنبیر جی (مدیر ملاپ) کی نگرانی میں شروع ہوا۔ پھر وقفے وقفے سے مختلف اخباروں میں اُن کے کالم چھپنے لگے۔ 'تیج' میں 'بات سے بات چلے' اور 'باقی سب خیریت ہے' 'قومی آواز' (دہلی) میں 'دہلی ڈائری' اور 'تحت اللفظ'، 'اخبار مشرق' میں 'وغیرہ وغیرہ'، 'قومی آواز' کے ویکلی ضمیمے میں 'بقلم خود'، اور 'راشٹریہ سہارا' میں ہفتہ وار کالم 'گول مول' اور 'نمی دانم' تک کی برسہا برس کی مشق و مزاولت میں پتا نہیں قطرے پر کیا کیا گزری مگر بالآخر اُس میں گُہر کی سی آبداری آ گئی۔ ہاں اس دوران میں اُنھوں نے ایک ٹی وی سیریل بھی لکھ کر پیش کیا اور ادبی رسائل میں الگ نو بہ نو نکاہیہ مضامین قارئین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرتے رہے۔

اخباری کالم نویسوں کے ساتھ ایک بڑی مجبوری یہ لگی ہوتی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے اپنا مواد لینے پر مجبور ہوتے ہیں تا کہ اخبار کا قاری اُس کی اپنے زمانے اور ماحول سے بے گانگی نہ محسوس کرے، جب کہ ہنگامی موضوعات بہت جلد اپنی کشش اور معنویت کھو دیتے ہیں اور اُن کی عمر مختصر ثابت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں بھی کچھ ادب آشنا صحافی اپنی ذہانت اور قوتِ آخذہ سے کام لے کر اپنے زمانے کے میلانات و رجحانات کے مستقل عناصر کی شناخت کر لیتے ہیں اور اُنھیں اپنی تحریر میں اس خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ وہ مدت دراز تک اپنی معنویت و تازگی قائم رکھ سکے۔ غالباً یہی بات ایزرا پاونڈ (Ezra

www.taemeernews.com

Pound) کے شعور میں رہی ہوگی جب اُس نے 'ادب' کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ "Literature is news that stays news." (ادب وہ خبر ہے، جو بطور خبر باقی رہتا ہے)

ہماری زبان میں فکاہیہ کالم لکھنے والوں کی کمی نہیں رہی، لیکن شہرت ومقبولیت کے دربار تک بہت کم کی رسائی ہوسکی۔ اس باب میں ہند میں مجتبیٰ حسین کے بعد کمیت وکیفیت ہر دو اعتبار سے جو دوسرا بڑا نام سامنے آتا ہے، وہ نصرت ظہیر کا ہے۔ جن کے منتخب فکاہیہ مضامین کے چار مجموعے (تحت اللفظ، بقلم خود، خرانٹوں کا مشاعرہ اور نمی دانم) شائع ہوچکے ہیں اور پانچواں 'اسٹنگ آپریشن' زیرِ طباعت ہونے کی اطلاع ہے۔

مجتبیٰ حسین کی ظرافت بداماں نصف صدی کا حال ہی میں جشنِ طلائی منایا گیا ہے، اگرچہ پچھلی ایک، ڈیڑھ دہائی سے ان کے قلم پر ماندگی کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ پھر بھی آزادی کے بعد پاکستان میں مشتاق احمد یوسفی جیسے عبقری اور ابن انشا، مشفق خواجہ، کرنل محمد خاں اور عطا الحق قاسمی جیسے ظرافت نگاروں کے سامنے ہند میں مجتبیٰ ہی کے شگفتہ رقم قلم نے ہمارے مزاحیہ ادب کی لاج قائم رکھی ہے۔ اُن کے ہم عصروں میں فکر تونسوی اور یوسف ناظم کا حال یہ رہا کہ ؎

کھوگیا کثرتِ گویائی کے ہنگامے میں
مری گفتار میں جو اک حرف تھا دانائی کا

یعنی اُنھوں نے بہت زیادہ لکھا، جس میں سے بہت کم یاد رکھا گیا۔ احمد جمال پاشا بہت قلیل سرمایہ نکلے۔ کرشن چندر کی بنیادی شناخت افسانہ نگار کی رہی۔ رشید احمد صدیقی، شفیق الرحمان اور کنہیالال کپور جیسے بلند قامت اپنا بہترین سرمایۂ ظرافت آزادی سے قبل پیش کرچکے تھے۔ آزادی کے بعد رشید احمد صدیقی اور شفیق الرحمان کا لکھنا جاری رہا تھا، لیکن اُن کا فکری سانچا نئے موضوعات کو نہ اپنا سکا اور وہ ماضی سے جُڑے رہے، نہ ہی کنہیالال کپور اپنے سابقہ ادبی سرمایے میں کوئی قابلِ قدر اضافہ کرسکے تھے۔ ظرافت کے ان اربابِ ثلاثہ کی صحت مند روایات کو بدلتی ہوئی اقدار سے آمیز کرکے مجتبیٰ حسین نے ایک طویل فاصلہ طے کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ برگد کے سائے تلے کوئی دوسرا پودا نہیں پنپتا۔ لیکن خیر گزری کہ مجتبیٰ کے بعد کی نسل میں دلیپ سنگھ، نصرت ظہیر، فیاض احمد فیضی، نریندر لوتھر، شفیقہ فرحت، اسد رضا اور پرویز یداللہ مہدی نے چمنستانِ ظرافت کو بہار ساماں بنائے رکھا ہے۔

(2)

ہاں تو ذکر ہورہا تھا نصرت ظہیر کا!

نصرت کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے پہلا دھیان اس طرف جاتا ہے کہ نصرت کی زبان بڑی حد تک فطری، رواں دواں اور روزمرہ کی حامل ہے۔ اُن کی تحریر میں نہ تو وہ کم بیانی ہے جو بات کو تشنۂ مفہوم رکھے نہ وہ طولِ کلام ہے کہ کوئی کہے کہ ؎ ہر بات یہاں بات بڑھانے کے لیے ہے! بیانِ واقعہ میں کہیں ایسی پیچیدگی بھی نہیں ملتی جو کہ گرہ نیم باز ہی قاری کے ناخنِ تدبیر کی محتاج ہو۔ کالم نویسی کا حاصل ہونے کی بنا پر اُن کے بیشتر مضامین مختصر ہیں، شاید اس لیے بھی وہ اُن میں شروع سے آخر تک ایک خوش گوار فضا قائم رکھنے میں عموماً کامیاب رہے ہیں۔ اختصار کے باوجود اُن کے یہاں بات میں بات پیدا کرنے کا ہنر ہے اور موضوعات میں غضب کا تنوع ہے، اتنا کہ شاید اُن کے ساتھ آغازِ تحریر کرنے والے کسی دوسرے ظرافت نگار کے یہاں نہ ملے۔ اُنھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اُٹھایا ہے، بیان کی شائستگی کو بڑے قرینے سے نبھایا ہے۔ یہ وہ ہنر ہے جسے بھول کر کتنے ہی لکھنے والوں کا مزاح، پھکڑپن میں بدل جاتا ہے۔ نصرت کا بیشتر مزاح وہی حقیقی مزاح ہے، جس کی تعریف میں کارلائل نے کہا ہے کہ 'وہ دماغ سے زیادہ دل سے اُپجتا ہے، وہ کسی کی تحقیر نہیں کرتا بلکہ اس کا جوہر محبت ہے۔ وہ بے اختیار ہنسی سے زیادہ ہونٹوں پر تھمی مُسکراہٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ مسکراہٹ، جس کی بنیاد کہیں زیادہ گہری ہوتی ہے۔'

www.taemeernews.com

اگر یہ صحیح ہے کہ کسی ادیب کا اسلوب اُس کے بیانیہ سے زیادہ اُس کی شخصیت کا اور اُس کی شخصیت سے زیادہ اُس کی تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے تو نصرت کے مضامین میں ہم اپنے سارے تضادات اور خوب وزشت کے باوجود ایک بڑی رچی بسی، زندہ، توانا اور بوقلموں تہذیب کا نگار خانہ دیکھ سکتے ہیں۔

'حافظہ خراب ہے'، 'اُف یہ دردِ ملّت کا'، 'نیند ہماری خواب ہمارے'، 'گل محمد چشمے والے' اور 'الوداع اے ماہِ رمضان' جیسے اُن کے کئی مضامین میں اس کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک مصنف کی جدتِ طبع کا سوال ہے تو اس کے رنگا رنگ مظاہر نظر آتے ہیں۔ کہیں وہ 'اپنا اسٹنگ آپریشن' کرانا چاہتا ہے، کہیں 'مہنگائی کی ایف آئی آر' لکھاتا۔ کہیں اس کا تخلیق کردہ 'کافی ہاؤس کا عام آدمی' دانش وروں کی سٹی گم کر دیتا ہے۔ کہیں مصنف گائے اور بھینس میں مکالمہ کراتا ہے تو کہیں ('ایک صبح کا ذکر ہے' میں) اعضائے انسانی کے مابین مناظرہ اور کبھی 'ویرپن کا صوتی روزنامچہ' رقم کرنے لگتا ہے۔

شائستہ بیانی کے ساتھ شائستہ خیالی بھی نصرت کے مضامین کا ایک اہم وصف ہے۔ یہاں میں اُن کے صرف ایک مضمون 'طلسمی انگوٹھی' کا ذکر کروں گا۔ جس میں مصنف نے اپنی کچھ پریشانیوں کو حل کرنے کے لیے ایک طلسمی انگوٹھی خریدنے کا تجربہ بیان کیا ہے۔ اس لاجواب مضمون میں مصنف نے نہ تو کہیں کوئی سخت جملہ لکھا ہے، نہ ہی کسی وہم کو توڑنے کی کوئی دانستہ کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود وہ بڑی ہنرمندی سے اپنا یہ پیغام پہنچانے میں اس حد تک موثر اور کامیاب نظر آتا ہے کہ یہ ایک مضمون وہم پرستی کے خلاف لکھے دسیوں مضامین پر بھاری ہے۔

اُن کے بیشتر مضامین شائستگی و شگفتگی سے بھرپور ہیں اور یہ غیر ممکن ہے کہ دورانِ مطالعہ قاری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ کھیلنے لگے۔ 'ایک گھریلو چینل ڈسکشن' سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ ڈسکشن اس بات پر ہو رہا ہے کہ شام کو کھانے پر کیا پکایا جائے۔ بیوی ٹنڈے کے حق میں گویا ہیں اور بتا رہی ہیں ٹنڈے کیوں کھانے چاہئیں:

○ ''بیوی:... اس لیے کہ ٹنڈے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ ان سے مزاج میں ٹھنڈک آتی ہے اور ٹھنڈے مزاج سے گرمیوں میں بڑی راحت ملتی ہے...

ہم: معاف کیجیے میں آپ کو بیچ میں ٹوک رہا ہوں۔ آپ کا یہ بیان کہ ٹنڈے ٹھنڈے ہوتے ہیں، غلط معلوم ہوتا ہے۔ میرا تجربہ تو ہے کہ اکثر مجھے گرم ٹنڈے کھانے کو ملے ہیں۔

بیوی: وہ گرم اس لیے تھے کہ انھیں اسٹوو پر گرم کر دیا گیا تھا۔ ترکاری کا یہی اُصول ہے۔ گرم ترکاری گرم ہوتی ہے اور ٹھنڈی ترکاری ٹھنڈی۔ میں دراصل ٹنڈے کے مزاج کی بات کر رہی ہوں۔

ہم: کیا ٹنڈے کا بھی مزاج ہوتا ہے؟

بیوی: کیوں نہیں، ہر سبزی کا مزاج ہوتا ہے، بلکہ الگ الگ سبزیوں کا الگ الگ مزاج ہوتا ہے!

ہم: اچھا تو کیا ہم ٹنڈے سے پوچھ سکتے ہیں کہ کیوں میاں ٹنڈے کیسے ہو؟ یا کہیے مس گاجر کیا حال چال ہیں یا پھر... قبلہ کدو صاحب کیسی طبیعت ہے!

'ہوئے جی کے ہم جو رسوا' اُس دور کا مضمون ہے، جب اُن کے نام کی تائے تانیث سے خوش گمان ہو کر اُن کے کرم فرماؤں نے انھیں عشق نامے لکھنے شروع کر دیے تھے، حتیٰ کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اُن کے مجموعۂ مضامین کو انعام کے لیے منتخب کرتے ہوئے توصیفی سند میں بھی 'محترمہ نصرت' کو سرفراز کیے جانے کی اطلاع دی تھی۔ بڑی مشکل سے مصنف نے اپنی جنس کی غلط فہمی کو دُور کیا تھا اور اپنی تصویر تک چھپوا دی تھی۔ (راقم نے بھی اُس زمانے میں انھیں ایک خط میں لکھا تھا کہ 'خوش/غلط فہمی دُور ہونے سے قبل آپ کے مضامین میں کچھ زیادہ شگفتگی پائی جاتی تھی۔ ایسم) اس کے بعد اُنھوں نے اُمید باندھی تھی کہ ''شاید اب ہمیں دوسری قسم کے یعنی دوسری صنف کے محبت نامے موصول ہونے لگیں!''

○ ''... جب بھی ڈاکیا ڈاک لاتا تو ہر لفافے کو اس اُمید

www.taemeernews.com

میں سونگھتے کہ شاید اس سے عطر شمامہ کی خوشبو آرہی ہو، لیکن کسی سے بجلی کا بل نکلتا تو کسی سے واٹر سپلائی کاٹ دینے کا نوٹس۔''

ہمارے لکھنے والوں نے اپنے بیانیے میں عموماً روایت کا راوی بنا پسند کیا ہے۔ اُن کے یہاں حاضر کا ناظر بننا اور واقعات کے بیان میں مکالمے کے فن کا برتنا کم ہی نظر آتا ہے۔ نصرت نے اپنے موضوعات کو عام طور پر آس پاس کی زندگی سے لیا ہے اور اپنے کئی مضامین کی تمام تر تشکیل پُر لطف مکالموں سے کی ہے، دوسرے مضامین میں بھی جہاں موقع ملا ہے، مکالمت کو اس حسن وخوبی سے برتا ہے کہ اس کی مثال اوروں کے یہاں کم ہی ملے گی۔ 'ایک گھریلو چینل ڈسکشن'، 'مکالمات گائے و بھینس'، 'کہت کبیر سُنو بھئی سادھو'، 'کافی ہاؤس میں عام آدمی'، 'ذکر اک قیامت کا'، 'ایک صبح کا ذکر ہے' اور 'لنگڑی ترازو' ان کے ایسے ہی چند مضامین ہیں۔ 'مکالمات گائے و بھینس' سے ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

○ ''کیا مطلب؟'' گائے حیران ہوگئی۔ ''کیا تم جنت میں نہیں جانا چاہوگی؟''

''بلکل نہیں، اور اس جنت میں تو ہرگز نہیں جس میں مسلمان بھی ہوں، کیوں کہ یہ تو وہاں بھی ہمیں کاٹ پیٹ کر کوفتے اور کباب بنوالیں گے۔ یہ تو وہی ہوا کہ بقول شاعر... ترے مجبور بندوں کی نہ یہ دنیا، نہ وہ دنیا!''

''اچھا تو کیا اتنی چٹوری ہے یہ قوم؟'' گائے نے پوچھا۔

''ارے کیا پوچھتی ہو'' بھینس بولی: ''کلیجی، کباب، کوفتہ، قیمہ، مغز، نہاری، پائے ان سب پر تو جان دیتی ہے یہ قوم اور وہ بھی بڑے گوشت کے کباب قیمے پر۔ اس کے بغیر تو کہتی ہے کہ ایمان بھی ادھورا ہے۔ بس، ان کے جان لیوا ایمان نے میری جان کھا رکھی ہے۔ جانتی ہو، ایک دن قوم کے ایک فلسفی دانش ور کی نظر مجھ پر پڑگئی۔ کم بخت ایک گھنٹے تک گھور گھور کر کچھ سوچتا رہا اور پھر میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بولا.. آہ اے معصوم جانور! کاش تجھے معلوم ہوتا کہ تو کس قدر لذیذ ہے۔ تیرے جسم میں کیسے کیسے حلیم، قورمے، پلاؤ اور تنجن پوشیدہ ہیں۔ کاش تو اپنے ذائقے سے آشنا ہوتی۔ مگر افسوس بیورو کریٹیک بین ہونے کی وجہ سے بقول شاعر تیرا بھی وہی حال ہے کہ ع اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔''

صرف مسکراہٹوں پر قناعت نہ کرنے والوں کے لیے نصرت کے ظرافت خانے میں کھلکھلانے پر مجبور کر دینے والے مضامین بھی موجود ہیں۔ 'چاند کے پار چلو'، 'پچیس گز کا مکان'، 'کباڑی بازار کی سیر'، 'میں اور میں' اور 'مسلمان اور پیاز' ایسے ہی چند مضامین ہیں۔

ان میں نصرت کی ندرتِ فکر نے کہیں چاند میں کھوکھا ڈالنے، کہیں پراپرٹی ڈیلروں کے ہاتھوں مہنگی اور پانی جانے والی جمنا کی زمین فی مربع میٹر کی بجائے فی مربع لیٹر بیچے جانے، کہیں مسلمان اور پیاز میں مشابہتیں قائم کرنے اور کہیں کباڑی بازار کی اشیاء 'کباڑ' تک میں ملاوٹ کی تفصیل کا حال ایسی خندہ سامانی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ قاری کو مائل بہ خندہ کرتے ہوئے اکثر خندۂ دنداں نما پر مجبور کر دیتا ہے۔

میاں اسلام باربر کے تذکرے میں انھوں نے بتایا ہے کہ وہ اکثر اپنے گاہکوں کے ہیئر اسٹائل بدل دیا کرتے تھے اور instantly ایسا نیا ہیئر اسٹائل نمودار کر دیتے تھے کہ....

○ ''اکثر یہ ہیئر اسٹائل اتنا عجیب وغریب ہوتا تھا کہ گاہک اپنی صورت نہ پہچان پاتا، سر اُٹھا کر آئینے میں دیکھتا تو وہاں کسی اور کو جلوہ گر پاتا۔ کوئی کوئی گاہک اس صورت میں بے ساختہ مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیتا اور کہتا: ''خادم کو خلیل خاں کہتے ہیں، آپ کی تعریف؟'' پھر جب دونوں ہاتھ ٹکراتے، تب کہیں جاکر گاہک کو یاد آتا کہ 'اوہو، یہ تو آئینہ ہے!' اس کے بعد گاہک خوشی خوشی خود کو کوئی اور سمجھ کر میاں اسلام کے ہیئر کٹنگ سیلون سے روانہ ہو جاتا۔''

('میاں اسلام کی گھڑی'، مشمولہ: خراٹوں کا مشاعرہ)

کہیں کہیں تو واقعے رواردات کی مضحک صورت گری میں

www.taemeernews.com

اُنھوں نے Laughing glass کا سا سماں پیدا کردیا ہے، وہ بھی انتہائی بے ساختگی کے ساتھ:

○ ''ہم نے مکان کی تعمیر میں تاخیر کی شکایت کی تو بگڑ کر کہا ''نقشے کے مطابق مکان بنوانا ہے تو اسی طرح بنے گا۔ جلد بازی میں کوئی چیز ٹیڑھی بن گئی تو کون ذمے دار ہوگا؟'' ہم نے باہر کی ایک دیوار کے بارے میں کہا کہ وہ تو پہلے ہی ٹیڑھی بنی ہوئی ہے۔ اس پر مستری نے کمال خود اعتمادی سے کہا 'جناب دیوار ٹیڑھی نہیں ہے، آپ خود ٹیڑھے کھڑے ہیں اور گردن ٹیڑھی کرکے ٹیڑھا دیکھ رہے ہیں۔' اس کے بعد موصوف نے ایک طرف سے ہماری گردن اپنی دانست میں سیدھی کرکے دیکھنے کو کہا تو ہم سچ مچ گھبرا گئے، کیوں کہ اس پُردرد اور گردن شکن زاویے سے دیکھ کر یوں لگا جیسے دیوار ار ارا کر ہمارے اوپر گرنے والی ہے...''

('پچیس گز کا مکان' مشمولہ: نمی دانم)

اس سے بھی زیادہ قہقہہ بردوش ماجرا اُس وقت کا ہے جب مصنف کا واسطہ مکان کا نقشہ بنوانے کے لیے نقشہ نویس سے پڑتا ہے، لیکن میں کہاں تک اقتباسات دوں۔ دقت اس بات کی نہیں ہے کہ کیا انتخاب کروں بلکہ یہ ہے کہ کون سا حصہ منتخب نہ کروں!

کہتے ہیں کہ دوسروں کو پیار کرنے سے پہلے خود سے پیار کرنا ضروری ہے۔ خود سے اپنی وابستگی اور اس وابستگی کی طمانیت کے حاصل ہونے کے بعد ہی کوئی اپنا وجود با مقصد بنا سکتا ہے اور مسرت بخش بھی۔ نصرت کسی بھی موضوع پر مضمون لکھیں اکثر اُن کا کردار شریک ملے گا، کہیں کہیں تو شریک غالب بھی، بلکہ چند مضامین میں تو اُنھوں نے بڑے اپنے وجود کو مشاقیِ قلم کا نشانہ بنایا ہے، مثلاً: ''میں اور میں''، 'اپنا اسٹنگ آپریشن' اور ''مرحوم کی یاد میں'' وغیرہ۔ ڈرک وال کوٹ (Derek wall cott) نے اپنی نظم "Love after Love" میں کہا ہے:

The time will come,

------------ایک وقت آئے گا،

when with elation,

------------جب مسرت وشادمانی کے ساتھ،

you will greet youself arriving.-----

تم خود اپنی آمد کا خیر مقدم کروگے،

at your own door, in your own

mirror.---------- اپنی ہی دہلیز پر، اپنے ہی آئینے میں،

and each will smile at the other's

welcome. ------------- اور ہر ایک دوسرے کا

استقبال کرتے ہوئے مسکرائے گا۔

یہ ہمارے دور کی بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم میں سے بہت سے دوسروں سے ملنے میں اتنے منہمک رہتے ہیں کہ مدتوں تک اپنے آپ سے نہیں مل پاتے! نصرت نے خود کو نہیں کھویا اور ان کی تحریریں اُن کے من کا درپن بنی ہوئی ہیں۔ ان کے مضامین کی وارداتیں اور کیفیتیں اتنی مانوس، جانی پہچانی اور ہمارے ذہن و دل سے اتنی قریب ہیں کہ آپ بیتی میں جگ بیتی اور جگ بیتی میں آپ بیتی کا گمان گزرتا ہے۔ اُن کی تحریر کا نمایاں وصف وہ خلوص ہے جو ہر جگہ نسلِ انسانی سے ایک مشترکہ درد کے رشتے سے استوار ملتا ہے اور وہ بے ساختہ پن ہے جو کہیں بھی تکلف و تصنع کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتا۔ ذیل کی چند مثالوں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

○ ''بات ان دنوں کی ہے جب ہم شہر سہارن پور میں نخاس بازار کے محلہ خانی باغ میں محمد علی جوہر لائبریری کے پیچھے رہا کرتے تھے، اور یہ خاکسار روزانہ صبح صبح ایک ہاتھ سے بستہ اور دوسرے ہاتھ سے پائجامہ سنبھالے حصول علم کے لیے ٹاٹ پٹی والے پرائمری اسکول جایا کرتا تھا۔''

('گل محمد چشمے والے' مشمولہ: خراٹوں کا مشاعرہ)

○ ''دوپہر بعد تو پوری گلی میں خبر پھیل گئی... بابو عزیز کے لڑکے نے پہلا روزہ رکھ لیا ہے... ارے اتنی گرمی اور اتنا دبلا پتلا سوکھا سا تو ہے... دلہن اسے گھر کے اندر ہی رکھو۔ باہر مت نکلنے

www.taemeernews.com

دینا... بھوک کا درد.... دنیا کا سب سے بڑا درد... یوں کہیے کہ تمام دردوں کا مغلِ اعظم... بی بی میں تو کہتی ہوں، بچے کو درود شریف پڑھ کے شربت پلوادو... بے چارہ ننھی سی جان۔ اب تک تو اس کا روزہ قبول بھی ہو چکا ہوگا۔

ننھی سی جان کو جان میں جان آتی سی محسوس ہوئی... آنکھوں میں بند آسمان سے شربت روح افزا کی بارش ہونے لگی... اُس شام کب گولا چھوٹا، کیسے روزہ کشائی ہوئی۔ منہ اور معدے میں ذائقوں کی کیسی آتش بازیاں چھوٹیں۔ کچھ یاد نہیں... بس وہ لگی اور اُس کا دسترخوان حافظے میں روشن ہے۔

روزہ دار بچہ آج دہلی شہر کے ایک عالی شان علاقے میں دوسری منزل کے فلیٹ نمبر 37 میں رہتا ہے، جہاں اسے یہ نہیں معلوم کہ 36 نمبر میں کون مقیم ہے اور 38 نمبر میں کس کی رہائش ہے! ہر دروازے سے روزانہ کچھ چہرے باہر نکلتے ہیں، پھر پتا نہیں کب ان ہی دروازوں کے پیچھے جا کر گم ہو جاتے ہیں۔"

(''الوداع اے ماہِ رمضان'')

○ جب مصنف کی تنخواہ کی خاصی رقم کرایہ مکان کی نذر ہونے لگی تو''...بیوی نے اطلاع دی کہ آئندہ مہینے سے چھوٹی بچی کا دودھ بند کرنا پڑے گا اور خود سبزی گوشت خریدنے کے لیے دو کلو میٹر دور رکشا سے جانے کی بجائے وہ اب پیدل آیا جایا کریں گی، تو ہمیں اُن دونوں کے ساتھ دودھ والے اور رکشا والے کی فکر بھی لاحق ہوگئی کہ ہماری وجہ سے کہیں اُن کے چولھوں کی آنچ بھی نہ کم ہو جائے۔ اُس روز پہلی بار ہمیں احساس ہوا کہ چولھوں میں بھی ایک طرح کی رشتے داری ہوتی ہے۔"

(''پچیس گز کا مکان'، مشمولہ 'نمی دانم')

مصنف کو گمان گزرا کہ عینک لگانے والا ہر شخص پڑھا لکھا، ذہین اور انٹیلکچوئل معلوم ہوتا ہے اور بقول اُن کے 'غالباً شعوری طور پر میں بھی یہی چاہتا تھا کہ کوئی خاص محنت کیے بغیر یہ سب بن جاؤں، یعنی پڑھا لکھا، ذہین اور انٹیلکچوئل!' لیکن جب گل محمد چشمے والے چچا نے یہ کہہ کر اُن کی امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ اُن کی نظر برابر ہے اور بلا وجہ عینک نہیں بنائی جا سکتی تو...

○ ''...لیکن بندہ بھی دُھن کا پکا تھا، اسی روز سے نظر خراب کرنے کی کوشش شروع کردی۔ رات میں ہی نہیں دن میں بھی آسمان کے تارے گننے لگا۔ چھت پر بیٹھ کر چاند کی روشنی میں ابن صفی کے ناول پڑھ ڈالے۔ یہاں تک کہ گرلز کالج کے گیٹ کے چکر بھی بڑھا دیے۔ یہ کوششیں رنگ لائیں اور ایک روز صبح جو میں سو کر اُٹھا تو نگاہ اتنی دھندلائی ہوئی تھی کہ بڑی دیر تک انگریزی کے اخبار کو دائیں سے بائیں اور اردو کے اخبار کو بائیں سے دائیں پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔"

(''گل محمد چشمے والے'، مشمولہ 'خراٹوں کا مشاعرہ')

ادب میں تصنیف کرنا مشکل کام نہیں ہے، بلکہ مشکل کام یہ ہے کہ آپ وہ لکھیں جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔ ہماری زبان میں دورِ حاضر کے اکثر مزاح نگاروں کی نگارشات تصنع یا آورد، اور آرائش یا مبالغے کی بہتات کے باعث سعی لاحاصل کا نتیجہ پیش کرتی ہیں۔ نصرت نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی تحریروں کو ان خامیوں سے بچائے رکھا ہے۔ اسے نصرت کی مسلسل کالم نگاری کی زحمت کا نتیجہ کہیے یا رحمت کا کہ اُن کے مضامین میں آمد اور تحریر میں بلا کی خود روی (spontaneity) موجود ہے، جس میں اُن کے مزاج کے بنیادی وصف خلوص اور دردمندی، موجِ تہ نشیں کی طرح گھلے ملے ہوئے ہیں۔ روسو نے کہا تھا 'علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے، خلوص کی علم سے نہیں ہوتی۔' شاید اس لیے کہ خلوص بازار میں نہیں بکتا۔ اس کے لیے تو ع پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی!

نصرت نے بڑی سادہ دلی سے جابجا اپنی ہیچ مدانی کا اعتراف اور، اپنی ناکامیوں سے کام لینے اور اپنی نادانیوں سے دانائی کی راہ ڈھونڈنے کا اظہار کیا ہے، جو یقیناً اس دور میں اپنا اپنا طبلِ علم بجانے والے بہت سے فہمیدگانِ عصر کے لیے لمحۂ فکریہ پیدا کرسکتا ہے۔ یہ اُن کے مزاج کی بے ریائی ہے جو کہیں بھی نقاب میں رہنا نہیں چاہتا۔

○ 'راقم الحروف نے جتنا علم اب تک حاصل کیا ہے، وہ سارے کا سارا کمیونسٹوں کی صحبت میں ہی بیٹھنے کا نتیجہ ہے۔ کمیونسٹوں کے ساتھ اٹھک بیٹھک نہ رہی ہوتی تو خادم آج بھی عدیس ابابا کو ملک حبش کا بادشاہ، بورژوائی کو روس کا کوئی پڑوسی ملک، پرتگال کو فرانس کے صدر ڈی گال کا قریبی عزیز اور سالا زار کو روس کے کسی زار کا سالا سمجھنے کی سطح پر پڑا رہتا۔'

('دایاں بازو و بایاں بازو' مشمولہ 'تحت اللفظ')

○ 'سٹے بازوں کا یہ تھا کہ ہر مہینے تنخواہ کا ایک معقول حصہ برباد کرنے کا موقع مفت ہاتھ آ جاتا تھا اور ہمیں معمہ کے ٹوکنوں کی بدولت چار پانچ روپے کی قیمت والے فلمی رسالے تین چار آنے میں مل جاتے تھے اور خدا کے فضل سے اردو کے یہی فلمی رسالے تھے، جنھوں نے آگے چل کر ہمارے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔'

('اردو کے ادبی معمے' مشمولہ 'نمی دانم')

○ 'راقم انگریزی کے ان ادبی افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ عموماً نہیں کرتا جو صیغۂ واحد متکلم میں لکھے گئے ہوں۔ کیوں کہ ان میں مسئلہ یہ رہتا ہے کہ میں آدھی کہانی (اور کبھی کبھی تو پوری کہانی) پڑھ کر بھی یہ نہیں سمجھ پاتا کہ بیان کرنے والا مذکر ہے یا مونث، تاوقتیکہ کہانی میں اس کے شوہر یا بیوی کا ذکر نہ آجائے۔'

('مسئلہ تذکیر و تانیث' مشمولہ 'بقلم خود')

مایا انجلیو (Maya Anjelou) نے کہا ہے کہ انسان اپنا گھر (وطن) کہیں نہیں چھوڑ پاتا، جہاں جاتا ہے، یہ ساتھ ہوتا ہے! نصرت بھی سہارن پور کے ناسٹیلجیا سے نہیں نکل پاتے، جہاں اُنھوں نے اپنے بچپن سے لے کر آغاز شباب تک کا زمانہ گزارا ہے۔ وہ اپنے بچپن، حالات درس اور مشاغل کا تذکرہ کرتے ہوئے بے خیالی میں سہارن پور کے گلی کوچوں یا چوک میں نکل جاتے ہیں اور وہاں پر کہیں مولوی یاسین، کہیں چچا گل محمد چشمے والے اور کہیں میاں اسلام بار بر سے اپنی اُسی دور کی معصوم کیفیتوں کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ اس طرح کے ناسٹیلجیا کی بڑی اچھی مثال اُن کا مضمون 'امروہے کا جو ذکر کیا' میں دیکھی جا سکتی ہے:

○ 'خود ناچیز کم ترین بھی پیدا ہوا سکندر آباد میں، عمر کا نصف حصہ گزرا دہلی میں، لیکن جب خواب دیکھتا ہے تو منظر اُس میں خواہ دفتر واقع سہارا کمپلیکس نوئیڈا کا ہو، مگر کھڑکیاں اس کی کھجور تلے یا خانی باغ ضلع سہارن پور میں ہی کھلتی ہیں۔ خواب میں نظر آنے والے شہر کا نام چاہے لندن یا قاہرہ ہو، مگر پل کمبوہان اور بازار نخاسہ اس میں ضرور نظر آتے ہیں، بھلے ہی ان کا نام 'ٹیمس برج' اور 'پکاڈلی سرکس' کیوں نہ رکھ دیا گیا ہو۔

لیکن صاحب جیسی دیوانگی میاں بقراطی کی شخصیت میں امروہے کے لیے دیکھی، ویسی نہ کہیں سُنی نہ پڑھی...

(بقراطی کی باتوں میں بات بات پر امروہے کا ذکر سن کر مصنف نے اُنھیں غصے میں آ کر ایک دن کہہ دیا: "یار بقراطی صاحب، مجھے لگتا ہے آپ کو امروہے کی بیماری ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے آپ جلدی سے کسی ماہر نفسیات سے رجوع کیجیے...)

میری بات اور لہجے کا ایسا اثر ہوا کہ چائے کا برتن اُٹھاتا ہوا اُن کا ہاتھ رُک گیا اور عجیب سی خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر دھیمی آواز میں بولے: "میاں، آپ امروہے کے نہیں ہیں، اس لیے کہہ رہے ہیں۔ ذرا اندر تک جھانک کر دیکھیے، ایک امروہہ ہر دل میں آباد پائیں گے۔ کہیں اس کا نام لکھنؤ ہوگا، کہیں بجنور، کہیں سہارن پور تو کہیں سکندر آباد۔ کوئی اسے لاہور کہتا ہے، کوئی کلکتہ۔ یہ سب امروہے ہماری ہجرتوں نے آباد کیے ہیں...

('امروہے کا جو ذکر کیا')

البرٹ کامیو کا کہنا ہے کہ 'کوئی بھی شخص اپنی تفریحات میں منافق نہیں ہوتا' مصنف واحد متکلم کے طور پر جابجا اپنے مشاغل و تفریحات کو بے کم وکاست بیان کرتا چلا جاتا ہے، اور اکثر منبع ظرافت ثابت ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ ٹیگور کے اس قول کا قائل نظر آتا ہے کہ 'جب میں خود پر ہنستا ہوں تو اپنا ہی کچھ بار ہلکا

www.taemeernews.com

کر لیتا ہوں۔' یوں بھی دیکھا جائے تو اپنے آپ کو انتہائی سنجیدگی سے لینے والا شخص عموماً مضحکہ خیز نظر آنے کی فضیحت سے گزرتا ہے، لیکن اپنے آپ پر ہنسنے والا کبھی نہیں۔ وہ اپنی خندہ آفرینی سے ایسی فضیحت کی راہ کھوٹی کر دیتا ہے۔ خود کو ہنسی کا نشانہ بنانا کوئی ہنسی کھیل کی بات نہیں ہے، البتہ دوسروں پر ہنسنا آسان کام ہے اور ذلیل بھی۔ نصرت کے یہاں خود کو نشانۂ ظرافت بنانے کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

○ اتوار کے اتوار لال قلعے کے پیچھے جو کباڑی بازار ہر ہفتے لگا کرتا تھا، اس کی سیر کرنا ہمارا ایک ایسا ہفتہ وار معمول تھا، جس میں صرف اس روز فرق آتا تھا، جس روز اتوار نہ ہو!

'کباڑی بازار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دنیا کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ پرانے ٹیوب، تازہ بریانی، اور سیکنڈ ہینڈ جوتوں سے لے کر رشیدہ کی کشیدہ کاری اور مسدسِ حالی تک ہر قدیم و جدید شے اس بازار کے کباڑ میں آپ کو مل جائے گی اور وہ بھی بہت سستے داموں۔ یہ اور بات ہے کہ گھر جانے پر دراصل ٹائر ٹیوب بوسیدہ نکلیں، بریانی موجب اسہال بن جائے، جوتوں کے تلے میں جوڑ پایا جائے اور وہ سیکنڈ ہینڈ کی بجائے تھرڈ ہینڈ نکلیں۔ رشیدہ کی کشیدہ کاری دراصل کشیدہ کی رشیدہ کاری یا ایسی ہی کوئی جعلی کتاب نکلے اور مسدسِ حالی میں سائیکل مرمت کا مذ باتصویر کے جز جڑے ہوئے ہوں۔'

('کباڑی بازار کی سیر' مشمولہ 'نمی دانم')

''کئی کباڑی حضرات اتنے کائیاں واقع ہوئے کہ بعض اوقات نئی چیزیں بھی ہم جیسے رجعت پسندوں کو پرانی کہہ کر بیچ دیتے ہیں۔ کئی اسپرے لیونڈر، پاکٹ کیلکولیٹر، اسٹیریو واک مین، اور کمپیوٹر ڈسک ہم کباڑیوں کے اس دعوے پر یقین کرتے ہوئے خرید کر لا چکے ہیں کہ قدیم انگریز تاجر یہ چیزیں افغانستان کے راستے سے ہندستان لائے تھے۔ چونکہ ہماری تاریخ و جغرافیہ شروع سے کمزور ہیں، اس لیے ایسی باتوں کا فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ ... اسی کباڑی بازار کے ایک چاٹ والے نے ہماری قدامت پرستی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہمیں تازہ دہی بڑے یہ کہہ کر کھلانے کی کوشش کی کہ اس میں جو دہی ہے، وہ مرہٹوں کے زمانے میں جمائی گئی تھی، لیکن ہمیں کچھ شک سا ہونے لگا، لہٰذا کھائے بغیر آگے بڑھ گئے۔ (میاں عبدالقدوس کا کہنا ہے کہ ہم اسی لیے زندہ ہیں۔)

('کباڑی بازار کی سیر' مشمولہ: نمی دانم)

○ محفل میں ہم دوستوں نے اردو ادیبوں کی گم نامی کی موت پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ گفتگو میں نشتر خانقاہی جیسے ادیبوں کی خاموش وفات کا ذکر بھی آیا تھا، جن کے دنیا سے رخصت ہو جانے کی اطلاع اس دنیا کو ایک ہفتے بعد ملی تھی۔ ایک دوست نے تو مجھ پر ہی فاتحہ پڑھ دی اور کہا کہ 'نشتر خانقاہی تو پھر بھی ایک بڑے ادیب تھے۔ اس لیے ان کی وفات سے باخبر ہونے میں اردو دنیا کو ایک ہفتہ لگا تھا۔ تمھارا انتقال ہوا تو شاید ایک مہینے سے زیادہ لگ جائے گا۔' میں نے پوچھا: 'وہ کیوں؟' تو اس نے کہا کہ 'تمھارا شمار بھی تو اردو ادیبوں میں ہوتا ہے۔' 'مگر میں تو دراصل ادیب نہیں ہوں!' میں نے دوست کی بات پر دل ہی دل میں خوش ہو کر مصنوعی احتجاج کیا۔ 'دراصل ادیب نہیں ہو، اسی لیے تو تمھارا شمار اردو ادیبوں میں ہوتا ہے۔' دوست نے اطمینان سے کہا اور میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔

('اپنی یاد میں' مشمولہ: اسٹنگ آپریشن)

ڈاکٹر سیوئس (Dr.Seuss) نے کہیں لکھا ہے کہ 'مجھے مہملات پسند ہیں۔ ان سے دماغی خلیے بیدار ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو واہے اور مہملات بھی ہماری زندگی کا ضروری حصہ ہیں۔ یہ ایک طرح سے دنیا کو دوربین کی الٹی سمت سے دیکھنے کی کوشش ہے اور اس سے ہمیں زندگی کی سختیوں پر ہنسنے کا حوصلہ ملتا ہے۔' رشید احمد صدیقی نے اسی بات کو یوں کہا ہے کہ 'عقل کی باتیں دیر تک نہ سنی جا سکتی ہیں، نہ سنائی جا سکتی ہیں' اور اقبال نے بھی یہی چاہا تھا کہ پاسبانِ عقل کبھی کبھی دل کی پاسداری سے چھٹی لے لیا کرے! نصرت کے کالموں نے اس کی

www.taemeernews.com

ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

○ ''ایک بار تو یہ ہوا کہ میں سوچتے سوچتے کچھ اور سوچنے لگا اور کچھ اور سوچتے سوچتے اور ہی کچھ سوچنے لگا۔ جس سے اس قدر گھبراہٹ ہوئی کہ میں نے فوراً سوچنا بند کر دیا۔ یعنی ایم ٹی وی دیکھنے لگا، جسے آپ صرف دیکھ سکتے ہیں، سوچنے کے لیے اس میں کچھ باقی نہیں چھوڑا جاتا....

......ایک بار تو حد ہی ہوگئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں بستر پر پڑا سو رہا ہوں اور خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں بستر پر لیٹے ہوئے ایک اور خواب دیکھ رہا ہوں، جس میں یہ نظر آ رہا ہے کہ میں اسی بستر پر محوِ خواب ہوں اور خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ اسی بستر پر.. الخ.... الخ...

یہ پیچ در پیچ خواب دیکھ کر خوف سے میری گھگی بندھ گئی اور اگلی صبح بڑی مشکل اور تاخیر سے بیدار ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ مجھے ایک ایک کر کے ان خوابوں سے باہر آنا پڑا اور پھر ان بستروں کی تعداد بھی کافی تھی، جن پر میں اس رات ایک ساتھ سویا تھا۔''

('بے ہو غریبی کی')

○ ''ایسا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لوگ اپنے خوابوں پر قادر یعنی قادر الخواب بلکہ خواب القادری ہوتے۔ خواب میں جو چاہا دیکھ لیا کرتے۔ مثلاً فلموں کے شوقین بغیر ٹکٹ لیے اور بغیر تفریح ٹیکس دیے خواب میں جمعہ کے جمعہ آنے والی تازہ فلمیں دیکھ لیتے۔ شاعر حضرات دن بھر غزلیں کہتے اور رات کو خواب میں مشاعرہ لوٹتے۔ شوہر حضرات پہلو میں بیوی کے موجود ہوتے ہوئے بھی پڑوس والی کو ہر رات چڑیا گھر کی سیر کرا لایا کرتے۔ کلرک حضرات ہر روز اپنے افسر کو ڈانٹ کر اس کی سی آر خراب کر دیتے۔ الغرض خواب میں وہ سب کچھ ہو جایا کرتا، جو بے خوابی میں ناممکن ہے۔''

('نیند ہماری خواب ہمارے'، مشمولہ: نمی دانم)

اچھا مزاح بصیرت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ نقص یا بدی کو اُجاگر تو کرتا ہے پر بدخواہ نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی سازگاری سے منہ پھیرتا ہے، لیکن اُس کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ کسی تبدیلی یا انقلاب کے لیے ایک کارگر حربہ ثابت ہو۔ وہ صرف اس کا احساس دلاتا ہے، جب کہ طنز (irony) نہ صرف تبدیلی کے لیے مہمیز کرتا ہے بلکہ کبھی کبھی تازیانہ بھی کس دیتا ہے۔ طنز (غیر معقولیت کے خلاف) شدید احساسات اور ذرا غیر دوستانہ رویے کا حامل ہوتا ہے۔ یہ مزاح کی بہ نسبت تہ دار ہوتا ہے اور کاٹ دار بھی، اس لیے اس کا وار گہرا ہوتا ہے۔ ذکاوت اور ایہام اس کے اسلحہ خانے کے خاص ہتھیار ہیں۔ جین اسٹیفورڈ (Jean stafford) نے لکھا ہے 'طنز، میں سمجھتا ہوں کہ وہ اخلاقیات کا ایک شدید طرز ہے۔' اس تفصیل کی روشنی میں اسے 'ظرافت کی دنیا کا معلمِ اخلاق' سمجھیے!

طنز اپنے مقبول پیرائے میں مخالف کے نظریات و دلائل کو تسلیم کرتے ہوئے اس طرح بیان کرتا ہے کہ اُن کے نقائص اور کمزوریاں ظاہر ہو جائیں۔ اسی طرح یہ برملا اتفاق کے پردے میں اختلاف اور ستائش کی راہ سے سرزنش کرنے کا فرض انجام دیتا ہے۔ اسے آپ انگریزی کی اس مثل پر محمول کر لیجیے کہ 'کتے کو وسیلۂ شکار بنانا اور خرگوش کی حمایت میں اُس کے ساتھ دوڑنا' یعنی طنز ایسا ایک حربہ ہے، جس میں کتا اور خرگوش دونوں شامل ہیں۔

نصرت کی ظرافت میں مزاح حاوی ہے، لیکن اُنھوں نے قولِ محال سے کام لے کر کئی عمدہ طنزیہ مضامین بھی پیش کیے ہیں۔ مثلاً 'غریبی کی سطح سے اوپر' میں غریبی کی سطح سے نیچے رہنے والے دو فٹ پاتھیے اپنی بات چیت میں غریبی کی سطح سے اوپر رہنے والوں کے حالات پر رحم کھاتے نظر آتے ہیں۔ 'سیاست کی اے بی سی ڈی' میں ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کے مختلف طبقات کے لوگ اپنے اپنے حالِ زار پر قانع، چناؤ کے بوجھ سے بے نیاز، اپنے بے ڈھنگے طرزِ زندگی پر صابر و شاکر ہو بیٹھے ہیں۔ 'بے ہو غریبی کی' میں مصنف 'سلم ڈاگ ملینیر' کی کامیابی پر غریبوں کے تاثرات جاننے کی کوشش کرتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے کہ وہ لوگ

www.taemeernews.com

اپنی سلم کی اُس فلاکت اور گندگی کے کتنے عادی اور اپنی کھال میں کتنے مست ہیں، جس کی چبھن اور تلخی سے متاثر ہوکر انٹرنیشنل فلمی ادارے نے فلم کو آٹھ آسکر ایوارڈ دے دیے تھے، لیکن ان ایوارڈ کی خبر ان کے طرزِ زندگی پر کتنی بے اثر تھی۔ 'پچاس سال بعد' میں مصنف دیکھتا ہے کہ آزادی کی نصف صدی کے بعد بھی ہر شعبہ ہائے زندگی کے لوگ معیشت و معاشرت کے چکرویوہ میں پھنسے ایک روٹین سی بے حس و بے لذت زندگی گزار رہے ہیں۔ آزادی اور غلامی کے فرق سے بے نیاز، کیا کھویا اور کیا پایا کے احساسِ سودوزیاں سے غافل۔ 'ہمیں شکایت نہیں ہے' میں تو لوگوں نے اپنے حالات کی کٹھنائیوں اور زندگی کی دشواریوں کی جائز شکایات کرنے سے بھی منہ موڑ لیا ہے، بلکہ ان دشواریوں اور ناانصافیوں میں بھی اپنے لیے خیر کے پہلو تلاش کر لیے ہیں۔ اسی طرح عمل سے دور لیکن لفظیات و اصطلاحات میں گرفتار کمیونزم کی زوال پذیری کا پُرلطف خاکہ انھوں نے اپنے مضامین 'لنگڑی ترازو' اور 'دایاں بازو و بایاں بازو' میں بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔۔

اس کے علاوہ نصرت کے دیگر مضامین میں بھی طنز کے تیرو نشتر جہاں تہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ خاص طور پر اپنے کالموں میں اُنھوں نے ملت اسلامیہ کی ماضی پسندی، روایت پرستی اور وہم زدگی۔ لیڈرانِ ملت کی موقع پرستی اور خودغرضی، ادبی اداروں کی بدنظمی و بداطواری۔ ادبی ایوارڈ کی بے وقری و بے وقعتی، اردو صحافت کی بے بصری و بے سمتی اور ہادیانِ ملت کی گم رہی و خود فریبی پر جابجا بڑے ہی لطیف پیرائے میں چٹکیاں لی ہیں، مثلاً:

○ ...ہاں میاں یاد آیا ایک ماضی تمنائی بھی ہوتا ہے، جو مسلمانوں کو بے حد مرغوب ہے اور قومیں جہاں اچھے حال اور روشن مستقبل کی تمنا کرتی ہیں، وہاں ہم ہر کس و ناکس سے صرف تابناک ماضی کے تمنائی رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے اسی کو ماضی تمنائی کہتے ہیں۔ پھر بھی واضح رہے کہ ناچیز کو سبھی طرح کے ماضی پسند ہیں۔ علی الخصوص وہ ماضی تو بہت زیادہ اچھا لگتا ہے، جو بہت زیادہ ماضی میں ہو۔'

('حافظہ خراب ہے'، مشمولہ: نمی دانم)

○ بہرکیف، میں نے سوچا پہلے تو مسلمانوں کے ماضیوں اور غازیوں کی داستانیں چھاپ چھاپ کر ان کی غیرت و حمیت کو للکارا جائے، پھر انھیں احساس دلایا جائے کہ اس ملک میں ان کے ساتھ کیسی کیسی ناانصافیاں ہو رہی ہیں۔ تین طلاق کے روح پرور اعلان پر کیسے کیسے حملے ہو رہے ہیں۔ مطلقہ بیوی کو گزر اوقات کا خرچ نہ دینے کے مردِ مومن کے حق کو چھیننے کے لیے کیا کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔ ہمارے قدیم مدرسوں کو دورِ جدید کے علوم اور سائنسی سہولتوں کے جال میں پھانسنے کے لیے کون سی چالیں چلی جا رہی ہیں اور بے چارے سسر حضرات کی جواں دلی کا نشانہ بننے والی بہوؤں کی اصلاح کے فتوؤں پر کیسا طوفان کھڑا کیا جا رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد شہر میں کرفیو لگوانے والی خبریں چھپوا کر نام پیدا کروں اور جب اچھی طرح پیدا ہو جاؤں تو کسی پارٹی سے ملت کا مول تول کر کے لوک سبھا یا راجیہ سبھا میں جا بیٹھوں۔ بس نہ پھر آئے گا قوم کا خیال، نہ اُٹھے گا ملت کا درد!

('اُف یہ دردِ ملت کا'، مشمولہ: نمی دانم)

○ 'عام طور پر اکاڈمیاں ترقی کے معاملے میں اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ اس دوڑ میں زبان اُن سے پیچھے رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اردو اکاڈمیاں! یا پھر سنسکرت اکاڈمی ہی کو لے لیجیے۔ زبان تو بے چاری آکاش وانی کی خبروں اور فلمی شادیوں کے منڈپ کے سوا کہیں بولنے سننے میں نہیں آتی، مگر اس کی اکاڈمی ہر طرف نظر آتی رہتی ہے۔ رہی اردو تو اس کا معاملہ اور بھی دلچسپ ہے۔ ہر جگہ ہے، مگر کہیں نہیں ہے۔ زبان نہ ہوئی معشوق کی کمر ہوگئی۔ ع ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔

('ایک نظر اِدھر بھی'، مشمولہ 'نمی دانم')

○ 'اردو ہی کے اخبار ہیں جنھیں پڑھ کر آپ کو معلوم ہوگا کہ... ماشاءاللہ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا ہے۔ اردو کا اخبار قوم کو روزانہ اطلاع دیتا ہے کہ بحمداللہ قوم نے آج بھی کوئی ترقی نہیں کی۔ اس کے ساتھ ہر سطح پر تعصب برتا جا رہا ہے۔ اردو

www.taemeernews.com

اخبار کی خبریں، اس کے مضامین، تبصرے، مراسلات، کالم سب چیخ چیخ کر روزانہ بتاتے رہتے ہیں کہ ہمیں ملازمتوں میں مناسب نمائندگی نہیں مل رہی ہے۔ ہمارے کاروبار کو نقصان پہنچایا جارہا ہے۔ ہمارے علاقوں میں جان بوجھ کر بجلی بھگا دی جاتی ہے۔ ہماری گلیوں کو صفائی کرم چاری یوں ہی چھوڑ دیتے ہیں...'

('ایک اخباری بیان ہوجائے' مشمولہ 'نمی دانم')

عام مشاہدہ ہے کہ الیکشن کے زمانے میں سیاسی پارٹیوں کو مسلمانوں کی یاد آتی ہے اور عموماً اُنھیں دنوں پیاز بھی مارکیٹ سے عنقا ہوجاتی ہے یا پھر اُس کے دام آسمان کو چھونے لگتے ہیں۔

○ ''یعنی مسلمان نہ ہوئے پیاز ہوگئے۔ ان معنوں میں نہیں کہ چھلکے اتارتے جاؤ، اُتارتے جاؤ اور آخر میں بس چھلکا ہی ہاتھ آئے، بلکہ اس مفہوم میں کہ بینگن بھی ہیں، آلو بھی ہیں، ٹنڈے بھی ہیں، مولی بھی ہے۔ مگر پیاز نہیں تو کوئی سبزی ترکاری ذائقہ نہیں دیتی۔ جس طرح آج کل نہیں دے رہی ہے اور حکومت بے چاری پاکستان سے پیاز درآمد کرنے پر مجبور ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ اپنے ملک میں مسلمان بہ افراط دستیاب ہیں اور اُنھیں پاکستان یا بنگلہ دیش سے درآمد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ملک میں جہاں جایئے، ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں! خاص کر گندی بستیوں اور جیلوں میں۔'' ('مسلمان اور پیاز' مشمولہ: 'نمی دانم')

سیاست غالباً دنیا کا دوسرا سب سے قدیم پیشہ ہے۔ ہم ذرا غور کریں تو اُس کی پہلے پیشے سے بہت کچھ مناسبتیں بھی پا جائیں گے۔ طرفہ تماشا یہ کہ کسی کو اس سے مفر نہیں۔ ساری کشاکش گیتی، رزم گاہ سیاست کی رہین ملے گی۔ ہر کوئی زرداری یا بے زاری یا آہ وزاری کا گرفتار ملے گا۔ شاید اسی لیے مفکروں نے کہا ہے کہ آدمی اپنی فطرت میں ایک سیاسی جانور ہے۔ لیکن مارک ٹوائن نے اس پر اعتراض کیا ہے اور یہ فرق بتایا ہے کہ اگر تم ایک کتے کو کھانا کھلاؤ گے اور اُس پر مہربانی کروگے تو وہ تمھیں کبھی کاٹے گا نہیں! جان ایف کینیڈی نے ایک قدرے متوازن خیال پیش کیا تھا کہ 'اگر کچھ زیادہ سیاست دان سخن فہم اور کچھ زیادہ شعرا سیاست آشنا ہوتے تو یہ دنیا رہائش کے لیے زیادہ بہتر جگہ ہوتی!' غرض کہ سیاست کے تعلق سے ایسے ہی دل چسپ اور عجیب خیالات پائے جاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سیاست کی سب سے زیادہ مار جھیلنے کے گلہ گزار فرقے کے اردو مصنفوں نے سیاسی طنز پر بہت کم لکھا ہے۔ لکھا بھی ہے تو عموماً بات 'الیکشن' اور 'لیڈری' کا مضحکہ اُڑانے سے آگے نہیں بڑھی۔ نصرت کے یہاں سیاسی طنز کے بڑے جاندار نمونے پائے جاتے ہیں، اس کی ایک وجہ اُن کی صحافت سے طویل وابستگی بھی رہی ہے۔ اُن کے سیاسی طنزیوں کی بڑی طویل فہرست (ایک اخباری بیان ہوجائے!، کہت کبیر سنو بھئی سادھو، مسلمان اور پیاز، کانشی رام کا روزنامچہ، مسلم ووٹ برائے فروخت، سیاست کی اے بی سی ڈی، شیشن کا شوشہ، شاہی ایف آئی آر، پچاس سال بعد اور قصہ پانچ درویش وغیرہ) ہے۔

'مسلمان اور پیاز' 'پچاس سال بعد' اور 'کہت کبیر سنو بھئی سادھو' اُن کے لاجواب سیاسی طنزیے ہیں۔

اُن کے سیاسی طنزیے اس لحاظ سے بھی داد کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اپنے زمانے کے سیاق وسباق میں چوٹی کے لیڈروں کا نام لے لے کر اُنھیں ہدفِ طنز بنایا ہے۔ اس کی مثال میں اردو صحافت میں تو کوئی نہیں البتہ انگریزی میں راجندر پوری اور بہرام کنٹراکٹر (جو Busy Bee کے نام سے لکھا کرتے تھے) کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ نصرت کا 'کانشی رام کا روزنامچہ' ایک صحافتی نوعیت کا طنزیہ ہے۔ اس میں 'کلیان' کی بنیاگری، 'کیسری' کی دال کی سی خطرناکی، 'شاہی امام' کے حجروں میں سودے بازی، 'ملائم' کی کھورتا، اور 'مایا' کا مہرہ چلنے کے فقروں سے ایک خاص عہد کا سیاسی منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔

ایک مفکر نے کہا ہے کہ سیاست ایک ایسا آرٹ ہے، جس میں کامیابی کے ساتھ غریبوں سے ووٹ اور امیروں سے فنڈ حاصل کیا جاتا ہے، ہر ایک کا دوسرے سے تحفظ کا وعدہ کرکے!

www.taemeernews.com

ہماری ملت کے ووٹوں کے سب سے بڑے سوداگر شاہی امام کی نصرت کے قلم نے خوب خبر لی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

بہت یقین کا مطلب بہت خسارہ ہے
اُسے نگاہ میں رکھو جسے امام کرو

نصرت کے ایک مضمون میں شاہی امام کا نشی رام سے ساتھ گانٹھ ٹوٹ جانے پر دریا گنج دہلی میں 'شاہی ایف آئی آر' لکھاتے ملتے ہیں تو دوسری جگہ الیکشن کے سیزن میں جامع مسجد میں سیخ کباب، نہاری، حلیم، بریانی اور تلے ہوئے مرغ کی دکانوں کے ساتھ ایک بورڈ 'مسلم ووٹ برائے فروخت' کا ٹنگا نظر آتا ہے۔ جس پر 'آج کا ریٹ' درج کرنے کے بعد احتیاطاً لکھا ہوا ہے ''نقالوں سے ہوشیار شہر میں ہماری کوئی برانچ نہیں ہے۔ (پروپرائٹر اور ڈیلر: سڑی بیوٹر: شاہی امام ابن شاہی امام ابن شاہی امام)... اس سلسلۂ شاہی کی موجودہ کڑی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

○ ''شروع میں فرزندوں نے ملت کی علت میں پڑنے سے انکار کیا اور دوسری علتوں میں زیادہ دل چسپی دکھائی، لیکن رفتہ رفتہ محنت پدری رنگ لائی اور فرزند کلاں نے اچانک تربیت کا اثر قبول کرلیا۔ یہاں تک کہ جمعہ کے جمعہ بآواز بلند قوم کی فکر کرنے لگا۔''

('شاہی ایف آئی آر' مشمولہ 'نمی دانم')

نصرت نے ایک بار اُن کی برأت میں بھی قلم چلایا لیکن اپنے ڈھنگ سے۔ جب ماہرِ امراضِ قلب ڈاکٹر خلیل اللہ نے مسلمانوں کو مرغن غذاؤں میں اعتدال برتنے کا مشورہ دیا تھا تو اُنھوں نے اُن کے مشورے کی سراہنا کرتے ہوئے لکھا تھا:

○ ''...اب وہ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ دل کے معاملات میں اُن کی رائے سپریم کورٹ کی فل بینچ کے فیصلے کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ سپریم کورٹ کے فیصلوں کو تو پارلیمنٹ میں قانون بنا کر الٹا پلٹا بھی جا سکتا ہے، جب کہ خلیل اللہ صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے مشورے کے خلاف دارالعلوم دیوبند وقف اور مدرسہ مظاہر العلوم غیر وقف کے مفتیوں کے پاس فتوا لینے جایئے تو وہ بھی یہ کہہ کر معذرت کرلیں گے کہ برخوردار! اس معاملے کا ذکر صحیح بخاری تو کیا کسی غلط بخاری میں بھی نہیں ہے۔ (واضح ہو کہ یہاں غلط بخاری سے جامع مسجد دہلی کے شاہی امام مراد نہیں ہیں۔) ('ایک اپیل ڈاکٹر خلیل سے' مشمولہ 'نمی دانم')

نظیر صدیقی نے اپنے ایک انشائیے میں لکھا ہے کہ 'قوم کو گمراہ کرنے اور اُس کو بھٹکانے لگانے میں جو کردار ارباب صحافت ادا کرتے ہیں، وہ بعض اوقات ارباب سیاست بھی ادا نہیں کرتے۔ اُن کے اس قول کا صد فی صد اطلاق اردو صحافت پر کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کا محاسبہ کرنے سے ہمارے ادیب اور صحافی عموماً اس لیے گریز کرتے رہے ہیں کہ اسی (صحافت) سے اُن کی روزی روٹی وابستہ رہی ہے۔ نصرت ایک طویل زمانے سے اردو صحافت سے وابستہ ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں موقع بہ موقع جرأت رندانہ کا ثبوت دیا ہے، اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسی جرأت مندیوں کا خمیازہ ایک قلم کار کو کس کس طرح بھگتنا پڑتا ہے:

○ انگریزی اخبارات میں عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ خبریں الگ ہوتی ہیں اور تبصرے الگ، مگر اردو اخبارات میں ایسی کوئی تخصیص نہیں۔ قارئین کی سہولت کے لیے دونوں کو ملا دیا جاتا ہے اور اس خوبی سے ملایا جاتا ہے کہ ہوشیار سے ہوشیار قاری بھی پڑھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ خبر کہاں سے شروع ہوتی ہے اور تبصرہ کہاں ختم ہوتا ہے۔ کئی اخبار تو تبصرے پر اتنا زور دیتے ہیں کہ خبر بالکل ہی غائب ہو جاتی ہے، صرف تبصرہ رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اکثر اردو قارئین اس زحمت سے بچالیے جاتے ہیں کہ پہلے خبر پڑھیں اور پھر اپنی کوئی رائے قائم کریں۔ خبر پڑھے بغیر ہی قاری اس پر ایک رائے کا مالک بن جاتا ہے۔ ویسے سچ پوچھیے تو اردو قاری کو اس کی اجازت ہی نہیں ہے کہ وہ خود اپنی کوئی رائے بنا سکے۔ اردو اخبار اسے بنی بنائی اور چھپی چھپائی رائے تھما دیتے ہیں کہ لو بیٹا

www.taemeernews.com

اسے پکڑو اور ثوابِ دارین حاصل کرو۔''

○ ایک چیز اردو اخباروں میں اور ہے، جو بڑے بڑے انگریزی اخبار میں بھی بہت کم دیکھنے کو ملے گی۔ وہ ہے اخباری بیان بازی! دنیا کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہے، جس پر اردو کے اخبار میں آپ کو کوئی اخباری بیان نہ مل جائے۔ اردو قوم کا یہ حال ہے کہ اس کے ایک چوتھائی افراد اخبار پڑھتے ہیں، باقی تین چوتھائی اخباری بیان دینے میں لگے رہتے ہیں۔''

('ایک اخباری بیان ہو جائے'، مشمولہ: نمی دانم)

اردو میں ترجمے کے مسائل پر اُن کے دو دل چسپ مضمونچے 'تحت اللفظ' میں شامل ہیں۔ اردو اخباروں میں انگریزی کے نیم خواندہ مترجموں کی بوالعجبیاں اخبار بینوں سے کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ اس کی ایک مثال میں نصرت نے بہ روایت راوی میرٹھ کے ایک روزنامے کا ایک ایسا قصہ بیان کیا ہے، جس میں کسی ستم ظریف مترجم کی ترجمے کی غلطی میں بھی درستی کا پہلو نکل آیا ہے کہ واقعات اس کے شاہد ہیں:

○ ایک مرتبہ فرقہ وارانہ فساد کے دوران سرکاری پریس ریلیز میں کہا گیا کہ گھنٹہ گھر کے حساس علاقے میں صورتِ حال کشیدہ ہے، مگر حالات قابو میں ہیں اور پی اے سی کی گشت یعنی پیٹرولنگ راؤنڈ دی کلاک جاری رکھی جائے گی۔ پریس نوٹ کا ترجمہ یہ ہوا کہ پی اے سی گھنٹہ گھر کے چاروں طرف پٹرول چھڑکتی رہے گی۔ غضب یہ کہ ترجمہ چوں کہ پی اے سی سے متعلق تھا، اس لیے لوگوں نے اس کا فوراً یقین کرلیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکام کو دوبارہ حالات قابو میں کرنے پڑے۔''

('ترجمے کے کچھ اور مسائل'، مشمولہ: تحت اللفظ)

برسبیل تذکرہ عرض ہے کہ کبھی انسانی ذہن کی درزا کی بھی معنی کے نئے نئے پہلو تلاش کرلیتی ہے۔ ہمارے اردو اور فارسی کے اُستاد مولانا جالب مظاہری بڑے زندہ دل انسان تھے۔ ایک بار 'بوستاں' کی ایک حکایت میں یہ شعر سامنے آیا۔

چناں قحط شد سالے اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اُنھوں نے مفہوم بتانے کے لیے کہا تو ہم نے وہی معروف معنی بتا دیے کہ 'دمشق میں ایک سال ایسا سخت قحط پڑا کہ عشاق، عشق کرنا بھول گئے' اُستادِ محترم نے مسکرا کر کہا، ''اب ذرا یاراں فراموش کے بعد کوما (،) لگا کر معنی بتاؤ!''

ہمیں شش و پنچ میں گرفتار دیکھ کر متبسم ہو کر فرمایا کہ ''یاروں کو بھول بیٹھنے والیاں یا عشاق سے تغافل برتنے والیاں بھی عشق کرنے لگیں، جب قحط نے اُنھیں مجبور کر دیا۔''

دراصل 'اردو میں ترجمے کے مسائل' (دو قسطیں)، 'مسئلہ تذکیر و تانیث' (دو قسطیں)، 'کتاب پر تبصرہ کیسے لکھیں!'، 'اردو کا دوسرا المیہ' (املا پر)، 'داستانِ غریب ہمزہ' ('ہمزہ' پر) اور 'منشی شا احمد صبر و عصر' (صنائع شعری پر)، خاص نوعیت کے ظریفانہ مضامین ہیں۔ اب یہ پتا نہیں کہ نصرت کے ایسے کتنے اور مضامین ہیں، وہ اگر کوشش کریں تو ابن انشا کی 'اردو کی آخری کتاب' کے رنگ کی ایک نئی اردو ریڈر تیار کر سکتے ہیں۔

تصرفِ لفظی سے مزاح پیدا کرنا ہمارے ظرافت نگاروں کا ایک عام شیوہ ہے۔ اس طرح کے آرٹ اینڈ کرافٹ کی مثالیں نصرت کے یہاں کم ہی ملیں گی۔ اُن کی کوشش عموماً یہ ہوتی ہے کہ تصرف کے بنا ہی مزاح کے فطری مواقع لفظوں کے محلِ استعمال سے ڈھونڈ نکالیں:

○ ''جوش کی 'یادوں کی برات' جسے میاں عبدالقدوس سوانح عمری کم اور فکشن کا بہترین نمونہ زیادہ مانتے ہیں یا پھر ایسی یادداشتوں کا احوال جن میں یاد کا کم اور داشتاؤں کا دخل زیادہ ہے۔ اللہ معاف کرے، ایک بار تو جوشِ ملامت میں اُسے آپ بیتی کی بجائے مرحوم کی پاپ بیتی تک کہہ گئے۔''

('حافظہ خراب ہے'، مشمولہ: نمی دانم)

○ (ڈاکٹر خلیل اللہ نے دل کے مریضوں میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھتے ہوئے اُنھیں گوشت خوری میں اعتدال برتنے کا مشورہ دیا تھا۔) ''اگر اعتدال برتنے سے آپ کا اشارہ

www.taemeernews.com

صرف دال کھانے سے ہے تو معاف کیجیے، دال والا یہ اعتدال ایک زیادتی ہے۔''

('ایک اپیل ڈاکٹر خلیل سے' مشمولہ 'نمی دانم')

○ ''ایک بزرگ شاعر وصحافی، جن کا نام اوم پرکاش نامی تھا اور جن کے تخلص کے احترام میں اُن کا عملہ جرائم کی خبروں میں نامی چور اور نامی بدمعاش جیسے لفظ کبھی نہیں لکھتا تھا۔''

('ترجے کے کچھ اور مسائل' مشمولہ: تحت اللفظ)

○ ''امریکا کے آگے تو اب چین بھی چوں نہیں کرتا، صرف چیں کر کے رہ جاتا ہے کہ کہیں انکل سام چیں بہ جبیں نہ ہو جائیں۔''　('مسئلہ تذکیر و تانیث' مشمولہ: بقلم خود)

ہمارے اردو روزناموں میں کارٹون کی روایت نہ ہونے کے برابر رہی ہے۔ انگریزی اخبارات کی دیکھا دیکھی آئی تو سہی، مگر اس کا معیار ناگفتہ بہ رہا۔ جب کہ ایک چھوٹا سا کارٹون بھی عموماً اتنا پُر اثر پیغام دے جاتا ہے جو کئی سو الفاظ پر مشتمل مضمون نہیں دے پاتا۔ یہاں اردو اخبارات میں کارٹون کی کمی کے اسباب پر بحث کا موقع نہیں۔ عقل مندوں کے لیے یہ اشارہ کافی ہوگا کہ
ع اس میں کچھ شائبہ امتناعِ دین بھی ہے!

ایک زمانے میں روزنامہ 'قومی آواز' کے صفحۂ اول پر کارٹون بکس میں نصرت ظہیر کے خیال یا موضوع پر مبنی، اُن ہی کے ظریفانہ کیپشن (Caption) کے ساتھ پریش ناتھ کے بنائے ہوئے کارٹون شائع ہوا کرتے تھے، جو اتنے پُر لطف اور اعلا معیار کے ہوا کرتے تھے کہ کسی بھی زبان کے صفِ اوّل کے اخبار کے مقابل پیش کیے جاسکتے ہیں۔ حسنِ انتصار، جامعیت اور ظرافت کے پیرائے میں تمسخر یا طنز یا اصلاح کا پیغام، اس طرح کے کارٹونوں کے کیپشن کے لیے جو بنیادی شرائط ہوسکتی ہیں نصرت نے اُنھیں کامیابی سے پورا کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

○ ایک کارٹون میں طلبہ کی جماعت نظر آرہی ہے۔ ٹیچر بلیک بورڈ پر جھکا ہوا، جس پر لکھا ہے: 'کانگریس، بی جے پی'۔
کیپشن: دونوں پارٹیوں میں خاص فرق یہ ہے کہ ایک نے برصغیر کا جغرافیہ تبدیل کیا اور دوسری ہماری تاریخ بدل رہی ہے۔

○ ایک کارٹون میں فٹ بال کے گراؤنڈ میں گنجے کھلاڑیوں کا منظر ہے۔
کیپشن: 'برازیل کو اتنے سارے گنجے کھلاڑی رکھنے کی اجازت نہیں ملنی چاہیے، کئی بار پتا ہی نہیں چلتا گیند کون سی ہے!

○ ایک کارٹون میں ممتحن امتحانی پرچے جانچتے ہوئے بڑبڑا رہا ہے:
کیپشن: 'ڈاکٹر کلام کے نام سے بچے کافی اُلجھ رہے ہیں۔ ایک بچے نے امتحان کی کاپی میں لکھا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد پہلے مجاہد آزادی ہیں جنھوں نے ایٹم بم بنایا!'

○ ایک کارٹون میں ہمارے شعبۂ صحت کے معیار پر کیا تیکھا تبصرہ کیا گیا ہے: 'ڈاکٹروں کی ہڑتال سے اور کچھ ہو نہ ہو ہمارے اسپتال کی شرحِ اموات ضرور گھٹ جاتی ہے'۔ اسی طرح کے ایک اور کارٹون میں گجرات کے کسی اسپتال کے ایک وارڈ میں بستروں پر بہت سے زخمی افراد پٹیوں میں جکڑے ہوئے پڑے ہیں اور ایک تختی پر لکھا ہے: 'رپورٹروں کا کیزولٹی وارڈ'۔
کیپشن: 'اب احمد آباد سے کسی ناخوش گوار واقعے کی خبر نہیں مل رہی ہے'۔

○ ایک کارٹون میں ایک نوعمر لڑکا کچھ تحریر کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور اُس کے ماں باپ محوِ گفتگو ہیں:
کیپشن: 'ہمارا بچہ ذہین تو ہے مگر 'مطلوبہ اور پسندیدہ' میں کیا فرق ہے، یہ ابھی نہیں جانتا۔ اڈوانی کو خط لکھ کر درخواست کر رہا ہے کہ پاکستان سے مطلوبہ افراد کی فہرست میں مہدی حسن، احمد فراز اور شعیب اختر کو بھی شامل کرلیں'۔

نصرت کا وہ کیپشن تو غضب کا ہے، جس میں ایک اونچے چبوترے پر نصب گاندھی جی کے مجسمے کی لاٹھی غائب ہے، اور ایک سپاہی اپنے سینیئر کو یوں وضاحت پیش کر رہا ہے کہ ''اس روز لاٹھی چارج کے لیے پولیس والے ان کی لاٹھی لے گئے تھے سر!''

www.taemeernews.com

(3)

خود پسندی انسان کی فطری خصلت ہے اور پھر لکھنے والوں کی خود پسندی، یوں سمجھیے سانپ اور کوڑیالا! فی زمانہ اس خصلت نے ہمارے لکھنے والوں کو اپنی کتابوں پر فرمائشی اور ستائشی تبصرے لکھوانے کی علت میں کچھ ایسا گرفتار کر رکھا ہے کہ ہمارے رسالوں کا تبصروں کا سیکشن سب سے زیادہ گم راہ کن حیثیت اختیار کر کے اب اپنی یہ حیثیت بھی کھو چکا ہے، اس لیے کہ اب اسے مصنف کے سوا کوئی پڑھتا ہی نہیں۔

اردو میں تبصرہ نگاری میں پائے جانے والے تعریف و توصیف کے عمومی و روایتی ڈھنگ، مبالغے اور بوجھل پن سے دوری کا واضح اظہار ایک زمانے میں 'بلٹز' (بمبئی) کے مستقل کالم 'خدا لگتی' کے تحت ظ انصاری کے تبصروں میں دیکھنے میں آیا تھا۔ ظ نے اپنے بے تکلف اور جاندار اسلوب میں جا بجا چٹکیاں لیتے ہوئے بڑے دل کش تبصرے پیش کیے تھے۔ ورنہ حال یہ تھا کہ کتاب کا نفس متن جتنا متین ہوتا تھا، اردو کا مبصر اس سے سوا متانت اللہ بنا نظر آتا تھا۔ بہت بعد میں مشفق خواجہ نے اپنے تبصروں میں طنز کے تیر و نشتر ایک لطافت و شگفتگی کے ساتھ پیش کر کے انھیں اس انتہا پر پہنچا دیا کہ جس کا دعوا کبھی غالب نے یہ کہہ کر پیش کیا تھا ع ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد! مشفق خواجہ کے ظریفانہ انداز میں مصنفین کے محاسبے اتنے ہر دل عزیز ہوئے کہ مشفق کی محقق و شاعر کی پہچان تک دب کر رہ گئی۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ نصرت نے اپنے رواں، دواں بول چال کے لہجے میں اپنے تبصروں کو اتنا دل چسپ ضرور بنا دیا ہے کہ لوگ اُن کے تبصرے نظر کے سامنے آنے پر انھیں پڑھے بنا آگے نہیں بڑھ پاتے، چاہے زیرِ تبصرہ کتاب اور مصنف سے انھیں کوئی دل چسپی ہو یا نہ ہو۔ اگرچہ اُن تبصروں سے اُن کے بالا ستیعاب مطالعے کا پتا نہیں چلتا، غالباً اُن کی اخباری اور سرکاری ذمے داریاں انھیں اس کی مہلت ہی نہیں دے پاتیں، باوجود اس کے ان کے احاطۂ قلم میں کتاب سے زیادہ ورائے کتاب اور مصنف سے زیادہ ملحقاتِ مصنف پر کہنے کے لیے اتنا چھنڈار بھرا ہوتا ہے کہ وہ کسی سنکوچ کے بنا قاری کے لیے پُر لذت خوانِ نعمت چُن دیتے ہیں۔ مثلاً عبید صدیقی کے مجموعۂ کلام ''رنگ ہوا میں پھیل رہا ہے'' پر تبصرے کی تمہید ملاحظہ کیجیے:

○ ''عبید صدیقی سے میری پہلی ملاقات غالباً 1988ء میں 'قومی آواز' کے اڈیٹر موہن چراغی مرحوم کی ویسٹرن کوٹ والی رہائش گاہ پر ایک دل چسپ دعوت کے دوران ہوئی تھی۔ یہ پُر تکلف دعوت خاصی بے تکلف تھی۔ میزبان میں، چراغی صاحب کُل، اور فرحت احساس، عبید صدیقی اور پاکستان ہائی کمیشن کے پریس اتاشی... ایک شاہ صاحب مہمان تھے۔ طے ہوا تھا کہ دعوت کا تمام خرچ میرے ذمے ہوگا اور چراغی صاحب ایک خاص الخاص نان ویج کشمیری ڈش خود تیار کریں گے۔ اس ڈش کے لیے بغیر ہڈی کا گوشت بھی چراغی صاحب کی ہدایات کے مطابق مرحوم بکرے کے مقرر کردہ مقامات سے حاصل کروایا گیا تھا اور واقعی صاحب کیا ڈش تیار کی تھی چراغی صاحب نے .... نہ ذائقے کا پتا تھا نہ گوشت کا۔ پتا نہیں کس ترکیب سے بکرے کو گلایا بلکہ گھلایا گیا تھا کہ گوشت کا ایک ریشہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ تاہم سب چراغی صاحب کا دل رکھنے کے لیے جی بھر کر اس پراسرار ڈش کی تعریفیں کرتے رہے اور اُن کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنے اڈیٹر کی شان میں دو تین ڈکاریں لی تھیں۔

○ 'دیوانِ غالب' کے کرشنا مورتھی کے کیے ہوئے انگریزی ترجمے کو سراہنے کے ساتھ ساتھ قارئین کو یوں انتباہ بھی کر جاتے ہیں:

''جی ہاں، یہ وہی 'دیوانِ غالب' ہے... جسے دیکھ کر آپ بے ساختہ کہہ اٹھیں گے کہ 'اٹھائے نہ بنے اور دھائے نہ بنے'! میر تقی میر جس کی بابت فرما گئے تھے کہ ع کب یہ مجھ ناتواں سے اٹھتا ہے!'' سچ کہتا ہوں، اگر بے دھیانی میں آپ نے صرف ایک ہاتھ سے یہ دیوان اٹھانے کی کوشش کو تو یاد رکھیے، کھوا بھی اُکھڑ سکتا ہے۔ تاہم تقریباً 500 جہازی صفحات پر پھیلے ہوئے اس

www.taemeernews.com

دیوان کی اہمیت و افادیت اس کے وزن سے کہیں بڑھ کر ہے۔"

('ادب ساز' مشترکہ شمارہ نمبر 15 تا 18)

نصرت کے بیشتر تبصروں کو پڑھتے ہوئے یہی لگتا ہے کہ کوئی ہم نشیں تمام تکلف و احتیاط اور حفظِ مراتب بالائے طاق رکھ کر زیرِ تبصرہ کتاب پر بے لاگ لپیٹ گفتگو کر رہا ہے، مگر واقعتاً اُن کا قاری کتاب کی covering (غلافی) معلومات سے زیادہ ذرا کم ہی جان پاتا ہے۔ (اب تو مصنفوں کو یہ الگ پریشانی لاحق ہو گئی ہے کہ لوگ نصرت کے تبصرے دراصل وکا پیے سمجھ کر ہی پڑھ رہے ہیں۔) نصرت نے از رہِ تفنن کہیں لکھا ہے کہ صحافتی مجبوریوں کی بنا پر اُنھوں نے کسی کسی کتاب کو محض سونگھ کر بھی تبصرہ کر دیا ہے۔ وہ مزاح نگار جو ٹھہرے، لیکن اُن کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ عبدالماجد دریابادی جیسے جید مولانا بھی کبھی کبھی کتاب کو پڑھے بنا کیا دیکھے بنا بھی تبصرہ لکھ دیا کرتے تھے، جب کہ وہ مزاح نگار نہیں تھے۔

نصرت کے یہاں موضوعات میں اور تکنیک کی کمی ہے نہ تنوع کی، اور ان ہی میں اُن کے فن کی نئی جہتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں، لیکن اُن کا قلم جہاں ع اُٹھا چکے ہیں زمین دار 'اُن' زمینوں کو پھلانگنا چاہتا ہے، بات نہیں بنتی۔ ایک زمانے میں ایک مشہور کلاسیکی قصے کی پیروڈی میں اے حمید نے 'قصہ پہلے درویش کا' لکھا تھا اور اُن کے بعد لکھنے والوں نے اپنے اپنے دل چسپ مضامین سے اس سلسلے کو آگے بڑھایا تھا۔ نصرت نے بھی سیاست کی بدوضع شطرنجی پر پانچ درویشوں کی محفل (قصہ پانچ درویش) سجانے کی کوشش کی، جو رنگ نہ جما سکی۔ یوسفی اور مجتبیٰ سے لے کر کئی مشہور مزاح نگار کرکٹ کی فیلڈ کو تختۂ مشق بنا کر عمدہ مزاح پارے پیش کر چکے ہیں۔ نصرت کے کمینٹیٹر فضلو میاں، پرویز یداللہ کے ایل بی ڈبلیو (لیاقت حسین بشارت حسین وارثی) تک پر غالب نہ آسکے، البتہ پرویز کے مضمون میں بنتِ ہمدانی کے تعلق سے ایک کرکٹی ڈرٹی جوک کے نہلے پر نصرت نے ایک فٹ بالی جوک (مضمون 'نیند ہماری خواب ہمارے') کا دہلا ضرور رکھ دیا،

کہیں یہ میچ فکسنگ تو نہیں! نصرت کا لکھا ہوا اپنا وفاتیہ اپنی یاد میں اپنی جگہ خوب ہے، لیکن رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین اور نظیر صدیقی جیسے عاشقانِ ظرافت، زمانہ ہوا اپنے اپنے جنازے بڑی دھوم دھام سے نکال چکے ہیں۔

مجموعی طور پر اُن کے مجموعہ ہائے مضامین کا تقریباً ایک تہائی حصہ ایسے شگفتہ اور دل فروز مضامین سے آراستہ ہے کہ اُن کا ایک الگ سے انتخاب لاجواب شائع کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے مزاحیہ ادب کو ثروت مند بنانے والے مضامین کا اتنا اچھا اوسط اُن کے ساتھ کے لکھنے والوں میں سے بہت کم لوگوں نے پیش کیا ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ پال کا مال نہیں ہے۔ اُن کی کالم نگاری کی مجبوریوں نے انھیں مسلسل لکھنے پر مجبور رکھا ہے۔ خیر گزری کہ انھوں نے فکر تونسوی اور یوسف ناظم کی طرح اپنے ہر کالے اکھشر کو کتابوں میں محفوظ کرنے سے گریز کیا، اور اپنی کتابوں میں مجموعی طور پر اُن تحریروں کو شامل کیا ہے جو قاری کو خوش وقت کرنے میں کامیاب ثابت ہوں۔

ان کے مضامین میں ایسے one liner یا ظریفانہ اقوالِ زرّیں جابجا ملتے ہیں جو برجستگی اور معنوی تہ داری کی بنا پر قاری کے ذہن سے چپک کر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً یہ ایک قول:

○ اس (بات) پر ایک قائد ملت کی یاد آئی، جو اتنے بڑے قائد ہیں کہ کئی بار ملت اُن کے سامنے چھوٹی پڑ جاتی ہے۔'

('ایک اخباری بیان ہو جائے')

اختتاماً: نصرت کے بیشتر مضامین اپنے پڑھنے والوں کو ایک لطیف احساس کے ساتھ تبسم بہ لب اور خندہ جبیں بنائے رکھنے میں اس حد تک کامیاب ہیں کہ اگر آس پاس کسی اجنبی خاتون یا دوشیزہ کی نشست یا گزر ہو تو صنفِ نازک کی غلط فہمی کا خمیازہ قاری کی مسکراہٹ کو گریے میں بھی بدل سکتا ہے۔

aseemkavyani@gmail.com

☆......☆......☆

www.taemeernews.com

فیاض احمد فیضی

نظر فریب شخصیت اور فن کار

جو شخصیت جتنی بڑی ہوتی ہے اتنی ہی نظر فریب ہوتی ہے۔ سماجی تقریبات اور سیاسی گلیاروں میں دن رات یہ شخصیتیں اپنے جلوے بکھیرتی رہتی ہیں۔ ایک دوسرے کے جانی دشمن مسکرا کر گلے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ دشمنی اور عداوت، محبت اور بھائی چارگی کا پیغام دیتی نظر آتی ہیں۔ کسی کی بات پر بھری محفل میں غصہ آ گیا تو بڑے لوگ لال بھبوکا نہیں ہوتے، قہقہہ لگانے لگتے ہیں۔ جو جتنا خوش نظر آتا ہے وہ اتنا ہی غمگین اور افسردہ ہوتا ہے اور جن کے چہرے پر ماتمی چھائی نظر آتی ہے وہ اندر سے اتنا ہی مطمئن ہوتا ہے۔ بڑی شخصیت کے جسم پر جتنا بہترین لباس ہوگا وہ بینکوں اور مالی اداروں کا اتنا ہی بڑا مقروض ہوگا۔ جس کے گھر میں دولت ٹھونس ٹھونس کر بھری ہوگی وہ اتنے ہی سادہ لباس میں محفل میں خاموش بیٹھا ہوگا۔

لیکن نصرت ظہیر کسی بڑی، عظیم الشان شخصیت کا نام نہیں ہے پھر بھی اس ایک شخص میں اتنے متضاد رنگ ملتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک نظر میں دیکھئے تو ہشاش بشاش، صحت مند اور زندگی سے بھرپور۔ قریب جائیے تو پتہ لگے گا کہ زمانے بھر کے غم اپنے اندر چھپائے ہوئے ایک ہفتہ سے بیمار اور اپنے حالات حاضرہ سے سخت ناراض۔ اس شخص کا نام نصرت ظہیر ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی محفل میں سب سے زیادہ خوشحال نظر آنے والا شخص، مگر پتہ لگے گا کہ مہینے کی آخری تاریخیں ہیں، اس لیے جیب خالی ہے۔ تحریروں سے چلبلا، شرارتی نظر آنے والا فنکار، اپنے گھسے پٹے اصولوں کی خاطر اپنے سے سینئرز سے لڑ جانے والے ادیب کے طور پر بھی مشہور ہے۔ دوسروں کے درد میں فوراً دکھی ہو جانے والا نصرت، اپنی تخلیقات سے نقادوں کی بے نیازی کو سگریٹ کے دھویں میں اڑا دینے کا ظرف بھی رکھتا ہے۔ دہلی میں رہنے کے باوجود سیاسی ریشہ دوانیوں سے دور اردو کا ادیب ہونے کے باوجود انعامات کی دوڑ میں سب سے پیچھے، پھر بھی اقتدار میں بیٹھے علما و فصحا میں مقبول، لڑائی بھڑائی محبوب مشغلہ ہونے کے باوجود اپنے سینئرز کا چہیتا۔ ایسی عجوبہ شخصیتیں اردو بازار میں کہاں دکھائی دیتی ہیں؟

بظاہر بااصول نظر آنے والی شخصیت نصرت ظہیر کے ماضی پر نظر دوڑائیے تو پتہ لگے کہ بے اصولی ہی اس کی رہ بر اور رہ نما رہی ہے۔ ورثہ میں شاعری ملی تو میدان سخن میں زور آزمائی کی۔ نوجوانی آئی اور بائیں بازو کی تحریک میں رومان نظر آیا تو اسی کی زلفوں کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ سچے، جھوٹے مقدموں کے سلسلے میں پابند سلاسل ہوتے رہے، مگر پھر آزادی کے خارزار میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیئے گئے۔ بے روزگاری انہیں صحافت کے در پر لے گئی اور اچانک ایک روز قلم گھستے گھستے ان پر انکشاف ہوا کہ وہ کالم نگار بھی بن سکتے ہیں۔ کالم نگاری شروع کی تو اندر چھپے مزاح کے جراثیم ابلنے لگے۔ انہیں پتہ ہی نہیں لگا کہ کب ان پر طنز و مزاح نگار کا لیبل لگا دیا گیا۔ اب یہ حال ہے کہ وہ اس کمبل کو چھوڑنا چاہتے ہیں مگر کمبل ہے کہ کم بخت انہیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

نصرت ظہیر بزعم خود، مزاحیہ مضامین کے چار مجموعوں کے مصنف ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ آج تک انہوں نے ایک بھی مضمون قلم بند نہیں کیا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ اپنے

www.taemeernews.com

مضامین کسی اور سے لکھواتے ہیں۔ اب مزاح نگاری کوئی شاعری تو ہے نہیں کہ میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے۔ مزاح نگاری اتنا مشکل فن ہے کہ اس میں گھوسٹ رائٹر (Ghost Writer) کا گذر ہے ہی نہیں۔ دراصل نصرت ظہیر کے یہ چاروں مجموعہ ہائے مضامین۔ ان کے کالموں کا انتخاب ہیں۔ انہیں کالم نگاری نے اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ وہ باقاعدہ مضامین لکھتے لیکن کتاب شائع کرتے وقت انہوں نے اتنا کڑا انتخاب کیا ہے کہ شک ہی نہیں ہوتا کہ ہم کالم کا مجموعہ پڑھ رہے ہیں۔ دراصل یہ ان کی کالم نگاری کا نقص ہے کہ اس میں صحافت اور ادب کا ایسا امتزاج ملتا ہے جو بہت کم مزاح نگاروں اور کالم نگاروں کو نصیب ہوتا ہے۔

لیکن یہی کالم نگاری نصرت ظہیر کی سب سے بڑی دشمن بھی ہے۔ یوں بھی انہیں دشمن بنانے اور پھر انہیں معاف کردینے کا ہنر آتا ہے۔ کالم نگاری اور اخبارات کی بھیڑ میں ان کا فن جتنا چھپتا رہا، اتنا ہی چھپتا بھی رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان کے نقاد جب برصغیر کے مزاح نگاروں کی فہرست سازی کرتے تو اکثر انہیں بھول جاتے۔ کتابیں انہوں نے شایع ضرور کرائیں مگر اپنی مارکیٹنگ کرنے کی ان میں صلاحیت تھی نہ وقت تھا۔ بیک وقت کئی اخبارات اور رسائل سے منسلک ہونے کی انہیں سزا یہ ملی کہ سر کھجانے کی فرصت ملی نہ اپنا گھر بنانے کی مہلت، (اب سنا ہے کہ انہوں نے اپنا مکان بنانے کا خواب شرمندہ تعبیر کرلیا ہے)۔۔

نصرت ظہیر کا نام سب سے پہلے میں نے اسی کی دہائی میں مجی مجتبیٰ حسین کے منہ سے سنا تھا۔ کہنے لگے' بھئی وہ قومی آواز میں کالم لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھ رہے ہیں'۔ مجتبیٰ حسین کی یہ سند مجھے نصرت ظہیر کا غائبانہ فین بنانے کے لیے کافی تھی اس لیے کہ اس زمانے میں بھی مجتبیٰ حسین کبھی کسی کی غلط تعریف نہیں کرتے تھے، آج بھی نہیں کرتے۔ اس کے کئی برسوں بعد نصرت ظہیر جب زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ جلسے میں ملے تو میں ان سے بہت گرمجوشی سے اور محبت سے ملا۔ نصرت ظہیر میری اس حرکت سے اتنا خوش ہوئے کہ دہلی جاکر جب انہوں نے اپنا کالم لکھا تو میرے مضمون کی اتنی تعریف کی کہ دوسرے ہی روز دہلی سے سید محمد اشرف کا فون آگیا۔ کہنے لگے، بھئی فیضی صاحب! مجھے حیرت ہے کہ نصرت ظہیر نے آپ کے مضمون کی اتنی تعریف کی ہے۔ آپ مجھے فوراً اس مضمون کی کاپی بھیجئے۔ میں خود یقین کرلینا چاہتا ہوں کہ سچائی کیا ہے'۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا، اسے راز ہی رہنے دیں تو بہتر ہے لیکن اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باوجود اس کے کہ نصرت ظہیر کی شخصیت متضاد خصوصیتوں سے بنی اور بگڑی ہے۔ مگر وہ بھی محبتوں کے اسیر ہیں اور کوئی دشمن بھی انہیں ایک بار گلے سے لگالے تو فوراً پگھل جاتے ہیں۔ سنا ہے اسی طرح سے لوگ انہیں گلے لگا کر پچکار کر اپنا کام نکال لیتے ہیں اور پہلی فرصت میں نگاہیں پھیر لیتے ہیں اور نصرت ظہیر غصے سے بے قابو ہوکر پھر ایک کالم لکھ کر تبسم ریزی میں مصروف ہوجاتے ہیں۔

نصرت ظہیر کی تحریروں کو جب پڑھتا ہوں مجھے ان پر رشک آتا ہے کہ وہ کتنی آسانی سے نت نئے موضوعات تلاش کرلیتے ہیں۔ اپنی چار کتابوں میں انہوں نے تقریباً آٹھ درجن موضوعات کو برتا ہے جب کہ عام طور پر مزاح نگار نئے شکار کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے اور مجبوراً اپنے کو دہرانے لگتا ہے۔ نصرت ظہیر کبھی اپنے موضوع کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونے کی کوشش نہیں کرتے لیکن سامنے کی باتوں کو اتنی چابک دستی اور اتنی صفائی سے کسی جادوگر کی طرح اپنی زنبیل سے نکل کر پیش کرتے ہیں کہ قاری کا منھ کھلا رہ جاتا ہے اور جادوگر کی مسکراہٹ پھیلتی جاتی ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ نصرت ظہیر پامال موضوعات کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ لیکن جب لگاتے ہیں تو اسے جاوداں تو نہیں بناتے لیکن اسے اپنی جدت طبع سے دل چسپ ضرور بنادیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ۲۷ سالہ مزاح نگاری کے دور میں صرف ایک طویل

www.taemeernews.com

مضمون 'قصہ پانچ درویش' لکھا ہے جو تیرہ صفحات پر مشتمل ہے اور ان کی کتاب 'نمی دانم' کا بالکل آخری مضمون ہے۔ اگر یہ کتاب آپ کے ہاتھ لگ جائے تو سب سے پہلے یہی مضمون پڑھئے گا اس لیے کہ اتنے پرانے موضوع پر طبع آزمائی کرتے ہوئے ملک کے پانچ سابق وزرائے اعظم کے سیاہ کارناموں کو اپنے دل چسپ انداز میں درویشوں کی سوانح بنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی یادداشت اور طرز ادا دونوں کے لیے بے اختیار واہ نکلتی ہے۔

نصرت ظہیر کی تحریروں میں سادگی اور پرکاری دونوں ہے بیانیہ کے مزاج پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ واقعاتی مزاح کی اونچ نیچ سے بھی بخوبی واقف ہیں اور مکالموں کے ذریعے بھی مسکراہٹیں بکھیرتے ہیں۔ وہ محاوروں کی شکست وریخت سے کم اور سماج کی ناہمواریوں اور بوالعجبیوں سے زیادہ مزاح رنگ پیدا کرلیتے ہیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

''خبروں کے لیے اردو کا قاری بالعموم انگریزی یا ہندی کے اخباروں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اردو اخبار کی ضرورت اسے تب پیش آتی ہے جب اس کا علم ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتا ہے''۔

(ایک اخباری بیان ہوجائے)

'جو جتنا بڑا ہوتا ہے وہ اتنی ہی بڑی بھول کرتا ہے۔ تاریخ ایسے عظیم بھلکڑوں سے بھری پڑی ہے۔ سکندر ہندوستان کا راستہ بھول گیا تھا۔ اشوک کو اپنا لشکر کلنگا لے جانے سے پہلے سابقہ جنگوں کے نتیجے یاد نہ رہے۔ سیزر کو بروٹس کی جاسوسی کرانے کا خیال نہ آیا جس کے لیے اسے بعد میں کافی پچھتانا پڑا'۔

(حافظہ خراب ہے)

'الیکشن کا زمانہ ہو تو اپنے دیش میں یہی برے مسلمان سب کو بھلے لگنے لگتے ہیں۔ پیاز کے بغیر ترکاری اچھی نہیں بنتی اور مسلمان کے بغیر چناؤ کی ہانڈی نہیں پکتی۔ چنانچہ آج کل دونوں کے بھاؤ چڑھے ہوئے ہیں۔ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ پیاز مسلمانوں کی قیمت تک پہنچ گئی ہے یا مسلمان پیاز کے بھاؤ تک بلند ہوگئے ہیں'۔

(مسلمان اور پیاز)

'کئی لوگوں کو بڑے عجیب اور ناممکن قسم کے خواب نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک صاحب نے رات کو خواب میں دیکھا کہ دہلی کی سڑکوں پر خالی بسیں دوڑ رہی ہیں۔ آٹو رکشہ والے ہاتھ کا اشارہ پاتے ہی رکنے لگے ہیں۔ سرکاری دفتروں میں کام رشوت کے بغیر ہونے لگا ہے'۔

(نیند ہماری خواب ہمارے)

'مسلمان دنیا کی واحد قوم ہیں جن کے پاس سوائے ماضی کے اس دنیا کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے اور امریکن دنیا کی دوسری واحد قوم ہے جس کے پاس سوائے ماضی کے سب کچھ ہے اور وہ دنیا کو سب کچھ دے سکتا ہے'۔

(اف یہ درد ملت کا)

☆......☆......☆

www.taemeernews.com

حقانی القاسمی

ایک چہرے والا آدمی

تحریر سے جو تصویر بنتی ہے
وہ نقش بر آب نہیں نقش کالحجر ہو جاتی ہے۔

علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی سے ہی، قومی آواز کے ضمیمہ کے وسیلے سے، نصرت ظہیر کی تحریروں سے اتنی ملاقاتیں رہی ہیں کہ اگر ان سے شخصی ملاقات نہ بھی ہوتی تو ان کی تحریروں سے ان کا ہیولیٰ بنانا مشکل نہ ہوتا کہ ان کی تحریر ہی ان کی شخصیت کا آئینہ ہے

علی گڑھ کا ہر اتوار ان کی تحریروں کے انتظار میں گزرتا تھا۔ جب کبھی ان کی تحریر نہیں ہوتی تھی تو اس کی کمی شمشاد مارکیٹ کی شام بھی پوری نہیں کر پاتی تھی۔ ایسی کئی شامیں نصرت ظہیر کی تحریروں کے بغیر کاٹی ہیں اور یہ اتنی اذیت ناک ثابت ہوئیں کہ کئی راتوں کی نیندیں آنکھوں سے روٹھ سی گئیں۔ میرے حلقۂ احباب کا بھی یہی خیال تھا کہ ان کی تحریر کے بغیر علی گڑھ کی شامِ مصر اور شب شیراز بھی پھیکی پھیکی سی لگتی تھیں۔

علی گڑھ کے در و بام سے رشتہ ٹوٹا تو دلی کے ویرانے میں تھکی تھکی سانسوں کو اتنی تھوڑی سی جگہ ملی کہ جسیں اور شامیں بھی گھٹن محسوس کرنے لگیں۔ دل کی وحشت کسی ایک مسافت پہ ٹھہرنے نہیں دیتی تھی۔ وحشت کے ایسے ہی عالم میں قدم اکثر ان منزلوں کی طرف بڑھتے تھے جنہیں میں علی گڑھ میں خواب کی صورت دیکھا کرتا تھا۔ اخبارات کے دفاتر' مدیروں سے ملاقاتیں، وقت تیزی سے گزرتا گیا اور پھر ایک لمبی جد وجہد کے بعد موہوم سی ایک منزل مل گئی۔ ساؤتھ ایوینو میں اخبار نو کا دفتر... اسی دفتر میں مودودصدیقی صاحب اکثر نصرت ظہیر صاحب کا بڑی محبت سے بلا ناغہ ہر روز ذکر کیا کرتے تھے اور میں بہت انہماک سے ان کی باتیں سنتا رہتا تھا کہ بات ایسے شخص کی تھی جس کی تحریروں سے میں بے پناہ عشق کرتا تھا۔ اور پھر ایک دن یوں ہوا کہ نصرت ظہیر صاحب بذات خود مودود صدیقی کے یہاں جلوہ افروز نظر آئے... میں اس وقت صحافت میں 'مشت غبار' تھا اس لئے نصرت ظہیر صاحب سے اپنے دلی جذبات بیان کرنے کی جرات نہ کر سکا۔ اس وقت صحافت میں نصرت ظہیر کا نام روشن ہوتا تھا۔ ان سے ملاقات کی کئی سبیلیں تو نکلیں مگر ملاقات نہ ہو سکی اور پھر قسمت نے یاوری کی کہ مودود صاحب کے کسی کام سے نصرت ظہیر صاحب کے دفتر جانا ہوا۔ وہیں ان سے پہلی سی ملاقات ہوئی۔ اس ایک ملاقات کی خوشبو اب تک ذہن میں تازہ ہے۔ اس کے بعد کئی جلسوں اور نشستوں میں انہیں دیکھا۔ اب ان کے ذہن میں بھی میری ایک تصویر نقش ہو گئی تھی۔۔

'اخبار نو' سے 'نئی دنیا' میں معمولی ملازمت کے دوران صلاح الدین پرویز سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے 'نئی دنیا' کی نوکری چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور اس کے بعد جو سفر شروع ہوا تو اس کے نتیجے میں سنانے کو توڑتی ہوئی تیسری آواز کا جنم ہوا اور 'استعارہ' معرض وجود میں آیا۔ رسالہ 'استعارہ' میں شریک مدیر کی حیثیت سے میرا نام چھپنے لگا تو میں اچانک ان لوگوں کی آنکھوں اور ذہنوں میں روشن ہو گیا جن کی آنکھوں میں برسوں سے اوجھل تھا۔ استعارہ کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس پر نصرت ظہیر نے اپنے مخصوص انداز میں ایک کالم لکھا مجھے ان کا تبصرہ بے حد پسند آیا۔ انہوں نے لکھا تھا "حال ہی میں جاری ہوا ہے سہ ماہی استعارہ جس کی شناخت ہیں آئینۂ

www.taemeernews.com

والے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ صلاح الدین پرویز ۔ اگرچہ مدیران میں ان کے بعد حقانی القاسمی کا بھی نام درج ہے مگر ان کی حیثیت گواہ کی ہے تاہم مجھے شک ہے کہ ارتکاب جرم میں ان کا بھی کافی ہاتھ ہے۔ (ادبی صحافت کے محاذ پر'ضمیمہ قومی آواز نئی دہلی) یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب اپنی ہر تحریر میں نصرت ظہیر پر جوش جوان نظر آتے تھے اور کئی محاذ پر ان کی جنگ جاری تھی ۔ اور یہ جنگ چھپٹ بھیوں سے نہیں اردو کے دشمنوں سے تھی ۔ نصرت ظہیر چومکھی لڑ رہے تھے اور مخالفین بھی انہیں داد شجاعت دے رہے تھے ۔ یہ واقعتا انہی کا دل گردہ تھا کہ انہوں نے شکست اور ہزیمت قبول نہیں کی ۔ مجھے ان کے یہ تیور اچھے لگتے تھے۔

دلی آنے کے بعد نصرت ظہیر سے کئی کھٹی میٹھی ملاقاتیں رہیں مگر ان کی تحریر اور شخصیت میں کوئی دوئی نظر نہیں آئی ۔ جبکہ بیشتر لکھنے والوں کی تحریریں ان کی شخصیت سے میل نہیں کھاتیں ۔ ان کی تحریروں اور شخصیت کو ملانے کے بعد پتہ چلا کہ نصرت ظہیر کا ایک ہی چہرہ ہے ۔ وہ بارہ چہروں والے آدمی نہیں ہیں ۔

یہی وہ خوبی ہے جس نے نصرت ظہیر سے مجھے اور قریب کر دیا ۔ میں نے ہمیشہ ان کی تحریر میں ان کی شخصیت اور شخصیت میں ان کی تحریر کو دیکھا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کی تحریروں سے بہت سے لوگ برافروختہ ہوئے مجھے اپنی سطح پر برافروختگی کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی ۔ کیونکہ شخصیت میں شفافیت ہو تو ناراضگی اپنا جواز خود کھو بیٹھتی ہے ۔

نصرت ظہیر میں وہ سائکوفنسی کبھی نظر نہیں آئی جو آج کے بیشتر ادیبوں کے ذہنی وجود کا حصہ بن چکی ہے ۔ ان کے یہاں محبت اور نفرت کے دوہرے مفاہیم یا معیار نہیں ہیں ۔ ان کا وجود منافقت کی کثافت سے آلودہ نہیں ہے ۔ وہ محبت میں آگ کا دریا بھی پار کر سکتے ہیں اور نفرت میں آر پار کی جنگ بھی لڑ سکتے ہیں ۔ ان کی کئی ادبی معرکہ آرائیاں بہت مشہور ہوئی ہیں مگر انہوں نے اس پالٹکس کو کبھی پرسنل نہیں بنایا ۔

نصرت ظہیر اپنے طور وطرز کے واحد شخص ہیں ۔ دل میں کسی کے لئے نہ کینہ رکھتے ہیں اور نہ سازشوں کا سفینہ بنانے کا ہنر انہیں آتا ہے ۔ ان کے لئے محبت اور انسانیت ایک دائمی قدر کی حیثیت رکھتی ہے اور اختلاف کی عارضی اور عبوری اہمیت ہے ۔ اختلاف ان کے نزدیک تعلق کو پرکھنے یا ناپنے کا پیمانہ نہیں ہے ۔ ان کی محبت مشورے پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ عملی اقدامات کی منزل تک لے جاتی ہے ۔ کسی بیمار کو وہ شفاخانہ کا پتہ نہیں بتاتے بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے مکمل علاج کے لئے اس میں داخل کرا دیا جائے ۔ وہ اپنی محبت کا ثبوت زبان نہیں عمل سے دیتے ہیں اور محبت میں مفاد کو مدنظر نہیں رکھتے ۔ اپنی ذات سے فیض پہنچانے میں بھی وہ بخل سے کام نہیں لیتے ۔ اس باب میں ان کا وطیرہ اوروں سے الگ ہے ۔

نصرت ظہیر کو میں نے نزدیک سے دیکھا ہے اور دور سے بھی مگر دونوں میں کوئی دوری نظر نہیں آئی ۔ جبکہ اکثر شخصیات میں یہ دوری نمایاں نظر آتی ہے ان کی شخصیت نہ نیم دروں نیم بروں ہے اور نہ ہی دولخت ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں سے میری جتنی والہانہ شیفتگی ہے اتنی ہی ان کی شخصیت سے بھی ہے ۔

میں بہت کم لوگوں سے ذہنی قربت محسوس کرتا ہوں کہ دوغلی ذہنیت سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے مگر نصرت ظہیر سے ذہنی قربت کی وجہ یہی ہے کہ دوسرے ادیبوں کی طرح ان کے یہاں دوغلا پن نہیں ہے ۔ وہ منہ در منہ بات کہنے کی جرات رکھتے ہیں ۔ وہ اس غیبت کدہ کا حصہ نہیں ہے جہاں سیاست اور سازش کے سوا کچھ نہیں ہوتا ۔

میں ان کی تحریروں کے ماضی ، حال اور مستقبل سے بھی ایک خاص لگاؤ رکھتا ہوں ۔ ان کی تحریریں ذہن کو شاداب اور شگفتہ رکھتی ہیں اور عصری آگہی کے دروازے بھی کھولتی ہیں ۔ گول مول اور نیم دانم میری مطالعاتی ترجیحات میں شامل ہیں کہ ان کے یہاں جو پولیٹکل آئرنی ملتی ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی ۔ ان کے سیاسی طنزیے دوٹوک ہوتے ہیں وہ اشارے کنایے میں طنز نہیں

www.taemeernews.com

کرتے۔ وہ براہ راست وار کرتے ہیں۔

ان کی کئی کتابوں سے میری آنکھوں کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ باوجودیکہ وہ طنزیہ مزاحیہ ہیں مگر نصرت ظہیر کی کتاب پڑھتے ہوئے میں بہت ہی سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے مزاح میں سب سے زیادہ سنجیدگی نظر آتی ہے۔ میں ہنسی کے داخلی خارجی محرکات اور اس کی عضویاتی تشکیل، فکریاتی ترتیب، محرکاتی عوامل اور اس کے ساختیاتی عناصر اور جملہ مظاہر وظواہر، عوارض و معارض، عوارف و معارف پہ غور کرنے لگتا ہوں جبکہ مجھے ایک انسان ہونے کے ناطے مسکرانا چاہیے کہ مابعد جدید اصطلاح میں مسکراہٹ حیوان وانسان کا افتراقی نشان ہے۔ انسان ایک ہنسوڑ جانور ہے اور اس جبلت انسانی سے حیوان محروم ہے۔ یہ ایک حد فاصل اور نشان امتیاز تھا مگر بعد میں تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ اس جبلت میں بھی حیوان کا اشتراک ہے یعنی کچھ بندر ایسے ہیں جو نہ صرف ہنسنے پر قادر ہیں بلکہ انسانوں سے زیادہ بہتر انداز میں بہت ہی سلیقہ اور متانت کے ساتھ ہنستے ہیں۔ ہنسی کے ابتدائی، ارتقائی اشکال وظواہر پر غور کرنے کے لیے جب ہنسی کے محققین ومفکرین کی سنجیدہ رائیں پڑھیں تو پتہ چلا کہ ہنسی انسانی اعصاب کی آسودہ حالت کا عضوی اظہار ہے۔ طبی، ما بعد الطبیعاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی تناظر میں ہنسی کے فلسفے پر غور کیا تو علی ابن ربان طبری، ابوحیان التوحیدی، اسحاق بن عمران، ابن مطران کے خیالات بھی نظر سے گزرے جنہوں نے ہنسی کے فلسفیانہ نکات اور جہات پر بہت ہی فکر انگیز روشنی ڈالی ہے۔ بعض لوگ ہنسی کو روح کا تحیر بھی قرار دیتے ہیں تو بعض کے خیال میں ہنسی ایک حیاتیاتی تعیش ہے۔ ہربرٹ اسپنسر نے اسے دماغ کی فاضل قوت کے اخراج کا نام دیا ہے تو تھامس ہابز کی نظر میں یہ اخلاقی شر ہے اور ایمرسن بھی اسے انسانی کمزوری قرار دیتے ہیں۔ ایمانوئیل کانٹ، شوپنہار نے بھی ہنسی کی فلسفیانہ توجیہ کرتے ہوئے کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ برگساں ہنسی کو سماجی اقدار کا محافظ ہی نہیں بلکہ زندگی کی تخلیقی جہت کو بحال رکھنے کا ذریعہ بھی قرار دیتے ہیں۔ فرائیڈ نے اسے توانائی میں بچت کا نظریہ قرار دیا ہے۔ غرضیکہ ہنسی نے وحشیت سے تہذیبیت تک ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ اب اسی تہذیبی مظہریت کا مجموعہ ہے ''بقلم خود'' جس میں نصرت ظہیر کے تقریباً ۲۸ مضامین شامل ہیں اور ہر مضمون اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ ان تحریروں سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نصرت ظہیر طنز ومزاح کے 'اجزائے افاعیل' سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ ان اجزا کے امتزاج سے مزاح کو ایک نئی منطق اور نئے منطقہ سے روشناس کرا رہے ہیں۔ مگر میں نے صرف انہیں مضامین کی قرأت پہ قناعت کی ہے جو ادب سے متعلق ہیں۔ ان تحریروں میں نصرت ظہیر ادب کے ایک بڑے ناقد کی صورت ابھرتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے آج کل کے مکتبی، مدرسی ناقد سے بہت بڑے... ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادب کے جملہ خارجی وداخلی منظرنامے پر ان کی گہری نظر ہے۔ محمد حسن صاحب کو نصرت ظہیر کی شکل میں ریگستان میں نخلستان نظر آیا ہے اور یہ سچ ہے کہ نصرت ظہیر نے نخلستان میں کھڑکیاں کھول دی ہیں جن سے آنے والی تازہ ہواؤں کے جھونکوں سے روح معطر ہوتی ہے اور ذہن سرشار۔ نصرت ظہیر کی خوبی یہ ہے کہ وہ 'سہل ممتنع' میں 'مزاح' لکھتے ہیں اور حسن تعلیل، مراعاۃ النظیر اور دیگر صنائع و بدائع کا بہت ہی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں وہ ضعف تالیف نہیں ہے جو آج کے کچھ مزاحیہ نگاروں کے یہاں بطور علت موجود ہے۔ چند اقتباسات دیکھیں:

''ہمارے چاروں طرف اتنے ادبی ڈاکٹر پیدا ہوگئے ہیں کہ بیچارہ ادب بیمار پڑ گیا ہے۔ جدھر جاتا ہوں ادھر ایک نقاد راستے میں کھڑا ملتا ہے۔ یہاں تک کہ سڑک پر پڑی ہوئی کوئی اینٹ اٹھاؤ تو اس کے نیچے بھی کوئی نقاد موجود ہوگا جو اینٹ کے ہٹتے ہی کہے گا، جناب مجھے اس بارے میں کافکا کی رائے سے قطعی اتفاق نہیں جو اس نے بالزاک پر روسو کی رائے سے سارتر کے اختلاف کے حق میں دی تھی۔''

ایک اور اقتباس دیکھیں۔

www.taemeernews.com

''چند ہفتے بعد ایک روز شام کا کھانا بنانے کے لیے باورچی خانے میں داخل ہونے سے پہلے بندو میاں نے اعلان کیا:

''الحمدللہ! بعد از تحقیق بسیار، یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچا کہ اردو ادب میں سب سے اعلیٰ اردو ادب کتابوں، رسالوں اور اخبارات میں نہیں بلکہ ٹرکوں پر تحریر ہوا ہے۔''

''مثلاً کچھ شعر ایسے بھی ہیں جن سے اردو ادب ٹرکوں کی بدولت ہی روشناس ہوا ہے۔ مثلاً ایک ٹرک نے کہا ہے:

رات تو رات ہے اب دن کو بھی آرام نہیں
وہ مسافر ہوں مری صبح کہیں شام کہیں

یا یہ شعر ہے کہ:

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی فریاد سے
مجھ کو جانا ہے بہت آگے مراد آباد سے

ایک اور ٹرک کہتا ہے:

ہٹ جاؤ بستی والو آیا ٹرک ہمارا
حافظ خدا تمہارا حافظ خدا تمہارا

ایک ٹرک نے تو میاں حد ہی کر دی۔ کہتا ہے:

اے ٹائر لا ہوتی اس عیوب سے موت اچھی
جس عیوب سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اس ٹرک کا دوسرا شعر یہ ہے:

تو جو جھکے تو کچھ نہ ہو میں جو جھکوں خبر بنے
تیری نماز اور ہے میری نماز اور ہے!''

''بہت خوب!''

''یہ تو ہے شاعری۔ دوسرا پہلو ترسیل کا ہے جو آج کے ادب کا سب سے اہم مسئلہ ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ ٹرک کا تو کام ہی ترسیل ہے۔ ترسیل میں آج کا ٹرک آج کے شاعر سے میلوں آگے ہے۔ ہمارے ٹرک جموں کی شاعری کو کنیا کماری اور کلکتہ کے ادب کو بمبئی پہنچا دیتے ہیں اور وہ بھی رات کو ڈپر کا استعمال کیے بغیر۔ بس ان ہی باتوں کو جوڑ جاڑ کر ٹرک اور اردو ادب کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر دیا ہے۔ آگے اللہ مالک!''

''کیا کہنے ہیں۔ تم ضرور تحقیقی ادب میں اپنا نام روشن کرو گے۔'' ہم نے کہا۔

''مگر ایک بات کا مجھے بڑا افسوس ہے بھائی میاں!''

''وہ کیا؟''

''یہ کہ ادب کی اتنی خدمت کے باوجود اردو اکادمیوں نے آج تک کسی ٹرک کو ادبی ایوارڈ نہیں دیا جب کہ ناکارہ اور کھٹارہ چھکڑے اعزازات سے لدے پھندے پھر رہے ہیں۔''

یہ چند سطریں جو اردو تحقیق کی زبوں حالی پر لکھی گئی ہیں پچاسوں صفحات پر بھاری ہیں۔ نصرت ظہیر نے اسی طرح اردو ادیبوں کے امراض مخصوصہ کی تشخیص بھی بہت ہی کاٹ دار انداز میں کی ہے۔ ان کی ہر تحریر سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ادب کے بہت ہی گہرے پارکھ اور نباض ہیں۔ مثلاً ایک مباحثے کی پیروڈی میں وہ لکھتے ہیں اور کتنی سچی صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہیں۔

''ایک نقاد نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ٹائی درست کرتے ہوئے بولا۔

ناول دکان میں فاضل مصنف نے جس طرح عصر حاضر اور عصر غیر حاضر کے نفسیاتی، اعصابی اور روحانی بحران کی عکاسی کی ہے، اس کی دوسری مثال اردو ادب تو کیا افریقی ادب میں بھی مشکل سے ملے گی۔ ناول کا مرکزی کردار اپنی پان بیڑی سگریٹ کی دوکان کو ڈیمالیشن اسکواڈ سے بچانے کے لیے جس طرح ڈی ڈی اے، ایم سی ڈی اور ایم ڈی ایم سی والوں سے جوجھتا ہے اور پھر ویجیلنس سیل اور اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ والوں کی مدد سے ایک ایک کر کے، ان اداروں کے بدعنوان افسروں کو رنگے ہاتھوں پکڑوا کر اخباروں میں سنگل کالمی خبریں چھپواتا ہے۔ اسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مصنف وجودیت کے فلسفے میں گہرا یقین رکھتا ہے جو ایک قابل تحسین بات ہے!''

وجودیت کے ذکر پر دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے ایک نقاد

www.taemeernews.com

کے کان کھڑے ہوئے، جو اوّل الذکر نقاد کے مخالف گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے فوراً اپنے سامنے رکھے مائک کا بٹن دبا دیا اور بولا۔

"معاف کیجئے حاضرین، مجھے اس سے سخت اختلاف ہے۔ ناول دکان میں وجودیت کے فلسفے کا نہیں بلکہ عدم وجودیت کے فلسفے کا اثر زیادہ ہے۔ کیونکہ مصنف نے دکھایا ہے کہ تمام خارجی عناصر پان بیڑی سگریٹ کی دکان سے وجود کو عدم میں تبدیل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بلکہ ایک خارجی عنصر تو وہاں چھولے بھٹورے کی دکان کھولنا چاہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ..."

یہ سنتے ہی پہلے والے نقاد کا پارہ چڑھ گیا۔ مخالف گروپ کے نقاد کی بات کاٹتے ہوئے اس نے کہا۔

"اس سے قطعی ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ عدم وجودیت کی بات ہے۔ ناول کا مرکزی کردار جو کہ ایک یتیم اور بظاہر بے آسرا، تنہا رہنے والی قبول صورت لڑکی ہے، اپنی دکان کے وجود کو قائم رکھنے پر مصر ہے۔ لوگ کہتے ہیں عورت ذات کا بیڑی سگریٹ سے کیا تعلق؟ اس سے لڑکی کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ بپھر جاتی ہے اور خارجی عناصر کی تمام داخلی کوششوں کو ناکام بنا دیتی ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ..."

نصرت ظہیر نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ ادبی بقراطوں کی دستار علمیت کو اچھالا ہے اور ان کی قلعی کھولی ہے۔ سچ ہے اردو کے زیادہ تر ادیب و نقاد کاغذ کے ناؤ پر سوار ہیں اور میں نصرت ظہیر کی محولہ بالا بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ان کے یہ مضامین ادبی مریضوں کے لیے بوعلی سینا، حکیم اجمل خان اور اطبائے مشاہیر کے حاذق اور بیاض کبیر کے نسخوں کی طرح ہیں۔ نصرت ظہیر نے عمل جراحی کا مشکل کام بہت ہی سرلتا سے انجام دیا ہے۔ اور یہ سرلتا بہت مشکل سے ہاتھ آتی ہے۔

haqqanialqasmi@gmail .com
cell : 9891726444

☆......☆......☆

نصرت ظہیر کا عمل جراحی

ڈاکٹر خلیق انجم

کوئی بھی تخلیقی سرگرمی ہو۔ اس کا انحصار تخلیق کار کے موڈ پر ہوتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک فنکار بہت بڑے پیمانے پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے اور کبھی مدتوں فن کی دیوی مہربان نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس کالم نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں پانی پینے کے لیے روز کنواں کھودنا پڑتا ہے۔ کالم نگار کا موڈ ہے یا نہیں ہے۔ اسے کالم لکھنا ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ قاری اس کے کالم کا منتظر ہوتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ کالم نگار سیاسی اور سماجی زندگی کے تازہ ترین واقعات کے تضاد پر اپنے طنز و مزاح کے نشتروں سے عمل جراحی کرے گا۔

یہ عمل جراحی سب سے مشکل کام ہے۔ کیوں کہ یہ کام اس انداز سے کرنا ہوتا ہے کہ قاری کالم نگار کے ذہن' کرب اور درد کو سمجھ سکے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آئے۔

نصرت ظہیر برسوں سے اس عمل جراحی میں انتہائی کامیابی کے ساتھ مصروف ہیں۔ سماجی اور سیاسی مسائل پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ ان کے طنز و مزاح کے نشتروں کی دھار بہت تیز ہے۔ وہ یہ عمل اس مخصوص انداز سے کرتے ہیں کہ خود بھی مسکراتے ہیں اور ان کا قاری بھی مسکراتا ہے اور دونوں اپنی زندگی کے گرد پھیلے تضاد کو محسوس کرتے ہیں۔

تجربے، مطالعے اور بات کہنے کے طنزیہ اور مزاحیہ انداز نے نصرت ظہیر کو ایک ایسا کامیاب کالم نگار بنا دیا ہے کہ اکثر شہ سرخی پڑھنے کے بعد ہم اخبار میں ان کا کالم پڑھتے ہیں۔ ان کے طنز و مزاح سے بحریاب ہو کر پھر باقاعدہ اخبار پڑھنا شروع کرتے ہیں کالم نگار کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہوگی!۔

(بقلم خود)

www.taemeernews.com

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

نصرت ظہیر کے طنز میں بے خودی

نصرت ظہیر کی طنز نگاری میں جداگانہ ذائقہ ہے۔

وہ طنز میں صرف علمی، تاریخی اور فلسفیانہ مضامین شامل نہیں کرتے بلکہ حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں ان کے یہاں ملتی ہیں۔ ان کے بیشتر طنزیے انشائیہ سے قریب ہیں۔ اس لئے کہ نصرت ظہیر کی تحریر میں بے معنی باتیں بھی معنی خیز ہوتی ہیں اور بامعنی باتوں میں مہملیت اور مجہولیت بھی اجاگر ہوتی ہیں۔ لکھتے وقت وہ غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی طنزیہ تحریر کی بے خودی میں ہشیاری اور ہشیاری میں بے خودی پائی جاتی ہے۔

نصرت ظہیر دلنشیں انداز میں زندگی اور انسانی فطرت پر تنقید کرتے ہیں جس میں گہرا مطالعہ اور مشاہدہ ہم دیکھ سکتے ہیں۔ یہ تنقید باقاعدہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں ایک قسم کی ڈھیلی ڈھالی وحدت ہوتی ہے جو اصل موضوع سے مسرت بخش انحراف بھی رکھتی ہے۔ وہ موضوع کو سنجیدہ اور ذمہ دارانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور مواد کو منطقی ترتیب و تسلسل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس منطق سے اظہار کی صناعی سامنے آتی ہے اور معقولیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ مثلاً اکیسویں صدی کے اسٹنگ آپریشن پر روشنی ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہ الیکٹرونک میڈیا کی دین ہے جس میں خفیہ ویڈیو کیمرہ اور مائکروفون کا استعمال کیا جاتا ہے۔

پہلے پہل جب یہ لفظ ان کے کانوں میں پڑا تو انہوں نے سمجھا:

''جس طرح دل اور دماغ کا آپریشن ہوتا ہے یا گردے سے پتھری وغیرہ نکالنے کے لئے آپریشن کیا جاتا ہے اسی طرح کوئی بچھو یا تتیا وغیرہ کسی کو ڈنک مارلے اور مریض کا آپریشن کرنا ضروری ہو جائے تو وہ اسٹنگ آپریشن کہلاتا ہوگا جس کا سلیس ترجمہ 'ڈنک کاری' کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ آپریشن تو دل، دماغ اور پتھری کے آپریشن سے بھی کہیں زیادہ خطرناک اور نازک ہوتا ہے تو ایک انجانا سا خوف دل میں بیٹھ گیا۔''

نصرت ظہیر نے آج کے سلگتے ہوئے موضوعات کو اس اسٹنگ آپریشن میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے کہ فی الوقت ہر طرف بدعنوانی ہے، دہشت گردی ہے، مہنگائی اور کالا بازاری ہے اور فرضی اینکاؤنٹر جیسی بربریت ہے، رشوت خوری اور اینٹی کرپشن والوں کی بے جا مخالفت پر بھی انہوں نے طنز کیا ہے۔ درج اقتباس سے چند حقائق سامنے آتے ہیں:

''جب یہ دیکھا کہ جیل جانے، کرپشن کرنے، کروڑوں روپے کے اسکینڈل میں پکڑے جانے، فرضی اینکاؤنٹروں کی سازش کے الزام میں پھنسنے اور چناؤ پرچار میں اشتعال انگیز تقریریں کرنے پر لعن طعن ہونے وغیرہ کی طرح اسٹنگ آپریشن سماجی اور سیاسی رتبے اور دبدبے کی علامت بنتے جارہے ہیں تو دل ناداں میں یہ آرزو سر ابھارنے لگی کہ کاش کوئی ٹی وی چینل میرا بھی اسٹنگ آپریشن کرلے اور اسے بریکنگ نیوز کے ساتھ نشر کردے تو اپنا شمار بھی قوم کے باعزت فرزندوں میں ہونے لگے۔ بلکہ عین ممکن ہے کوئی پارٹی مجھے چناؤ کا ٹکٹ بھی دے دے۔'' (اسٹنگ آپریشن)

نصرت ظہیر طنز کرتے وقت اپنے اور دوسروں کے تاثرات

www.taemeernews.com

وتجربات کے تقابل کا وسیلہ بھی بنتے ہیں اور اس تقابل کے سہارے زندگی میں رونما ہونے والے حقائق و بصائر تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔لفظ ''ایوارڈ'' دلکش ضرور ہے لیکن نصرت ظہیر نے ہندوستانی حکومت کے ایک بڑے انعام پدم شری اور ریاستی اردو اکادمیوں کے ذریعہ دیئے جانے والے ایوارڈز کی جس طرح بخیہ گری کی ہے اس میں سو فی صد سچائی ہے۔اس تلخ حقیقت کو محسوس کیا جاسکتا ہے اور فکر بیان کی تہہ داری تک پہنچا جاسکتا ہے کہ یہ اعزاز ہر کس و ناکس کو ملنے کی وجہ سے عزت افزائی کی بجائے تخفیف عزت و ذلت افزائی کا سبب بن گیا ہے:

''تسلی کی بات صرف اتنی ہے کہ اردو والوں کو بالعموم بہت کم پدم شری بنایا جاتا ہے اور میں تو چونکہ خاک سے لے کر خمیر تک اور خمیر سے لے کر بوجھل ضمیر تک سارے کا سارا اردو کا پروردہ ہوں کہ مادری کیا فادری زبان بھی اردو رہی۔اردو نے ہی روزی دی ، اردو نے ہی روٹی کھلائی۔ اردو نے ہی گھر کے چولہے کو روشن لگا رکھا اس لئے کم از کم پدم شری بننے کا کوئی خطرہ ویسے بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اس بار بھی جب دھڑکتے دل سے پدم شری یافتگان کی فہرست پڑھی تو یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ نہ صرف مجھے اس ایوارڈ سے محفوظ رکھا گیا بلکہ اور بھی بہت سے اردو کے عزت دار اس ایوارڈ سے بچ گئے ہیں۔البتہ ایک ذی وقار ادیب پکڑ میں آگئے اور انہیں اردو کی خدمت کی سزا کے طور پر یہ اعزاز دے دیا گیا۔سنا ہے تب سے بے چارے ایوارڈ اور منہ چھپائے پھر رہے ہیں۔ اردو کے اس خادم سے مجھے دلی ہمدردی ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ خدا انہیں پدم شری کا ایوارڈ ملنے پر صبر جمیل عطا فرمائے۔''

اردو اکادمیوں کے ایوارڈ کو نصرت ظہیر نے حقیقی تناظر میں دیکھا ہے۔مستند و معتبر مورخ کی طرح انہوں نے اسباب و علل کا عمیق مطالعہ پیش کیا ہے۔ وہ اس موضوع پر یقیناً چشم کشا کی حیثیت رکھتے ہیں:

''انحطاط صرف پدم شری ایوارڈز کی قدر و منزلت میں نہیں آیا ہے، اور بھی بہت سے اعزاز ہیں جو کبھی کے اپنی عزت کھو چکے ہیں۔ ہماری ریاستی اردو اکادمیوں کو ہی لے لیجئے۔وہ ہر سال تھوک کے حساب سے ایوارڈ تقسیم کرتی ہیں۔اردو میں اب ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا ادیب نہیں ملتا جسے کسی نہ کسی اکادمی نے اپنے ایوارڈ سے نہ نوازدیا ہو۔ حالت یہ ہوگئی ہے کہ اکادمیوں کو ایوارڈ کے لئے بے ایوارڈ ادیب ملنا بند ہوگئے ہیں۔ کئی ریاستی اکادمیاں بے چاری کئی سال سے ایوارڈ لئے بیٹھی ہیں اور انہیں ابھی تک نیا شکار نہیں ملا ہے۔ چنانچہ انہیں بجٹ میں ہر سال ایوارڈ کی رقم واپس کرنی پڑتی ہے۔کچھ اکادمیوں نے ایوارڈ دینے کا ایک نیا ہی ڈھنگ نکال لیا ہے۔وہ ہر سال غلط ادیبوں کو غلط ایوارڈ تھمادیتی ہیں۔مثلاً شاعر کو تنقید کا ایوارڈ دے دیا۔نقاد کو تخلیقی ادب کا ایوارڈ تھمادیا۔افسانہ نگار کو صحافی کا ایوارڈ پکڑا دیا۔صحافی پر خطاطی کا ایوارڈ تھوپ دیا۔وعلیٰ ہذالقیاس۔'' (مجھ کو ایوارڈ کی عزت سے بچانا یارب)

نصرت ظہیر سوچتے زیادہ ہیں۔سوچ کی یہ سانگو دتی انہیں دنیا جہان کی سیر کرانی ہے اور حالات حاضرہ سے استفادہ کا موقع فراہم کرتی ہے۔وہ اعتراف کرتے ہیں کہ خدا جھوٹ اور شیطان سچ نہ بلوائے کہ خواب کا عمل در عمل سوچ کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ یہی سوچ انہیں 'سلم ڈاگ ملینئر' نامی ہندوستانی فلم تک لے جاتی ہے جسے آٹھ آسکر ایوارڈ ملے تھے۔تجزیہ کے بعد نصرت ظہیر جس نتیجے پر پہنچتے ہیں اس کے طنز کو محسوس کیا جاسکتا ہے:

''...اور سوچنے لگتا ہوں کہ ہم خواہ مخواہ دن رات اپنی غربت کو روتے رہتے ہیں۔ جواہر لال نہرو نے خواہ مخواہ سوشلزم کا الزام اپنے سر پر لیا۔ بلاوجہ قوم کو دولت مند بنانے کے لئے پانچ سالہ منصوبوں کی صعوبت میں مبتلا کئے رکھا۔فیض، ساحر، منٹو، کرشن چندر بے کار ہی غربت کے خلاف اپنا خون جلاتے رہے۔ کسی کو خیال نہ آیا کہ غربت ہی تو ہمارا سب سے بڑا سہارا ہے۔ مفلسی ہی تو ہماری سب سے بڑی طاقت ہے۔ بے بسی اور بے

www.taemeernews.com

چارگی ہی تو ہمارا سب سے بڑا تماشہ، سب سے اعلیٰ تہذیب اور سب سے شاندار ثقافت ہے جو ہمیں آسکر دلاتی ہے۔'' (جے ہو، غریبی کی!)

نصرت ظہیر انکشاف ذات پر بھی توجہ دیتے ہیں۔ رمی، غیر رمی اور بے تکلفانہ انداز بیان ان کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ وہ داخلیت اور خارجیت کو زیر نگیں کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی اندر کی تنقیدی بصیرت، باہر اور اندر کی کائنات میں مکمل آہنگ پیدا کرتی ہے۔ اس طرح واقعات اور شخصیات کے ناہموار پہلوؤں کی طرف اشارہ ضرور مل جاتا ہے۔ خود نصرت ظہیر بدی اور بدعنوانی سے کوسوں دور ہیں۔ قلم کی دنیا ان کی اپنی دنیا ہے۔ اپنے دیش میں جتنے گھوٹالے ہوئے ہیں خواہ وہ توپ گھوٹالہ ہو، چینی گھوٹالہ، چارہ گھوٹالہ یا تہلکہ گھوٹالہ، ان میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے کہ وہ بدنیت نہیں ہیں۔ ایک واقعہ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

'ایک مرتبہ یوں ہوا کہ پنواڑی سے پان لیا اور جب باقی رقم واپس لے کر چلا تو پایا کہ اس نے بھول سے پانچ کا ایک نوٹ زیادہ دے دیا ہے۔ دل نے کہا، میاں موقع ہے۔ تھوڑی سی بدی کرلو اور چپ چاپ چلتے بنو۔ مگر دل کے اندر جو ایک اور دل ہوتا ہے نا! کم بخت وہ آڑے آگیا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے ڈانٹ دیا کہ ''ابے او نامعقول! بس یہی بدی ملی تھی کرنے کو؟ لعنت ہے تجھ پر، آخ تھو۔'' میں نے رومال سے منہ صاف کر کے پنواڑی کی زیادہ دی ہوئی رقم اسے واپس کردی۔ پنواڑی نے خوشی خوشی رقم واپس لے کر مجھے فوراً یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ اس کے باقی سب گاہک اول درجے کے چور اور بے ایمان ہیں اور ایک میں ہی ایماندار گاہک آج تک اسے ملا ہوں۔ اس کے بعد وہ دیر تک میری تعریف کے پل اور کئی ایکسٹرا پان باندھتا رہا اور پھر بڑی سی پڑیا تھما کر بولا ''میری طرف سے یہ پانچ پان اور رکھ لیجئے اور ان کے پیسے بعد میں دے دیجئے۔ دیکھئے۔ انکار نہ کیجئے گا۔''

وہ تو اپنی طرف سے اصرار کرتا رہا اور میں اپنی ایمانداری پر ہزار لعنت بھیجتے ہوئے دل ہی دل میں یہ حساب لگاتا رہا کہ تعریفوں کے اس پل اور پڑیا کی کتنی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔''

نصرت ظہیر کو ہیرا پھیری کرنے اور بدعنوانی میں ملوث ہونے، دوسرے لفظوں میں بدعنوان بننے کا چسکا نہیں لگا ہے، اگر اسکینڈل کے خوگر ہوتے تو بقول خود:

''جناب اشوک سنگھل، جناب مہنت اویدیہ ناتھ اور جناب پروین توگڑیا سے میرے تعلقات خوش گوار ہوتے تو رام مندر کے نام پر دنیا بھر سے آنے والے اربوں روپے کے چندے میں بندے کے ہاتھ بھی کچھ لگ گیا ہوتا۔ لیکن مجھ ناعاقبت اندیش نے ہمیشہ ان سے اپنے تعلقات سے خراب رکھے اور وہ بھی اس طرح کہ ان حضرات کو اس کی بھنک تک نہیں پڑی کہ کھچڑی پور کالونی میں ایک شخص ان سے تعلقات خراب کئے بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے بے چاروں کو تعلق کی خبر ملتی تبھی تو ترک تعلق کا علم ہوتا۔ مجھ سے تو جناب اتنا بھی نہیں ہوا کہ کسی دن خود ہی ان کے پاس چلا جاتا، اپنا تعارف کراتا اور مطلع کر دیتا کہ جناب عالی میں آپ سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا کیونکہ میں آپ کے سخت خلاف ہوں۔ اس سے کم از کم وہ لاعلمی میں تو نہ رہتے، اور کیا عجب ہے کہ وہ ڈر کر مجھے کھچڑی پور بلاک بی جے پی کا جوائنٹ سکریٹری ہی بنوادیتے۔'' (اکیسویں صدی کی اٹھنی)

نصرت ظہیر نے طنز میں جذبہ اور استدلال کو ایک تحلیلی کیفیت عطا کی ہے۔ وہ اپنے اس طرح کے مضامین میں موضوع کا مرکزی نقطۂ نظر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ موضوع سامنے رہتا ہے۔ اگرچہ کچھ دور چلا جاتا ہے لیکن پھر قریب آجاتا ہے۔ گہرائی کی جہت سے یہ آشنائی شعور کی سطح پر ابھرتی ہے اور قربت کی رو کے ساتھ ناگزیر بن جاتی ہے۔ ان کا ایک طنزیہ ''امروہے کا جو ذکر کیا' ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں شہر، معاشرے کے ذریعہ پیدا کیا گیا ایک خاص ماحول ہے جس میں سماجی رویے ہوتے ہیں۔ امروہہ بھی ایک شہر ہے جسے نصرت ظہیر نے ایک واضح طریقۂ زندگی کی شناخت کے لئے استعمال کیا ہے،

www.taemeernews.com

اس کا اپنا ایک چہرہ ہے جس میں انفرادیت بھری شخصیتیں ہیں اور تہذیب وتمدن بھی ہے، اس شہر کی صورت اور اس کے دل کو آئینہ کرنے کے لئے نصرت ظہیر عوامی قسم کے کرداروں کو پیش کرتے ہیں:

"کہنے کو وہ ہمارے پڑوس میں چائے کی چھوٹی سی دکان چلاتے ہیں جہاں چائے اس قدر عمدہ ملتی ہے کہ بندھے ہوئے گاہک دور دور سے اسے پینے آتے ہیں۔ چنانچہ دکان کافی چلتی ہے۔ لیکن دکان سے بھی زیادہ چلتی ہے ان کی زبان جو ہر ایک موضوع کو فلسفے میں اور ہر فلسفے کو امروہے میں اس طرح تبدیل کردیتی ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی والا معاملہ ہوجاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو مجھے ان کی چائے سے زیادہ ان کی باتوں میں مزا آتا ہے۔ اصلی نام ان کا شبراتی ہے، شب برات کے روز پیدا ہوئے تھے۔ لیکن قابلیت ایسی بلا کی بھری ہوئی ہے کہ کسی نے ایک دن ان کی ناقابل فہم فلسفیانہ باتوں سے جھنجھلا کر کہہ دیا کہ تم شبراتی ہو یا بقراطی، ذرا دیر کو چپ نہیں بیٹھ سکتے؟ یہ سنتے ہی میاں شبراتی نے چائے کا گلاس نہ جانے کس زاویے سے اس شخص کو پکڑایا کہ خود تو اپنی گدی سے لڑھک کر پیچھے گر گئے اور تمام کھولتی ہوئی چائے چھلک کر، بلکہ اچھل کر گاہک کے منہ پر جا پڑی۔ ادھر لوگ میاں شبراتی کو سنبھالتے رہے اور ادھر گاہک درد سے چیختے ہوئے اپنے منہ کو پونچھتا اور اپنے سفید کرتے پر پڑی ہوئی چائے کے داغ رومال سے صاف کرتا رہ گیا۔

بعد میں ہمدرد گاہکوں نے اس شخص کے غیر مہذب انداز پر میاں شبراتی کے اضطراری ردعمل کی خوب خوب تعریف کی۔ لیکن اسی دن سے ان کا نام بقراطی پڑ گیا۔"

امروہہ کے مہان بقراطی کی ذہانت یا باتونی پن کو چسکا لگا کر طنزیہ بنانے کی یہ مثال دیکھئے:

"ایک بار چائے کی دکان کے آگے سڑک پر کوئی بلی کسی گاڑی کے نیچے آکر زخمی ہوگئی۔ پھر کیا تھا، شام ہونے تک کوئی درجن بھر امروہی بلیاں میاں بقراطی کی زبان سے گاہکوں کے منہ جاتی رہیں۔ میں جب پہنچا تو شاید تیرہویں بلی کا ذکر خیر چل رہا تھا "میاں ایسی فہیم شحیم اور نیک اور دین دار بلی نہ اس سے پہلے کہیں دیکھی نہ بعد میں۔ ریڈیو پر کلام پاک آرہا ہوتو اس کے سامنے ایسے خشوع وخضوع سے جا بیٹھتی تھی کہ ہم کھیلتے بچوں کو بھی اسے دیکھ کر شرم آجاتی۔ اذان ہوتے ہی کسی کونے میں دبک کر ایسے بیٹھ جاتی تھی کہ آنکھوں کے آگے سے کوئی چوہا اٹھلاتا ہوا سینہ تان کر بھی گزر جائے تو پلک نہ جھپکاتی۔ اس کے باوجود رعب اور جلال ایسا تھا کہ دوسری بلیوں کے برعکس بڑے شاہانہ انداز میں اس طرح سڑک پار کرتی جیسے کوئی کتا ٹہل رہا ہو۔ بلکہ ایک بار تو آپ یقین نہیں کریں گے میں نے اپنی آنکھوں سے بچشم خود چشم دید منظر دیکھا کہ وہ پیچھے پیچھے تھی اور ایک کتا بچنے کے لئے آگے آگے بھاگا جارہا تھا۔ ارے آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟ بھائی صاحب وہ کہیں اور کی نہیں امروہہ کی بلی تھی۔ خدا بخشے میرے دادا تو اپنے ساتھ اسے حج پر لے جانے والے تھے مگر سعودیوں نے اجازت نہیں دی۔" (امروہے کا جوذکر کیا!)

نصرت ظہیر داخلی انشراح سے معانی پیدا کرتے ہیں اور اظہار کے بطون سے کئی گوشے تلاشتے ہیں۔ قربانی کے بکرے کی یکسانیت میں تنوع کا احساس دلانے کے لئے چھوٹی اور غیر اہم باتوں سے طنزیہ اکتساب کی صلاحیت کا مظاہرہ دیکھئے:

"تم انسان لوگ ڈرتے بہت ہو۔ پیدا ہوئے تو بیماریوں کا ڈر، ذرا بڑے ہوئے تو بڑوں کی ڈانٹ کا ڈر، اسکول گئے تو فیل ہونے کا ڈر، کالج گئے تو بے روزگاری کا ڈر، ملازمت مل گئی تو افسر کا ڈر، خود افسر بن گئے تو اپنے سے بڑے افسروں کا ڈر، اور ان سب ڈروں کا مقابلہ کرکے زندہ بھی رہے تو ہر لمحے موت کا ڈر۔ تم لوگوں کی ایک تہائی زندگی سونے میں اور باقی تین چوتھائی زندگی ڈرنے میں گزر جاتی ہے۔ یعنی سو فیصد زندگی میں مشکل سے ایک دو فیصد جیتے ہوگے۔ اسی سال کی عمر میں بمشکل آٹھ گھنٹے۔" (قربانی کے بکرے)

نصرت ظہیر بدلتے ہوئے رجحانات اور مذاق کا ساتھ دیتے

www.taemeernews.com

ہیں۔ طنز کے حوالے سے بات کرنے کے لئے ان کے یہاں ہر مسئلہ بجائے خود بہت دلچسپ، اہم اور تفصیلی مطالعہ کا متقاضی ہوتا ہے، جس کا احاطہ وہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور واقفیت فراہم کرنے کے ساتھ زبان و بیان، اسلوب و آہنگ اور لب ولہجہ سے بھی آشنا کراتے ہیں۔ مواد کی داخلیت میں ایسی موجودگی تنظیم فکر کی قوت کی وجہ سے ہے۔ مضمون 'ایک صبح کا ذکر ہے' میں انسانی اعضا باتیں کر رہے ہیں۔ زبان اپنی مشکلات بیان کرتی ہے:

''شکایت کیوں نہیں، بلکہ ایک شکایت ہو تو کہوں۔ میرا تو وہی حال ہے کہ بقول شاعر:

افسوس ہے کہ کتنے سخن ہائے گفتنی
خوف فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

شعر سنتے ہی ناک کو زور کی چھینک آ گئی۔ کان نے بھی کہا ''بڑا مشکل شعر ہے بھئی۔''

''کوئی مشکل نہیں۔ بلکہ یہ تو بڑا آسان شعر ہے۔'' بایاں بازو بولا۔

''اچھا تو ذرا آپ ہی سمجھا دیجئے اس کا مطلب۔'' دائیں بازو نے اس طرح کہا کہ جیسے اسے چیلنج کر رہا ہو۔

''بھئی! صاف سی بات ہے، شاعر کہتا ہے کہ بہت سے سخن ہائے گفتنی یعنی کہنے والی کئی باتیں ایسی تھیں جو میں نے اس لئے نہیں کہیں یعنی انہیں ناگفتہ رکھنا پڑا کہ لوگوں میں یعنی خلق میں فساد یعنی جھگڑے کا خطرہ تھا۔ مطلب یہ کہ میں وہ باتیں کہتا تو اس سے لوگوں میں دنگا فساد ہو جاتا۔'' بائیں بازو نے وضاحت سے سمجھایا۔

''اور اس بات کا شاعر کو افسوس ہے کہ فساد نہیں ہوا، لاحول ولاقوۃ'' دائیں بازو نے طنز کیا۔

''ہاں بھئی! یہ شاعر تو بڑا شریر معلوم ہوتا ہے۔ اس بات پر افسوس کر رہا ہے کہ لوگوں میں جھگڑا نہیں کرا سکا۔ توبہ توبہ'' ناک نے برا سا منہ بنایا۔

''کچھ پتا بھی ہے یہ شعر کس کا ہے؟'' بائیں بازو نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا۔

''کس کا؟'' سب بے تابی سے بولے

''ایک شاعر کا'' (ایک صبح کا ذکر ہے)

آج کا مقبول ترین کھیل کرکٹ ہے۔ نصرت ظہیر نے کرکٹ پر بھی کئی طنزیہ مضامین لکھے ہیں۔ یہ کھیل ہندو پاک کے باہمی تعلقات میں جمی برف کو پگھلانے کے کام بھی آتا ہے۔ مذاکرات اور کانفرنس اپنی جگہ پر، مشترکہ بیان کی بھی اہمیت جداگانہ اور مطالبات کی نہ سلجھنے والی گتھی سرکاری سطح کی، لیکن عوام کی دلچسپی اور امید بھی الگ حیثیت کی حامل ہوتی ہیں۔ نصرت ظہیر کی نشتر زنی بھی، حقیقت پر مبنی اور دوسرے طنز نگاروں سے الگ ہے:

''شارجہ میں ہندوستان پاکستان کی ٹیمیں فائنل میں پہنچ گئی ہیں اور بس یہ سمجھ لیجئے کہ ایک قیامت آئی ہوئی ہے۔ امریکہ اور ویتنام کی جنگ کا ذکر آپ نے پڑھا ہوگا۔ ایران اور عراق کی جنگ کے بارے میں بھی سنا ہوگا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی جنگیں اس دنیا میں ہو چکی ہیں مگر ہندوستان پاکستان کی کرکٹ وار کے آگے یہ سبھی جنگیں ہیچ ہیں۔ جب بھی دونوں ملکوں میں کوئی میچ ہوتا ہے تو سب کچھ ٹھہر جاتا ہے۔ لوگ اپنا کام دھندہ بھول جاتے ہیں۔ وہ بھی جو کرکٹ کی الف بے تک نہیں جانتے، اتنی سنجیدگی سے ہندوستان پاکستان کے میچوں پر تبصرہ کرتے پائے جاتے ہیں، لگتا ہے انہوں نے ساری زندگی کرکٹ کی پچ پر پنکھا جھلتے ہوئے گزار دی ہے۔''

کرکٹ کے دیوانے اپنی الگ دنیا رکھتے ہیں۔ سننے اور دیکھنے کے عمل سے گذرتے وقت ان کی جذباتی شدت، مزاج وفطرت میں انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی بے معنی اور بے حقیقت صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نصرت ظہیر کا وسیع وہمہ گیر مشاہدہ دیکھئے:

''ایک مرتبہ ہمارے دفتر میں ایک صاحب بڑی دیر سے ایک کان کو رومال سے دبائے بیٹھے تھے۔ ہم سمجھ گئے، وہ کرکٹ

www.taemeernews.com

کمنٹری سن رہے تھے اور اپنا پاکٹ ٹرانسسٹر انہوں نے رومال سے اس لئے چھپا رکھا تھا تاکہ لوگ بار بار اسکور پوچھ کر ان کا مزہ خراب نہ کریں۔ ہم نے دیکھا ان کے چہرے پر درد اور تکلیف کے بھی آثار تھے جس سے ظاہر تھا کہ ان کی محبوب ٹیم اس وقت خطرے میں تھی۔ ہم سے رہا نہ گیا اور تازہ اسکور جاننے کی ایسی تڑپ دل میں اٹھی کہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔"

''ہمیں افسوس ہے۔'' ہم نے کہا۔

''شکریہ!'' وہ بولے۔

''غم نہ کیجئے! یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔'' ہم نے تسلی دی۔

''جی ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

جی تو چاہتا تھا کہ اب فوراً ان سے اسکور پوچھ لیا جائے مگر ان کے چہرے سے اس قدر تکلیف جھلک رہی تھی کہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی اس لئے ہم نے سوچا کہ انہیں باتوں میں لگا کر دھیرے دھیرے مطلب کی بات پر آئیں گے۔

''ویسے شروع کب ہوا تھا؟'' ہم نے پوچھا۔

''آج صبح ہی، جب دفتر آ رہا تھا تو راستے میں اچانک شروع ہو گیا'' وہ باقاعدہ کراہ کر بولے۔

''اوہ! اب تو لنچ ہونے والا ہوگا۔''

''جی ہاں! دس منٹ اور ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''کون سا اوور چل رہا ہے؟'' ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

وہ عجیب سی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے۔ پھر آپ ہی بولے۔ ''مگر اوور ٹائم تو میں کرتا ہی نہیں۔''

''میں اوور ٹائم کی نہیں، اوور کی بات کر رہا ہوں۔ اب تک تو پینتالیس اوور ہو گئے ہوں گے؟''

''کیا مطلب؟'' وہ ہمیں غصہ سے دیکھنے لگے۔

''مم...... میرا مطلب ہے کہ...... کہ اس وقت کیا اسکور ہوا ہے؟''

''اسکور! وہ داڑھ ہے۔ آپ مجھ سے کرکٹ کی باتیں کر رہے ہیں؟ اور میں داڑھ کے درد سے مرا جا رہا ہوں۔ یہ دیکھئے، پوری داڑھ پھولی ہوئی ہے۔''

انہوں نے منہ کھول دیا۔ تب ہماری سمجھ میں آیا کہ رومال سے دایاں کان اور گال کیوں دبا رکھا تھا۔"

(ذرا اک قیامت کا)

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والے کرکٹ میچ کی ایک اور سچائی نصرت ظہیر اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اب یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ٹمبکٹو اور ہونولولو میں کیسی دشمنی ہے۔ معاف کیجئے، یہاں ہم افریقہ والے ٹمبکٹو اور ہوائی والے، ہونولولو، کا ذکر نہیں کر رہے ہیں، یہ تو اپنے یہاں کے ٹمبکٹو اور ہونولولو کا ذکر ہے جو برصغیر میں ایک دوسرے کی سرحد کے دوسری طرف رہتے ہیں (آپ سمجھ گئے نا، ہماری مراد کن ملکوں سے ہے؟) چلئے اب آگے بڑھیے۔ دونوں میں جب بھی کرکٹ سیریز ہوتی ہے تو میدان پر ان کا میچ سات آٹھ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ مگر میدان کے باہر ملک کے شہروں اور گلی کوچوں میں یہ میچ کئی روز چلتا رہتا ہے بلکہ کئی بار تو دنگا فساد بھی ہو جاتا ہے؟''
(فضلو میاں کی کرکٹ کمنٹری)

آج کی زندگی کے انتشار کی تہذیبی اہمیت پر نصرت ظہیر کی گہری نظر ہے۔ وہ عوامی تہذیب کے نجوگ کو میکانکی تمدن کے زور شور میں وسیع معنی سے مصور کرتے ہیں لیکن طنز کی اشاریت سے حدود مکان و زماں کو اعتبار بخشتے ہیں۔ اس طرح عہد آفریں مفسر بن کر نکتہ رسی کے نباض بنتے ہیں۔ اسلوب و زبان کی اجنبیت ان کے یہاں نہیں ملتی بلکہ ان کے طنزیہ جائزہ میں الفاظ اور جملے کا آئینہ زیادہ روشن ہے۔ اظہار میں تنقید کے حق آزادی کی ہنرمندی ان کے یہاں خوب ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طنز میں لپٹا ہوا جمہوری اور انسانی قدروں کا احساس کسوٹی بنتا ہے سماجی تقاضوں کا، ہم آہنگی کا اور اندرونی اور بیرونی احتساب کا۔ ان کی تحریر میں فطری پن ہے اور اشاریت بھی ہے ساتھ ہی موضوعات میں نفسیاتی اضطراریت ہے۔

☆......☆......☆

www.taemeernews.com

اسد رضا

ادیب باشمشیر۔ نصرت ظہیر

دور حاضر کے معروف طنز و مزاح نگار اور شاعر نصرت ظہیر کی تحریروں سے قومی آواز کے صفحات پر تعارف پہلے ہوا اور بالمشافہ ملاقات بعد میں ہوئی۔ 1987 میں جب ان کا نام اخبار کے کالم 'دلّی ڈائری' میں پڑھا تو ''جانے کیا کیا گمان ہونے لگے'' اور ہم تصور میں اس حسین دوشیزہ نصرت سے ملنے کا منصوبہ بنانے لگے، جنہیں طنز و مزاح کی چاشنی، زبان کی شگفتگی اور بیان کی نشتریت ضرور اپنے والد بزرگوار ظہیر صاحب سے وراثت میں ملی ہوگی۔ بہر حال ہم نصرت ظہیر کی تحریر اور تصوراتی تنویر کے عاشق ہو گئے تھے۔ لہٰذا ایک روز ہم نے بڑے ارمان سے قومی آواز کے دفتر میں قدم رکھا اور اسٹاف کے لوگوں سے نصرت ظہیر کے بارے میں دریافت کیا تو ایک صاحب نے دائیں کمرے کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''آپ ان سے وہاں مل سکتے ہیں''۔ ہم دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے جہاں دو سانولے نوجوان کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان ہمارے دوست معروف شاعر و صحافی جناب چندر بھان خیال تھے جنہوں نے اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا ''نصرت صاحب، ہمارے دوست صحافی و شاعر اسد صاحب سے ملئے'' اور ہم نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ نصرت ظہیر سے ہاتھ ملایا، لیکن بتدریج نصرت صاحب سے ہمارے تعلقات بڑھتے گئے کیونکہ فکر تونسوی کے بعد قارئین کو اگر کسی کالم نگار نے متاثر کیا تو وہ نصرت ظہیر ہیں۔ ان کے قلم کی حقیقت بیانی اور طنز کی نشتریت کے حامل جو کالم چھپتے ہیں وہ نہ صرف مجھے بلکہ اردو کے عوام و خواص قارئین کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ نصرت ظہیر بڑے بڑے لیڈروں، وزیروں، اماموں، مولویوں، افسروں اور سڑے گلے نظام کا نہایت بے باکی سے خوب خوب مذاق اڑاتے ہیں۔ طنز کے تیر برساتے اور مزاح کی کلیاں مہکاتے ہیں، لیکن اب وہ قدرے سنجیدہ ہو گئے ہیں اور نکسل باڑی تحریک کے اثر سے نکل کر اعتدال پسند ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی سے متاثر ہیں۔ لہٰذا نصرت ظہیر کے طنز و مزاح اور شاعری میں بھی اب زیادہ گہرائی، گیرائی اور سنجیدگی محسوس ہونے لگی ہے۔ اپنے کالموں اور حکایتوں میں وہ واقعات و حالات کے ساتھ ساتھ الفاظ و اصطلاحات سے بھی کھیلتے ہیں اور تصرف بجا و ترمیم باصفا سے لطف و انبساط پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ان کی لفظیات اور اصطلاحات 'سابق شاعر'، 'خرانٹوں کا مشاعرہ' وغیرہ وغیرہ۔

ادیب باشمشیر نصرت ظہیر نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں معاشرہ میں پھیلی بدعنوانیوں، ریاکاری اور مکر و فریب کو شمشیر قلم سے بے نقاب کیا ہے۔ پروفیسر، ناقد، وزیر کبیر، افسر باتدبیر، سرمایہ دار، سرکار، مولوی، پنڈت، سیاسی پارٹیوں، سماجی تنظیموں اور معاشی استحصال کرنے والوں پر اپنے شمشیر صفت قلم سے قابل ستائش وار کیے ہیں اور یہ سلسلۂ شمشیر زنی ہنوز زور و شور سے جاری ہے۔ درحقیقت یہ کہنا مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ نصرت صاحب کے کالم اور مضامین دور حاضر کی سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی تاریخ ہیں۔ چونکہ وہ ترقی پسند ہیں لہٰذا جدیدیوں کی طرح خیالی طوطا مینا نہیں بناتے اور نہ ہی وہ حصار ذات میں قید ہیں، بلکہ زندگی کی تلخ سچائیوں اور واقعات و تجربات کو دلچسپ اسلوب میں پیش کر کے وہ قارئین کو نہ صرف محظوظ کرتے بلکہ انہیں سوچنے پر

www.taemeernews.com

مجبور بھی کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے نصرت ظہیر کے متعدد کالم اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین ملک کے مؤقر اخبارات نے اکثر نقل کیے ہیں۔ ان کی اس ادبی کامیابی کے پیش نظر ہی پروفیسر محمد حسن، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر ظہور محمد خاں، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر اسلم پرویز، شجاع خاور وغیرہ جیسے مشاہیر نے نصرت صاحب کے فن واسلوب پر اظہار رائے کیا اور مضامین تحریر کیے۔

نصرت ظہیر کی شمشیر نما تحریر کا ہی اثر ہے کہ اس طنز ومزاح نگار کی بات چیت اور برتاؤ میں بھی تلوار کی کاٹ آجاتی ہے اور کچھ لوگ انہیں مغرور، منہ پھٹ اور شمشیر برہنہ وغیرہ کہنے لگتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کوئی بات دل میں نہیں رکھتے بلکہ ان کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے وہی زبان پر بھی ہوتا ہے۔ یہ الفاظ دیگر نصرت ظہیر سیاستدانوں کی طرح دوغلے نہیں، نہ ان کی دوستی دورخی ہے اور نہ دشمنی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ مرحوم باقر مہدی کی طرح صاف گو ہیں تو یہ ہرگز مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ وہ میرے دوست ہیں لیکن کئی بار ہم دونوں میں لفظی جنگ یعنی بحث بھی ہوجاتی ہے۔ اب یہ بات دیگر ہے کہ دل صاف ہونے کی وجہ سے بہت جلد یہ جنگ، محبت میں تبدیل ہوجاتی۔ دراصل حقیقی فن کاروں کی عادت بچوں جیسی ہوتی ہے، پل میں روٹھنا اور پل میں مان جانا۔ نصرت صاحب اگرچہ سائنس کے طالب علم نہیں رہے لیکن ان کی فکر سائنسی، سیکولر اور معروضی ہے۔ وہ ہر قسم کی مذہبی ومسلکی نفرتوں، ذات برادری نیز علاقہ سے متعلق تعصب کے سخت مخالف ہیں اور صحت مند اقدار کے حامل معاشرہ کے متمنی ہیں جس میں کسی قسم کا استحصال نہ ہو۔ نصرت ظہیر روایت کا احترام تو کرتے ہیں لیکن روایت پرست نہیں ہیں۔ ان کے نظریات وافکار کا آئینہ، وہ کالم اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین ہیں جو مختلف اخبارات ورسائل اور کتابوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ 'تحت اللفظ'، 'ابن بطوطہ کا دوسرا سفر'، 'بقلم خود'، 'خراٹوں کا مشاعرہ' اور 'نمی دانم' وغیرہ کے عنوانات سے نصرت ظہیر کی کتب اردو دنیا میں کافی مشہور ہوچکی ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے معروف صحافی جناب افتخار گیلانی کی کتاب کا اردو میں ترجمہ بھی کیا جس پر انہیں ساہتیہ اکادمی کا انعام برائے ترجمہ بھی دیا گیا۔ ان کی کتابوں کو دہلی اور اتر پردیش کی اردو اکادمیوں نے ایوارڈ سے بھی نوازا۔

نصرت ظہیر ایک بیباک صحافی بھی ہیں۔ 1972 میں انہوں نے بطور صحافی فیصلہ ویکلی سے سفر شروع کیا اور عقاید ویکلی، آئینۂ حیات ویکلی، ملاپ، تیج، قومی آواز، اور عالمی سہارا میں اپنی صحافیانہ صلاحیتوں کا شاندار مظاہرہ کرنے کے بعد وہ آج کل قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے ادارتی شعبے کے سربراہ ہیں۔ علاوہ ازیں نصرت ظہیر سہ ماہی 'ادب ساز' کے مدیر بھی ہیں۔ وہ اس مجلہ کے کئی یادگار نمبر بھی شائع کرچکے ہیں۔ مثلاً 'ادب ساز' کا 'ساحر لدھیانوی نمبر' خاص طور پر بہت مقبول ہوا۔

نصرت ظہیر چھوٹی چھوٹی باتوں کے علاوہ بڑی بڑی باتوں پر بھی اپنی شمشیر قلم سے لڑتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر گزشتہ دہائی کے نصف آخر میں آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے اردو خبرناموں میں بربنائے لسانی تعصب صدر جمہوریہ کے لیے راشٹرپتی، وزیر اعظم کے لیے پردھان منتری، وزیر اعلیٰ کے لیے مکھیہ منتری کہا جاتا تھا۔ نصرت ظہیر نے اس تعصب کے خلاف قلمی جہاد کیا اور اپنے کالموں میں اردو زبان کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی بلکہ تنگ نظری پر بہت گہرا طنز کیا۔ ان کی اور ہم جیسے دیگر اردو والوں کی کوششیں رنگ لائیں اور مرکزی حکومت نے اردو خبرناموں میں عہدوں کے نام اردو میں ہی دینے کا سلسلہ شروع کروایا۔ شکر ہے کہ اب آکاش وانی اور دوردرشن کے اردو پروگراموں میں جناب کی جگہ 'شری' یا محترمہ کی جگہ 'شریمتی' نہیں بولا جاتا۔ شاید اسی لیے نصرت ظہیر کی قلمی شمشیر زنی کے باوجود اردو والے انہیں محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انہیں اعزازات وانعامات سے بھی نوازتے رہتے ہیں۔ انہیں پریس اکریڈیشن کمیٹی دہلی حکومت، دہلی اردو اکادمی، پریس کلب آف انڈیا وغیرہ کا رکن بھی بنایا گیا ہے۔

www.taemeernews.com

○ اوکھلا کی یہ بستی کبھی جمنا کے کنارے ہوا کرتی تھی، آج کل جمنا خود اس کے کنارے بہتی ہے۔
(چاند کے پار چلو)

○ شاعری (شاعری)، شاہی امام اور شاہی دسترخوان یہی تو ہماری کمزوریاں ہیں۔
(کہت کبیر سنو بھئی سادھو)

○ مسلمان کا حساب سیدھا ہے، الیکشن ہوں تو مہنگا ہو جاتا ہے اور الیکشن گزر جائیں تو کوئی دھیلے کو نہیں پوچھتا۔
(مسلمان اور پیاز)

نصرت ظہیر نثر میں طنز ومزاح نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے ہیں۔ پتہ نہیں مرزا اسد اللہ خاں غالب تا اسد رضا یہ طنز ومزاح نگار عموماً شاعری کے بعد ہی طنز ومزاح پر کیوں نظر التفات کرتے ہیں۔ فکر تونسوی، ابن انشا، مشفق خواجہ اور اب نصرت ظہیر میدان شاعری سے ہی مقتل طنز ومزاح میں کیوں آئے؟ بہر حال نصرت صاحب شروع میں رومانی پھر انقلابی اور اکیسویں صدی میں مابعد جدید اشعار لکھتے رہے ہیں۔ ابتدائی شاعری پر داغ دہلوی کے اثرات ملاحظہ فرمائیں۔

درد بھی بخشتی ہے لذت بھی
ہائے کیا چیز ہے محبت بھی

کوئی گل چیں ہے نہ صیاد بڑی مشکل ہے
کس سے اب کیجئے فریاد بڑی مشکل ہے

نصرت ظہیر ترقی پسند شعرا بالخصوص فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مخدوم وغیرہ سے کافی متاثر رہے اور ان کی شاعری پر بھی ترقی پسند تحریک کے اثرات مرتب ہوئے۔ تاہم ان دنوں ان کی شاعری میں فنی لوازمات، ادراک کی گہرائی، فکر کی بلندی اور جذبات واحساسات کی گیرائی کے ساتھ ساتھ ایک دلکش توازن بھی ہے۔ نصرت کے یہ اشعار دیکھئے۔

موجوں نے کردیا تھا بلند اس قدر اسے
نیچے گرا تو اور بھی گہرائیوں میں تھا

کھڑا ہوں بھیڑ میں تنہا اور اس خیال میں ہوں
کوئی تو پوچھنے آئے گا کیسے حال میں ہوں

زندگی ہے سانپ اور سیڑھی کا کھیل
ایک خانہ درمیاں ہے ہر طرف

زندگی کے نشیب وفراز، بلندی، پستی، ہار جیت، جذباتی کشاکش سب کچھ نصرت ظہیر کی شاعری میں ہے لیکن منفرد لہجے میں۔ ان کے اس شعر پر غور کیجئے۔

تو، مجھ سے ہار کے نادم ہے پر یہ سوچ ذرا
کہ فائدہ تو ترا میری ہار میں بھی نہ تھا

نصرت ظہیر بطور شاعر زیادہ کامیاب ہیں، یا بطور طنز ومزاح نگار؟ اس سوال کا جواب تو مستقبل دے گا یا ناقدین کرام اس سلسلے میں فتوے صادر فرما سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا شعری سفر اور طنز ومزاح نگاری دونوں جاری ہیں لہٰذا یہ سوال قبل از وقت ہے کہ وہ شاعر اچھے ہیں یا طنز ومزاح نگار؟ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں نصرت ظہیر نے حیدرآباد، دہلی، ممبئی اور دیگر بڑے شہروں میں طنز ومزاح کی کانفرنسوں میں حصہ لیا ہے وہیں وہ سعودی عرب اور دیگر ممالک میں معرکۂ شاعری بھی سر کر چکے ہیں۔ بہر حال ہماری تو دلی خواہش ہے کہ وہ دونوں میدانوں میں اپنی کوششیں کامیابی کے ساتھ جاری رکھیں۔

جہاد قلمی ہمیشہ رہے ترا جاری
خدا کرے تری شمشیر لفظ کند نہ ہو

☆

E-11/47، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی-17
9873687378
asadrnaqvi@yahoo.co.in

www.taemeernews.com

ظفر عدیم

نصرت ظہیر: ایک بے نظیر شخصیت

صلاحیت واستعداد کی ہمہ جہات ،تحریر ونگارش کی بالمجموع خصوصیات،خوش خلقی وخوش طبعی کی تمام تر صفات، یہ سارے عناصر جس پیکر کی تشکیل کرتے ہیں، وہ پیکر میرے نزدیک جناب نصرت ظہیر کی مکمل شخصیت ہے۔ایک ایسی شخصیت کے بارے میں لکھنا زیادہ مشکل ہے جو کسی بھی تعارف کی محتاج نہ ہو چہ جائیکہ ظفر عدیم جیسا حقیر وہیچ مداں لکھنے کی جسارت کرے جو اردو ادب میں خود محتاج تعارف ہے، بریں سبب کہ ایسی شخصیت سے وابستگی اس کے ہونے کی سند بن سکتی ہے، اسی نیت سے میں اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ بکھیرنے کی جرأت کررہا ہوں۔

جناب نصرت ظہیر کے باوثر ڈیل ڈول ،بھاری بھرکم دستِ مصافحہ، بارعب لہجہ اور انداز تخاطب سے مجھ جیسا کوئی بھی شخص دورانِ ملاقات نروس ہوسکتا ہے لیکن چند منٹوں بعد ہی ہم کلامی کا وقفہ جیسے جیسے طویل ہوگا، وہ اس خوشگوار احساس سے متعجب ہوئے بغیر نہیں رہ پائے گا کہ نصرت صاحب کے چہرے پر جو معصومیت نظر آتی ہے وہ ان کے مزاج کا پرتو ہے یا ان کے مزاج میں جو حلم ہے، وہی ان کے چہرے پر منعکس ہے۔ان کے خلوصِ گفتار کی مٹھاس رفتہ رفتہ ان کے لہجے کے رعب کو آپ ہی آپ فرو کردیتی ہے، پھر جناب نصرت کی شخصیت اتنی بھولی اور پیاری بن جاتی ہے کہ ان سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہے گا۔ان سے میری پہلی ملاقات جہاں تک یادداشت کا بھروسہ ہے،70 کے دہے کے اواخر یا80 کی دہائی کے اوائل میں دہلی کے اردو روزنامہ ''تیج'' کے دفتر (نیا بازار) میں ہوئی تھی، میں اس اخبار میں ملازم تھا اور نصرت صاحب کو بطور خاص بلا کر اخبار کے ضمیمہ (حصہ ادب) کی نگرانی اور ادارت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔''تیج'' میں آنے سے پہلے وہ روزنامہ ''ملاپ'' (دفتر بہادر شاہ ظفر مارگ) سے وابستہ تھے اور وہاں بھی وہ اخبار کے میگزین کے نگراں تھے۔ نصرت صاحب ان خوش نصیبوں میں ہیں جو روزگار کی تلاش میں سرگرداں نہیں خود روزگار جن کے تعاقب میں رہتا ہے۔''ملاپ'' کے مالک اور مدیر نے نصرت صاحب کو ان کے وطن سہارنپور سے خط لکھ کر بلایا تھا۔تب سہارنپور میں کالج یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عام طور پر کیریئر میں جو قبل از ملازمت ومصروفیت ٹھہراؤ یا اسٹرگل کا وقفہ آتا ہے، ایسے ہی کچھ وقفے کے دوران وہ کمیونسٹ تحریک سے پوری طرح وابستہ ہوگئے گویہ سرگرمیاں طالب علمی کے دور سے تھیں وہ باضابطہ کمیونسٹ پارٹی کے''بارسیہ'' رکن بن گئے تھے۔ بیدار سماج کے احتجاج کے نتیجے میں جب حکومتی ردعمل بھی اسی تناسب میں شدید ہوا تو آزادی اور حق کے تقاضے نے احتجاج کو''انقلاب پسندی'' سے ہم کنار کردیا،نتیجتاً اس دور کے جن انقلاب پسندوں اور انقلابی نوجوانوں کو گیرودار کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا ان میں ایک نصرت ظہیر صاحب بھی تھے۔کمیونسٹ تحریک نے ہر دور میں بیدار سماج کو اپنی طرف راغب کیا ہے۔کمیونسٹ پارٹی کی تقسیم سے پہلے کے لوگوں میں اس تحریک کے تئیں جو رغبت تھی، وہ ذہن پر ایک ایسی چھاپ بن گئی جو آج بھی کمیونسٹ تحریک کی معنویت اور تاثیر ختم یا تبدیل ہوجانے کے باوجود باقی ہے اور نصرت ظہیر صاحب کے دماغ پر اس کی کچھ زیادہ ہی گہری چھاپ ہے جو انھیں واقعیت پسند اور منکسر المزاج بناتی ہے۔اس دور نے اردو ہندی ادب اور دونوں زبانوں کی صحافت کو ڈھیروں موضوع ومواد دیے۔ ان دنوں نصرت ظہیر جتنے جوان تھے، اس کی مقدار سے کہیں زیادہ ان میں جوشِ جوانی تھا، وہ جوشِ جوانی جو اکثر حساس اور جذباتی انسانوں کو تغیر پذیر خلافِ مزاج حالات سے دو آتشہ کردیتا ہے۔یہی وہ دور تھا جب جناب نصرت کی تحریر وتخلیق اترپردیش اور دہلی کے اخبارات ورسائل میں شائع ہوئی تو زمانہ ایک ایسے اہل قلم سے روشناس ہوا جس کے درد میں ابتسام، جس کے تبسم میں تلخی اور جس

www.taemeernews.com

کے فکر و ادراک میں سسٹم پر چوٹ کرنے والا مہذب طنز تھا۔ ایسے مضامین ''ملاپ'' میں بھی شائع ہوئے، اگر چہ اس اخبار کا مزاج نصرت صاحب کے نظریاتی نظام سے مطابقت نہیں رکھتا تھا لیکن جو ہرشناس اہالیانِ اخبار نے ان کے اندر ایک ''محنت کش'' انسان کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے انھیں سہارنپور کے منجمد ماحول سے نکال کر دہلی کے شب و روز کے سیال سیماب میں تحلیل کر دیا تو ان کے اندر کا وہ ''مزدور'' صحافت و ادب کا ایک معتبر مقیاس، ایک معتدبہ پیمانہ بن گیا۔

نصرت ظہیر صاحب انتہائی جذباتی واقع ہوئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ایسے لوگ صاف دل، انسان دوست اور بے ضرر ہوتے ہیں اور اپنے جذبات کی شدت سے خود ہی مجروح ہونا پسند کرتے ہیں، ایسے لوگ اکثر دور رس بھی ہوتے ہیں اس لیے زود رنج بھی ہوتے ہیں۔ حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتے کہ حالات کے تابع ہونا نہیں چاہتے۔ ایسے لوگوں کو زندگی کے مشکل ترین ، نامساعد اور صبر آزما اطراف و اکناف میں بھی ان کی خود اعتمادی سنبھالے رکھتی ہے۔ اخبار ملاپ میں نصرت صاحب حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور وہاں کی ملازمت چھوڑ دی۔ وہ اپنے اوپر کسی کو حاوی ہونے نہیں دیتے اور جب وہ ایسی سچویشن سے دوچار ہوتے ہیں تو ان کا Instinctive Escapism انھیں جھکنے نہیں دیتا تو وہ وقار کے ساتھ اس سچویشن سے دستکش ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ''تیج'' والوں نے انھیں اپنے یہاں بلا لیا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک ہفتہ بھی بے روزگار نہیں رہے۔ ''تیج'' میں بھی انھوں نے اپنی شرطوں پر ملازمت کی۔

جناب نصرت ظہیر عملی زندگی کے آغاز سے ایک طویل مدت تک اخبارات سے وابستہ رہے اس لحاظ سے وہ ایک تجربہ کار صحافی ہیں، چونکہ مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے اس لیے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں بلا کا نیوز سینس ہے مگر صحافت یا اخبار نویسی کو کبھی انھوں نے دل سے اختیار نہیں کیا، جس اخبار میں بھی رہے، اس کے ادبی ایڈیشن کو اپنا دائرہ کار بنایا۔ یہ ان کا مزاج ہے۔ دراصل وہ فطرتاً Man of Letters ہیں اس لیے Prone to Incidents نہیں ہوئے۔ ''ملاپ'' میں وہ نیوز ڈیسک پر اور ''تیج'' میں میگزین سے وابستہ رہے البتہ جب وہ ''قومی آواز'' میں آئے تو وہاں ہفت وار ضمیمہ یا ادبی ایڈیشن کا کوئی باقاعدہ نظم نہیں تھا اور نظم تھا بھی تو شاید نصرت ظہیر صاحب نے کسی وجہ یا مصلحت سے دور رہنا پسند کیا۔ ''قومی آواز'' میں وہ رپورٹنگ سیکشن کے سربراہ تھے۔ یہاں انھیں مجبوراً جو ''خبرسازی'' کرنی پڑتی اسے وہ گوارہ اس لیے کر رہے تھے کہ رپورتاژ میں کچھ تخلیقی لذت اور ادبی چاشنی ضرور ہوتی ہے اور تحریر کسی اصل کی پابند ہوکر نقل کاری کی علت سے پاک رہتی ہے جبکہ خالص ''خبرسازی'' نیوز ایجنسیوں کے ارسال کردہ اقتباسات و حواشی کی محتاجی میں طبع زاد نہ ہوکر چربہ بن جاتی ہے پھر یہ کہ خبرسازی کے ساتھ نادیدہ واوین میں ایک تاکید بھی قلم گیر رہتی ہے کہ ''اردو اخبار کی کامن مین ریڈرشپ ہے۔'' اور ذمہ داران دبی زبان میں اس کی وضاحت کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ ''اخبار چائے خانوں میں پڑھا جاتا ہے لہٰذا زبان چائے نوشوں والی ہونی چاہیے ......'' ان کا اشارہ اس چائے کی طرف نہیں ہوتا جس کی پیالی یا پاٹ ٹرے میں رکھ کر کوئی باوردی بیرا میز تک پہنچاتا ہے، بلکہ وہ چائے مقصود ہوتی ہے جو گندے پانی سے کھنگالی گئی پیالی یا گلاس میں انڈیلی جاتی ہے اور اسے کوئی میلا کچیلا بچہ ہاتھ میں لے کر ہاتھ میں تھما جاتا ہے۔ اس ''تاکید'' کے پس پشت کارفرما ذہنیت ایک الگ موضوع بحث ہے اور یہاں موضوع وہ ''زبان و بیان'' ہے جو نصرت ظہیر صاحب کے ادب کا خاصہ ہے۔ انھوں نے خالص ''خبرسازی'' کا پیشہ ورانہ شعار یہی سوچ کر نہیں اپنایا کہ انھیں تخلیقی زبان و بیان پر سمجھوتہ کرنا پڑتا۔ اردو زبان عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ کے امتزاج کی شائستگی اور ان کی تلفظاتی شستگی نیز عام مروجہ بولیوں کے مہذب فقروں اور محاوروں کی اپنی سنسکرتی کی وجہ سے شیریں ہے، یہ دنیا کی واحد زبان ہے جو ساری زبانوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے جبکہ دنیا کی سب سے مروج العام زبان انگریزی، ''فرنچ'' کے علاوہ جرمن تک سے زیادہ مصالحت اور مروت نہیں کر سکی ہر چند کہ اردو نے انگریزی اور فرنچ الفاظ کو بھی اپنے تمدن اور کلچر کے رنگ میں رنگ

www.taemeernews.com

کر ہم جنس وہم زاد بنالیا۔ نصرت ظہیر صاحب کا ذریعہ اظہار بھی وسیع القلب زبان ہے اور ان کی تحریر، اردو کی ترکیب خلق کے سارے اجزا سے مزین اور مرصع ہوتی ہے۔ ہاں جہاں تک ''بیان'' کا تعلق ہے تو یہ ان کے یہاں محض اظہار یا ذکر کے فرہنگی پیرایے تک محدود نہیں بلکہ ان کی تخلیق و تحریر میں بیان، ایسا لگتا ہے کہ از روئے فطرت ایک علم بن گیا ہے۔ اس علم کے عناصر کو اس طرح برتا جیسے قدرت نے ہی انھیں تشبیہ، استعارہ و کنایہ کو طنز و مزاح کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے بنایا تھا ان کی یہ صلاحیت خداداد ہے۔ طنز و مزاح کے ادب کی تجزیاتی تحقیق کی جائے تو اس کا Essence تشبیہ، استعارہ، مجازاً کنایہ ہے۔ طنز و مزاح نگار، تنقید نگار ہو سکتا ہے لیکن نقاد طنز و مزاح نگار نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے اندر ظرافت کی خداداد صلاحیت نہیں ہوتی۔ طنز و مزاح نگار Original تخلیق کرتا ہے اور ظرافت کی خداداد صلاحیت سے بیان کو جلا دیتا ہے۔ بالعناصر میں نصرت ظہیر کو ایک فطری طنز و مزاح نگار تصور کرتا ہوں اور ایسے حقیقی تخلیق نگار ہند پاک اردو ادب میں معدودے چند ہیں جن کے قطب، میرے نزدیک رشید احمد صدیقی ہیں۔

جناب نصرت روزنامہ ''تیج'' میں بھی زیادہ دن نہیں رہے۔ اخبار کا فت دار ایڈیشن بزرگ صحافی الفت صاحب کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا، اور نصرت صاحب ان کے معاونِ خصوصی تھے۔ الفت صاحب انھیں بہت مانتے تھے اور اکثر نیوز سیکشن میں آکر ان کے غائبانہ میں ان کی تعریف کرتے تھے اور نصرت صاحب بھی ان کی بے حد تعظیم کرتے تھے۔ لہٰذا کوئی ان بن دونوں کے درمیان نہیں تھی۔ نصرت صاحب کی تیج سے بیزاری اور پھر ان کے وِدڈراول کا سبب ایک اور صاحب تھے، جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں، تب میں بھی نہیں سمجھ پاتا تھا کہ آخر ادارے میں ان صاحب کا مصرف ان کی ضرورت کیا ہے، وہ کوئی کام نہیں کرتے تھے، نیچے اسکوٹر لگا کر اخبار کے مالک جناب رمیش گپتا کے عم محترم دھرم پال گپتا و نا صاحب کو اپنی صورت دکھا کر اوپر آجاتے پھر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکر لگاتے رہتے۔ دراصل وہ تیج کے نیا بازار دفتر میں تیج کے ہیڈ آفس بہادر شاہ ظفر مارگ کی ''انٹیلی جنس ایجنسی'' تھے۔ انھیں اس لیے بٹھایا گیا تھا کہ پل پل کی خبر مالکان تک پہنچتی رہے۔ خبر یہ نہیں کہ کام ہو رہا ہے یا نہیں، یا اخبار ایڈیٹوریل میں ہے یا پریس میں یا پلیٹیں مشین پر چڑھتیں یا نہیں، یہ سب نہیں، بلکہ خفیہ خبر بس یہ کہ کہیں ملازمین متحد ہو کر یونین تو نہیں بنا رہے ہیں، مالکان کو اخبار کے پروڈکشن اور سرکولیشن سے زیادہ فکر یونین کی آرگنائزیشن کی تھی ... تو وہ صاحب بھلا نصرت صاحب کو کیسے پسند آتے، جو مزدوروں اور یونینوں کے نظریے اور تنظیم کے علمبردار تھے۔ ان سے کھٹ پٹ شروع ہوگئی، نصرت صاحب کے شناساؤں کا حلقہ اور کانٹیکٹ اور ڈیلنگ کی سرکل ہمیشہ سے وسیع ہے۔ ان کے پاس فون پر فون آنا روٹین کا حصہ ہے۔ ان دنوں موبائل اتنا عام نہیں تھا۔ نصرت صاحب کی کالیں دفتر کی فون لائن پر آتی تھیں اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ صاحب جو بٹھائے گئے تھے، دوسری طرف فون پر نصرت صاحب کی کالیں سنتے تھے۔ ایک دو بار تو نصرت صاحب نے فون پر ہی ان کو کچھ اس انداز میں جھڑکا: ''یہ کون ڈسٹرب کر رہا ہے لائن سے ہٹو بات کرنے دو۔'' ماشاء اللہ نصرت صاحب کی آواز لاہوری، ملتانی پنجابیوں سے بھی زیادہ کرخت ہے۔ بھلا مالکان کا ایا ز خصوصی ایک ملازم کا ایسا پاٹ دار سلوک کیسے برداشت کر سکتا تھا بس اس دن سے سرد جنگ شروع ہوگئی۔ جناب نصرت کو اس کی پروا نہیں تھی...... روزنامہ ''قومی آواز'' سے بلاوا آچکا تھا۔ اس لیے وہ سرد جنگ کو اسٹار وار بنا کر لطف لے رہے تھے اور وہ صاحب بغیر وار ہیڈ والے میزائل کی طرح اپنی جگہ نصب کے نصب رہ گئے اور نصرت صاحب بڑے فاتحانہ شاہانہ انداز میں ''تیج'' سے کوچ کر گئے۔ جتنے دن وہ ''تیج'' میں رہے، میری ان کی ہم نشینی بڑی ہی اچھی اور یادگار رہی، حالانکہ ان کے آگے میرا احساس کمتری مجھے اکثر صم بکم اور محتاط رکھتا تھا، میں انھیں سنتا تھا کہ ان کی گفتگو بہت کچھ سکھاتی تھی۔ اکثر اپنائیت کے انداز میں وہ مجھ سے کہا کرتے تھے ''یار تم تیج میں ضائع ہو رہے ہو......'' یہ وہ جملہ تھا جسے وہ متاسفانہ لب و لہجے میں دردمندی کے ساتھ دہراتے تھے...... اور پھر نصرت ظہیر صاحب تیج سے ''قومی آواز'' (بہادر شاہ ظفر مارگ) جا پہنچے...... اس شفتگی اور شگفتگی میں

www.taemeernews.com

انھیں بے روزگاری کے ایک دن سے بھی پالا نہیں پڑا جبکہ تلاش روزگار پسینہ چھڑاتی ہے اور خون چوس لیتی ہے۔ تیج سے ان کے چلے جانے کے بعد مجھے ان کی مصاحبت سے محرومی اور مفارقت کافی دن ستاتی رہی۔ وہ اپنی خوش خلقی اور خوش طبعی کے سبب نیا بازار کی تیج بلڈنگ میں ایک ہر دلعزیز کیرکٹر بن گئے تھے۔ پورا اسٹاف انھیں یاد کرتا رہا۔ سبھی اداس تھے صرف ایک شخص کے سوا، وہ کچھ زیادہ ہی مگن نظر آرہے تھے جیسے پہلے ان کا دم گھٹ رہا تھا۔

سہارنپور سے 'ملاپ' اور پھر 'تیج' تک نصرت ظہیر صاحب کو جو Exposure ملا، وہ ان کے اپنے Exploration میں کافی مددگار ثابت ہوا۔ وہ نہ صرف ایک صحافی کے طور پر اردو قارئین میں معروف ہوئے بلکہ ایک ادیب کی حیثیت سے بھی ان کی شناخت قائم ہونے لگی۔ ان کی تحریر کی پختگی اور چلبلے پن نے قارئین کے ساتھ ساتھ اردو داں حلقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ گو، نیا بازار تک ان کی پوری شخصیت ابھر کر سامنے نہیں آئی تھی، صلاحیت واستعداد کے ابھی کئی باب کھلنے باقی تھے۔ ملاپ اور تیج کی اشاعت محدود تھی چنانچہ قارئین کا دائرہ بھی وسیع نہیں تھا لیکن جب وہ ''قومی آواز'' سے وابستہ ہوئے تو انھیں اپنے Demonstration کا ایک کھلا میدان مل گیا۔ قومی آواز کی ایک اپنی تاریخ تھی جو اسے موقر بناتی تھی۔ ہندوستان کے تنتی کے پانچ چھ روز ناموں میں اس کا ایک اپنا مقام تھا۔ چائے خانوں سے لے کر سفارت خانوں، ریلوے اسٹیشنوں سے لے کر ہوائی اڈوں تک قومی آواز کی رسائی تھی۔ ظفر عدیم جیسے ایک عام قاری سے لے کر یونیورسٹی اساتذہ، محققین وناقدین تک یعنی ایک کامن مین ریڈر شپ سے لے کر Elite readership تک اسے میسر تھی۔ ایسے اخبار میں اگر کسی ادیب کو مستقل کالم مل جائے تو یہ نصیب کی بات ہے اور اگر وہ ادیب نصرت ظہیر جیسا با کمال اہل قلم ہو تو اخبار کو بھی کالم پر رشک آئے۔ ''قومی آواز'' میں نصرت صاحب چیف رپورٹر اور رپورٹنگ سیکشن کے سربراہ تھے۔ اس فرض منصبی کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی سرگرمیاں بھی اخبار کے توسط سے جاری رہیں اور ان ہی سرگرمیوں میں ان کا مقبول خاص وعام کالم ''تحت اللفظ'' تھا۔ اس Ornamental اور Logical عنوان سے ان کا ایک مستقل کالم قومی آواز میں قائم ہو گیا اور اس عنوان کے تحت طنز ومزاح سے معمور، اعلیٰ ادبی معیار ومزاج کی تخلیقات منظر عام پر آئیں تو قومی آواز کے اخباری شناخت نامہ میں ''ادب'' کا اضافہ ہوا۔

میرا مطالعہ بالخصوص ادبی مطالعہ محدود ہے، میں اپنے طور پر ایسا سمجھتا ہوں کہ خاکوں اور انشائیوں کا فرق مٹا کر ظرافت کو فوق الاصناف ادب بنانے کا کریڈٹ صرف رشید احمد صدیقی کو جاتا ہے۔ رشید صاحب کے مضامین سے ایسا لگتا ہے کہ الگ سے انشائیہ نگاری یا خاکہ نویسی کی ناقدانہ Definition قائم کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ رشید صاحب کے مضامین سے ''طنز'' کو مطائبہ بنا کر ممکنہ تضحیک کے پہلو کو فکاہت میں ڈھالنے اور پھر تحریر کو مہذب تفریح کا وسیلہ بنانے کی تربیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اسی تحریر سے مجھے لگتا ہے، نصرت ظہیر صاحب کو تحریک ملی ہے۔ اس بابت ان سے میری کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ نصرت ظہیر صاحب کے جو مضامین قومی آواز میں ''تحت اللفظ'' کے عنوان سے شائع ہوئے بعد میں وہ مضامین باضابطہ کتابی شکل میں آئے اور اس کتاب کا نام بھی ''تحت اللفظ'' ہی تھا۔ طنز ومزاح یا ظرافت سے متعلق ان کی یہ پہلی کتاب تھی جو ہندوستان اور پاکستان میں یکساں طور پر پسند کی گئی اور اسے معیاری ادبی تصنیف کا درجہ دیا گیا۔ جناب نصرت سامنے سے موضوع اٹھاتے ہیں۔ پھر موضوع سے اپنے مزاج کو پہنچتے اور مزاج سے مقصد کو پاتے ہیں۔ یہ سلسلہ وار مرحلے پُر معنی ہوتے ہیں اور وہ جو کہنا چاہتے ہیں، وہ بیان، تشبیہ، استعارہ، کنایہ میں ہوتا ہے اور اسی بیان سے ان کی تحریر میں بھرپور مزاح اور کہیں طنز کا خفیف مہذب اشارہ ملتا ہے۔ رشید احمد صدیقی صاحب کے موضوعات بھی سامنے کے ہوتے ہیں، البتہ دور وزماں، تقاضے اور مصالح مختلف ہیں۔ انھوں نے اکثر اس وقت کے جیتے جاگتے کرداروں کو موضوع بنایا اور ان کرداروں کی Objectivity رشید احمد صدیقی صاحب کی بہت حد تک Subjectivity تھی۔ نصرت ظہیر صاحب کے یہاں معروضات مقدم نہیں ہیں، ان کی اپنی داخلیت حقیقی ہے۔ یہ فرق ''جنریشن گیپ'' ہے۔ اس گیپ کے باوجود بلکہ یہ کہوں کہ تغیر

www.taemeernews.com

پذیر دور اور مادیت کے زیر اثر معاشرتی قدر و اخلاق کے انحطاط کے باوجود، نصرت ظہیر نے زبان کے اخلاص کا وہی لحاظ رکھا جو رشید احمد صدیقی کی تحریر میں تھا۔ میں اپنی منطقی فکر و تحقیق کے گمان میں رشید صاحب کے ادب کو اگر Fraction مان لیتا ہوں تو پھر اس Line of Fraction کے اوپر اگر رشید احمد صدیقی Numerator کے طور پر ہیں تو نیچے نصرت ظہیر کو Denominator کی حیثیت سے رکھنے میں کوئی تکلف نہیں کروں گا۔ یہاں معاملہ مساوات کا ہے نہ تجاوز کا...... معاملہ ''حق بہ حقدار رسید'' کا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے ادب کے سرہانے میں نہ سہی، پہلو یا پائتی میں جگہ نصرت ظہیر کو ضرور ملنی چاہئے۔

کافی وقت نکل چکا تھا، نیا بازار اور بہادر شاہ ظفر مارگ کے بیچ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ پیلی کوٹھی، کوڑیا پل اور لال قلعہ سے ہو کر دلی گیٹ اور آئی ٹی او کی طرف جانے والی سڑک میرے پیروں کو نہیں لگی تھی، اپنی تو دنیا سبھاش نگر موڑ سے موتی نگر سرائے روہیلہ، اندر لوک ہو کر برف خانہ اور پھر تیس ہزاری کچہری کی ریڑھ اور پسلیوں سے نکل کر نیا بازار میں سپردِ تیغ ہوتی تھی اور واپسی میں میری ضائع ہوتی ہوئی زندگی کی میعاد بن جاتی تھی، لیکن اتنے سارے حوادث و آشوب کے باوجود نصرت صاحب اپنی حد درجہ پروفیشنل اور تخلیقی سرگرمیوں میں بھی مجھے نہیں بھولے تھے اور انھیں اس وقت بھی فکر تھی کہ نیا بازار میں ظفر عدیم ضائع ہو رہا ہے ...... دہلی میں میں نصرت ظہیر صاحب کو اپنے لیے ایک فرشتہ سمجھتا ہوں۔ انھوں نے مجھے بہادر شاہ ظفر مارگ بلایا اور ان کی وجہ سے مجھے قومی آواز میں ملازمت ملی، تب مجھے ایسا لگا کہ زندگی میں فراغت نہیں، نہ سہی، تھوڑی حلاوت تو ہے جو نصرت صاحب کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی۔ قومی آواز میں دورانِ ملازمت انھوں نے میرا خیال رکھا اور جب مجھے ایک برے دور سے دوچار ہونا پڑا تھا، تو انھوں نے ہی میری مدد کی تھی۔ جو لوگ انھیں نہیں سمجھ پائے یا جنھوں نے ان سے دوری بنا کر رکھی وہ ان کے بارے میں کچھ بھی رائے رکھتے ہوں گے اور رکھ سکتے ہیں میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ ان کے اندر کسی قسم کا چھل کپٹ نہیں ہے۔ دل کے اتنے ہی رقیق ہیں کہ خود روٹھتے ہیں اور ذرا سی دیر میں خود مان جاتے ہیں اور کوئی کینہ یا بغض نہیں پالتے۔ جس کو وہ دل سے چاہتے ہیں، اسے پورے حق کے ساتھ ڈانٹتے بھی ہیں لتاڑتے بھی ہیں، ان کے اس انداز میں بلا کا اپنا پن ہوتا ہے اور میں ان کے اس ''اپنا پن'' کا بار بار شکار ہوا ہوں۔ دل سے چاہنے کا ایک مختصر سا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ مجھے کسی سے معلوم ہوا کہ نصرت صاحب کار خریدنے والے ہیں، انھوں نے خود اس کی بھنک لگنے نہیں دی۔ اس طرح کے نجی معاملوں میں وہ اپنوں سے بھی ریزرو رہتے ہیں۔ جب میں نے انھیں کریدا تو انھوں نے بس اتنا کہا ''ابھی دیر ہے......'' میں سمجھ گیا کہ اندھیر نہیں ہے۔ وہ جب بھی دفتر آتے تھے تو اپنے کمرے میں جانے کی بجائے پہلے نیوز ڈیسک پر آتے تھے...... اتفاق سے میری کرسی کے سامنے میز کے اُدھر کی ایک دو کرسی خالی رہتی تھی۔ وہ بیٹھتے اور صرف مجھ سے مخاطب ہوتے اور میں ڈرتا رہتا کہ پتہ نہیں، وہ مجھے کیا کہیں گے۔ اخبار میں گاہے بہ گاہے میرے مضامین شائع ہوتے تھے، جو انھیں پسند نہیں آتے تو وہ مجھے آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا، وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں جاتے اور گھنٹے آدھ گھنٹے بعد پھر آتے اور مجھے باہر لے جاتے۔ چائے یا کچھ کھانے کے لیے...... ایک دن وہ آئے کچھ زیادہ ہی سیریس تھے...... شام کے چار بج رہے تھے۔ وہ ہماری شفٹ ختم ہونے کا وقت ہوتا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑے رہے اور کچھ منٹوں بعد اپنے مخصوص رعب دار لہجے میں بولے ''تم جانا مت میں ابھی آ رہا ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور میری سٹی پٹی گم...... پتہ نہیں کیا بات ہے...... میں اپنا تھیلہ سمیٹ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ وہ آئے اور مجھ اشارے سے بلا کر اپنے ساتھ باہر لے گئے...... باہر زینے سے اترتے ہوئے بولے ''میری کار آ گئی ہے، تم ذاکر نگر جاؤ گے...... میں تمہیں مہارانی باغ تک چھوڑ دیتا ہوں......'' میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا...... بات یہ تھی کہ جب ان کے کار خریدنے کی بھنک مجھے لگی تھی تو میں نے ان سے کہا تھا کہ جب آپ کار لے کر آئیں گے تو مجھے کچھ دور تک کار میں چھوڑ کر آئیں گے۔ کئی ماہ گزرنے کے بعد بھی میری وہ پُر تجسس فرمائش انھیں یاد تھی۔ پھر وہ مجھے مہارانی باغ تک چھوڑنے آئے

www.taemeernews.com

اور وہاں سے پھر دوبارہ دفتر گئے۔اس سے کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان کے کیا جذبات ہیں۔ایسے جذبات رکھنے والے ہی اپنی تحریر و تخلیق سے دوسرے کے دل اور جذبات کو چھو لیتے ہیں۔ان کی نثر سے بھی ان کی صاف دلی جھلکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ نصرت صاحب کی تخلیق میں ایک کشش ہوتی ہے۔وہ وزنی الفاظ، پیچیدہ ترکیب اور ثقیل فقرہ بازی سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔گہری سے گہری بات بھی انتہائی سہل انداز سے ادا کرنے کا وہ ہنر اور سلیقہ جانتے ہیں۔ان کی نثر میں جو سلاست اور فصاحت پائی جاتی ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ نصرت صاحب ایک کامیاب شاعر بھی ہیں۔ بہت ناپ تول کر شعر کہتے ہیں۔ رواں زبان استعمال کرتے ہیں اور نئی سے نئی فکر کو نظم کرتے ہیں۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ سب سے پہلے انھوں نے شاعری کی یا نثر نگاری لیکن ان کی نثر میں صنائع بدائع کی جو شاعرانہ کیفیت ہے اس سے تو یہی قیاس لگایا جاسکتا ہے کہ نصرت صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں۔وہ عام طور پر شعری نشستوں میں شرکت نہیں کرتے۔مخصوص محفلوں میں شعر سناتے ہیں انھوں نے مجھے اپنے بہت سارے شعر سنائے۔ ان کی نظمیں اتنی سجی سجائی ہوتی ہیں کہ ساحر کی ''پرچھائیاں'' والی فرحت محسوس ہوتی ہے۔

جناب نصرت ظہیر کی تخلیقات اگر ان کی اختراع پسندی کی آئینہ دار ہیں تو ان کا رسالہ ''ادب ساز'' ان کے تخلیقی ذہن کا ایک کینوس ہے۔اردو حلقے کو ایک زمانے سے ایک ایسے رسالے کی تمنا تھی جو ادبی مواد کے ساتھ ادبی معلومات کا مجلہ ہو، جس کی دستاویزی حیثیت ہو۔مخصوص موضوع، مخصوص عنوان، مخصوص شخصیت پر جب مختلف مضامین ایک جگہ ہوتے ہیں تو وہ شمارہ معلومات افزا ہوتا ہے اور اس کی ادبی وقعت ہوتی ہے۔ایسے شمارے فکر و تحقیق میں ریفرنس بک سے کم مددگار ثابت نہیں ہوتے۔ ''ادب ساز'' کے شمارے ایسے ہی ہوتے ہیں۔اس کے کچھ شمارے گوشے کی شکل میں آئے ہیں۔ نصرت صاحب موضوع خود منتخب کرتے ہیں اور اس پر لکھواتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر ارسال کردہ تخلیق کو ادب ساز میں جگہ مل جائے۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کے بعد کوئی ایسا غیر جانبدار رسالہ نہیں تھا جس سے ادبی تسکین ہو۔اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے نصرت ظہیر نے ادب ساز کی پلاننگ کی، اس پلاننگ میں ان کی اختراعیت کا بڑا دخل ہے۔ این سی پی یو ایل کے زیر اہتمام ایک ہندی رسالہ ''اردو درپن'' شائع ہوتا تھا۔اس کے ایڈیٹر نصرت ظہیر تھے۔ہندی رسم الخط میں دراصل یہ اردو میگزین تھا۔اس کی پلاننگ بھی نصرت صاحب نے کی تھی۔جن لوگوں نے اردو درپن کو دیکھا ہوگا وہ نصرت صاحب کی ہندی اور اردو دونوں زبانوں پر مہارت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہے ہوں گے۔اس وقت وہ این سی پی یو ایل کے اردو میگزین سیکشن کے اعزازی نگراں ہیں۔

جناب نصرت ظہیر کے بات کرنے، بولنے اور پڑھنے کے انداز میں بڑی جاذبیت ہے۔غنائیت کا احساس ہوتا ہے۔لفظیات اور صوتیات دونوں آپس میں مل کر ایک سماں باندھ دیتی ہیں۔ان کی زبان سے جتنے فقرے ادا ہوتے ہیں وہ نئے نئے پرداز مگر ایک فریکوئنسی میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں اور فریکوئنسی کی وہ یکسانیت صوتی لہروں کو مربوط کرتی ہے۔ پڑھتے اور بولتے وقت وہ ذہنی طور پر زبان و بیان کی نوک پلک میں منہمک ہوتے ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنے آپ سے بات کررہے ہوں۔وہ کسی پروگرام، محفل یا سیمینار میں بولیں یا کوئی مضمون پڑھیں، اس وقت ان پر خود اعتمادی کا ایک وجد سا طاری رہتا ہے۔ان کے تیکھے گہرے گندمی تیور بھی نرم پڑجاتے ہیں اور وہ سننے والوں کی توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔

جناب نصرت ظہیر پرکشش شخصیت کے مالک ہیں اور ان میں غضب کی ''سیکس اپیل'' ہے،ایک بار میں نے تیج میں ان کے معاشقہ کے بارے میں پوچھا تو وہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ ٹال گئے تھے اور انھوں نے موضوع بدل دیا تھا پھر اس بارے میں مجھے ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ نصرت ظہیر صاحب خوبصورت نثر لکھتے ہیں خوبصورت شاعری اور خوبصورت گفتگو کرتے ہیں، جمالیاتی حس اور چاہنے اور چاہے جانے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ بذات خود ایک خوبصورت مکمل اور بے نظیر شخصیت ہیں۔کسی ایسے ہمہ جہات وہمہ اوصاف مشہور و معروف ادیب وشاعر سے تو یہ پوچھنا چاہئے کہ کامیابی کے پردۂ زنگاری میں وہ تو لاریب ہے، پردہ کون ہے؟۔ ☆

www.taemeernews.com

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نصرت ظہیر کا سیاسی طنز و مزاح

موجودہ دور میں نصرت ظہیر اپنے ہمعصروں سے اس لئے مختلف ہیں کہ ان کے یہاں سیاسی طنز سب سے زیادہ ہے۔ ویسے ان کے کالم میں سماجی اور اخلاقی قدروں پر بھی طنز ملتا ہے لیکن وہ سیاسی طنزیہ کالم نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ ایک ایسے طنز ومزاح نگار ہیں جو ہمارے سماج میں ہونے والے واقعات وحادثات کے تمام پہلوؤں کو ایک خاص Aesthetic Distance سے دیکھتے ہیں اور ان میں چھپے منفی پہلوؤں کو طنز ومزاح کے پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور سماجی، سیاسی و معاشی ناہمواریوں، کمزوریوں، برائیوں اور شاطرانہ چالوں سے باخبر بھی ہوجاتا ہے۔

نشتریت طنز کا جوہر ہے۔ نشتریت کی دو قسمیں ہوتی ہیں، لفظی نشتریت اور واقعاتی نشتریت۔ نصرت ظہیر کے مضامین میں نشتریت کی یہ دونوں شکلیں پائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے جملوں، فقروں اور لفظوں کے برمحل استعمال سے بھی بلا کا طنز ومزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ طنز ومزاح کے حسن کو وہ برہنہ کر کے نہیں دکھاتے ہیں بلکہ روزن سے دکھاتے ہیں جس سے طنز ومزاح کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے جبکہ بعض مزاح نگار طنز ومزاح کے جسم سے کپڑے اتار دیتے ہیں لیکن نصرت ظہیر آہستہ آہستہ دبیز تہوں کو اتارتے ہیں کچھ اس طرح کہ قاری کا تجسس قائم رہتا ہے اور قاری آگے کی عبارت پڑھنے کے لئے بے قرار ہوجاتا ہے۔

اپنے مقبول کالم 'نمی دانم' کے ایک مضمون 'جوتوں کا عالمی بھائی چارہ' (19 اپریل 2009) میں چاروں طرف ملک و بیرون ملک میں بڑے بڑے لیڈروں پر جوتے، چپل اور کھڑاؤں چلا کر عوام اپنی ناراضی اور لیڈروں کے تئیں بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں وہیں نصرت ظہیر نے جوتوں، چپلوں اور کھڑاؤں کے درمیان عالمی بھائی چارہ قائم ہوجانے کی بات کہہ کر نہ صرف مزاح پیدا کیا ہے بلکہ عوام کو بھی ان جوتوں اور چپلوں سے سبق سیکھنے کی ترغیب دے ڈالی ہے جس میں غیر متحد سماج پر بہت بڑا طنز بھی ہے۔ نصرت ظہیر نے جوتے چپل کی واردات کو امریکی افسانہ جو فنتاسی سے بھرپور ہے سے جوڑ کر اس پورے مسئلے کو سنجیدہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن اس سنجیدگی میں طنز ومزاح کی بے شمار لہریں موجود ہیں جو بُش کی شخصیت پر طنز کا وار کرتی ہیں۔ مثلاً انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''اس کہانی پر اگرچہ کسی صحیح العقل آدمی کو یقین نہیں آئے گا، لیکن مجھے نہ جانے کیوں یقین ہو چلا کہ کاروں کی طرح جوتوں میں بھی ایک خاموش عالم گیر اتحاد قائم ہو چکا ہے اور وہ کسی ایک بوڑھے کے نہیں، بلکہ بہت سے بزرگوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ جوتا برادری کے کسی لیڈر نے کال دے دی ہو کہ ''دنیا بھر کے جوتو، ایک ہو جاؤ'' اور ہوسکتا ہے جوتوں کی اس انسان دشمنی کی وجہ یہ ہو کہ بش کے انتظامیہ نے اُن جوتوں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا، جو منتظر زیدی نے ان پر پھینک کر مارے تھے۔ ایک مجاہد اور غازی جوتے کے ساتھ اس سلوک نے یقیناً جوتا برادری کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہوگی''۔

نصرت ظہیر نے ''جوتے کی جمالیات'' میں نریندر مودی کو

www.taemeernews.com

اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میری (جوتے کی) برادری کا تو طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ اس کے یہاں ترسیل فوراً ہوتی ہے۔ خود جوتا آپ کے سر تک پہنچے نہ پہنچے اس کی بات ضرور سب تک پہنچ جاتی ہے... اب نریندر مودی کو ہی دیکھ لو۔ میں ابھی اُس تک نہیں پہنچ پایا ہوں، لیکن میری خبریں پہنچ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ اب وہ صرف اُسی اسٹیج سے تقریر کرتا ہے، جس پر جوتوں سے بچنے کا جال لگا ہوا ہو۔ آہ! بے چارے کے اعصاب پہ جوتا ہے سوار۔''

اسی طرح 3 مئی 2009 راشٹریہ سہارا میں نصرت ظہیر کا مضمون ''ایک اور پی ایم ان ویٹنگ'' کا عنوان بھی قاری کے تجسس کو بڑھا دیتا ہے کہ پی ایم کے لئے جن ناموں کو اخباروں میں اچھالا جا رہا ہے ان کے علاوہ ایک اور کون سا نام ہے جو نصرت ظہیر کی نگاہ میں ویٹنگ میں ہے۔ دراصل نصرت ظہیر نے لفظ ''اچھالنے'' سے بڑا کام لیا ہے اور پی ایم کے نام اور جوتے کے اچھالے جانے میں مناسبت پیدا کر کے عجیب و غریب مزاح کے ساتھ طنز پیدا کر کے پی ایم کی پوسٹ کو غارت کر دیا ہے اور یہ کہہ کر:

''یقین کرو... اس ملک کو نہ پنجے کی ضرورت ہے نہ کمل کی، نہ ہاتھی کی نہ سائیکل کی، نہ ہنسیا کی نہ ہتھوڑے کی... ملک میں اتنے مسائل، اتنی الجھنیں، اتنی افراتفری اور اتنی بے راہ روی ہے کہ اسے کوئی جوتا ہی ٹھیک طرح سے چلا سکتا ہے...''

جوتا اپنی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ ایک جوتا اس کے منہ پر کھینچ ماروں۔ آخر ایک جوتا ہی جوتے کے گھمنڈ کو توڑ سکتا تھا!''

ان جملوں میں ظہیر نے تمام سیاسی پارٹیوں پر طنز کیا ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہندوستان کے مسائل لا علاج ہیں۔

نصرت ظہیر نے ایک جگہ یہ لکھ کر ''پھر میرے ساتھ تو ایک اور مصیبت ہے اور وہ یہ کہ کہنے کو تو میں خالص عوام ہوں، مگر ہوں ذرا خاص قسم کا۔ اور خاص قسم کا یہ کہ میں جب بھی جسے بھی ووٹ دیتا ہوں، وہی ہار جاتا ہے۔'' غیر متحد مسلم قوم پر طنز بھی کیا ہے اور اسے متحد ہونے کی ترغیب بھی دے دی ہے۔

نصرت ظہیر نے بعض الفاظ، فقرے اور جملوں کے برمحل استعمال سے بھی طنز و مزاح میں عجیب و غریب کیفیت پیدا کی ہے۔ مثلاً چناوی ہنگاموں کے لئے اُچھل کود، دھمال، چوکڑی اور ہڑبونگ وغیرہ۔ اسی طرح ان کے یہ جملے ''آپ ہمیں خدمت سے نہیں روک سکتے۔ یہ ہمارا پیدائشی اور آئینی حق ہے'' اور ''سب کے سب ہماری خدمت کے لئے اتنے ہی پریشان ہیں، ورنہ آرام سے بیچارے گھر بیٹھ کر بیوی اور ٹی وی نہ دیکھتے'' جیسے جملے لاجواب ہیں۔ ان میں بلا کا طنز و مزاح چھپا ہوا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنے ایک کالم ''عدلیہ کا عمل دخل'' میں لفظوں کے استعمال سے بلا کا مزاح پیدا کیا ہے۔ مثلاً وکیلوں کی جیب کی جگہ دوزخ، پیسوں کی جگہ ایندھن کا استعمال کیا ہے۔ بعض جگہ ہم قافیہ عدالتی الفاظ کے استعمال سے مزاح پیدا کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے نقلی وکیل صاحب کے مخصوص تکیہ کلام اور املے کی اغلاط سے مزاحیہ پیرائے میں عدلیہ اور وکیلوں کا مذاق اُڑایا ہے۔ مثلاً برخوردار کی جگہ خربردار، سپریم کورٹ کی جگہ پکریم سورٹ، سکریم پورٹ، رٹ پٹیشن کی جگہ پٹ پٹیشن، ماحولیاتی آلودگی کی جگہ لاحولیاتی مالودگی، عدلیہ کی عمل دخل کی جگہ عدلیہ کی عمل و خلل، عملیہ کا خلل، ادل بدل، غلط ملط وغیرہ۔

لالو پرشاد یادو کے کانگریس پارٹی سے رشتہ خراب ہونے اور بہار میں امید سے کم سیٹیں حاصل کرنے کے فرسٹریشن کا اثر اخباری نامہ نگاروں پر غصہ اتارنے کی صورت میں دیکھا گیا تھا۔ نصرت ظہیر نے اس پورے واقعہ کو طنز و مزاح کی شکل میں پیش کرنے کے لئے لالو کا ہم قافیہ سبزی آلو کی گھٹتی بڑھتی قیمتوں کی تشبیہ لالو جی کے بدلتے ہوئے بیانات سے دے کر ان کا مذاق اُڑایا کیوں کہ جس طرح آلو کی قیمت اور ممبئی کے سنسکس

www.taemeernews.com

کے اترنے اور چڑھنے کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اسی طرح لالو کے سیاسی قول فعل کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔نصرت ظہیر آلو فروش کے مکالمے کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

''میرے باپ کے زمانے میں آلو ڈھائی روپے من تھا اور ایک مہینہ پہلے تک لالو پرساد سونیا اور راہل کا گن گان کرتے نہیں تھکتے تھے۔آج آلو کا بھاؤ اور لالو کا سوبھاؤ دیکھ لیجئے کہ جو شخص لوگوں کو بات بات پر ہنسا دیتا تھا،آج ذرا ذرا سی بات پر خود تاؤ کھا جاتا ہے!16 مئی کے بعد دیکھ لینا کہاں تو پردھان منتری بننے کے سپنے دیکھ رہے تھے،اب کے کانگریس پھر حکومت میں آ گئی تو منتری منڈل میں بھی جگہ نہیں ملے گی۔''

نصرت ظہیر نے ان خیالات کا اظہار لالو کے لئے کیا ہے لیکن اس کا اطلاق تمام لیڈروں پر ہوتا ہے کیوں کہ کم و بیش یہی حال تمام سیاسی پارٹیوں کا ہے۔الیکشن سے پہلے کچھ کہتے ہیں اور الیکشن کے بعد کچھ اور کہنے لگتے ہیں۔نصرت ظہیر نے سیاسی رہنماؤں کے بدلتے ہوئے رنگ کو سبزیوں کی گھٹتی بڑھتی قیمتوں سے اس لئے مشابہ قرار دیا کہ آج کل کے رہنماؤں کی قیمت سبزیوں کی قیمت سے زیادہ نہیں ہے۔دو کوڑی کی سیاست پر تنقید و گفتگو کرنے کے لئے سبزی فروش،گوشت فروش اور نائی ہی کافی ہیں۔اس لئے نصرت ظہیر نے باربروں کی مناسبت سے اس کی چلتی ہوئی قینچیوں کی تشبیہ سیاست دانوں کی چرب زبانی سے دے کر نیتاؤں پر خوبصورتی اور Perfection کے ساتھ مزاح کے پیرائے میں طنز کیا ہے۔

نصرت ظہیر نے دہلی میں ہونے والے قتل و غارت گری، عصمت دری کی تفصیل پیش کرتے ہوئے طنزیہ و مزاحیہ انداز میں سوال اٹھایا ہے کہ کیا ان سب کا ذمہ دار گزرا ہوا سال ہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دہلی میں پانچ سو سے زیادہ قتل ہوئے تو گویا وہ 2008 نے انجام دیئے،اس سے بھی زیادہ لوگ سڑک حادثوں میں مرے تو موٹر گاڑیوں اور بلولائن بسوں کی ڈرائیونگ سیٹ پر شاید 2008 بیٹھا ہوا تھا،سیکڑوں عورتوں کی عصمت دری ہوئی تو اس کے لئے 2008 کو سنگسار کر دینا چاہئے،میں یہ نہیں کہتا کہ ہم ہر بری بات کے لئے گزرے ہوئے سال کو سیدھے طور پر ذمہ دار قرار دیتے ہیں،لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہم کسی بھی سال کے محاسبے کو آدم زاد کا محاسبہ بنا کر سامنے نہیں رکھتے،اسے خود سے الگ رکھ کر کچھ اس انداز سے سامنے لاتے ہیں،جیسے ہم تو بیچ میں ہیں ہی نہیں۔''

نصرت ظہیر نے سال 2009 میں بہتری کی امید ظاہر کی ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''دوستو جی چاہتا ہے کہ نئے سال سے کچھ نئی امیدیں قائم کرلوں،مثلاً یہ امید کہ اس سال آدمی بالآخر حیوانی حرکتوں سے بور ہوکر انسان بننے پر مجبور ہوجائے گا،اردو کے ادیب نثر کی طرف زیادہ توجہ دینے لگیں گے،پورے سال کوئی نیا شعری مجموعہ شائع نہیں ہوگا،مشاعروں میں ترنم سے شعر پڑھنے پر پابندی لگ جائے گی،شمس الرحمن فاروقی جدیدیت کے بعد شاعری سے بھی باز آئیں گے!شاہ رخ خان تھوڑی سی اداکاری سیکھ لے گا،نئے فلمی گلوکاروں کے لئے سُر میں گانا لازمی ہوجائے گا،ہیروئینوں سے کہا جائے گا بی بی کبھی کبھار سین میں تھوڑے سے کپڑے بھی پہن لیا کرو اور پھر بھی باز نہ آئیں تو سنسر بورڈ ان کے لئے کم سے کم کپڑے پہننے کی بلحاظ عمر زیادہ سے زیادہ حد مقرر کردے گا۔''

نصرت ظہیر نے طنز و مزاح کے پیرائے میں سیاست دانوں کے اس حربے کو بے نقاب کیا ہے جس کی بدولت عوام کو گمراہ کرتے ہیں اور ترقی کے راستے سے بھٹکا کر مذہبی جذبات، ذات پات اور اُونچ نیچ،دھرنے،مظاہرے کے بھنور میں ڈال کر اینچی کی سی حالت بنا دیتے ہیں اور انہیں اس لائق نہیں چھوڑتے کہ وہ ہندوستان کی،اپنی فیملی کی یا خود کی بہتری کے لئے سوچ سکیں۔سیاست دانوں پر طنز کا وار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میاں،یہ ہم ہیں،جو عوام کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں۔یہ ہم

www.taemeernews.com

('سلم ڈاگ ملینیر' کو آٹھ آسکر ایوارڈ ملنے پر) اگر یہ سرمایۂ افلاس اسی طرح آسکر دلاتا رہا تو شاید دنیا کے سب سے بڑے سرمایہ دار بھی ہم ہی نکلیں، بھلے ہی وہ مفلسی کی سرمایہ داری کیوں نہ ہو۔

('بے ہو غریبی کی')

○ مسلمان دنیا کی واحد قوم ہیں، جن کے پاس سوائے ماضی کے اس دنیا کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور امریکن دنیا کی واحد دوسری قوم ہے، جس کے پاس سوائے ماضی کے سب کچھ ہے اور وہ دنیا کو سب کچھ دے سکتا ہے، ایٹم بم، اسرائیل، ویتنام، ملا عمر، بن لادن اور نہ جانے کیا کیا!

('اف یہ دردِ ملت کا')

○ دراصل اردو اکاڈمیاں اور اردو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کا درجہ رکھتی ہیں۔ کئی لوگ روانی میں اسے ظالم و مظلوم کا درجہ کہہ جاتے ہیں، خیر وہ بھی غلط نہیں۔

(ایک نظر ادھر بھی)

○ '(مسلمانوں کو) وہ ماضی تو بہت زیادہ اچھا لگتا ہے، جو بہت زیادہ ماضی ہو۔'

(حافظہ خراب ہے)

ہیں جو انہیں سمجھاتے ہیں کہ بھیا جب تک ایودھیا میں مندر نہیں بنے گا، تب تک ہندو کو آتم ستان نہیں مل سکتا۔ جب تک پچھڑی ذات کو ریزرویشن نہیں ملے گا تب تک وہ عزت سے نہیں جی سکے گی۔ جب تک مسلم پرسنل لا کو محفوظ نہیں رکھا جائے گا تب تک مسلمانوں کے گھروں سے ٹاٹ کے پردے نہیں ہٹیں گے ... اس کے علاوہ وہ ہم ہی ہیں جو انہیں دھرنے، مظاہرے، چکا جام، جلسہ، ووٹ اور الیکشن کے چکر میں الجھا کر دوسری تمام فکروں سے آزاد رکھتے ہیں۔ انہیں اپنے ٹھنڈے چولھے کی پرواہ رہتی ہے نہ بھوک اور غریبی کی، نہ انہیں بے روزگاری کا غم ستاتا ہے، نہ غیر ملکی کمپنیوں کے ہاتھوں دیش کی دولت لٹنے کا دکھ ہوتا ہے۔ اگر ہم نہ ہوں تو یہ تمام دکھ انہیں پاگل کر دیں اور یہ لوگ مرنے مارنے پر اتر آئیں۔ چنانچہ یہ ہم ہی ہیں جو انہیں چین سے جینے اور مرنے میں مدد کرتے ہیں ورنہ یہ عدالتیں تو ان کا دماغ خراب کر کے رکھ دیں! آپ ہی بتائیے دیش میں کس کا عمل دخل ہونا چاہیے؟ ہم عوامی نمائندوں کا یا عدالت کا۔''

نصرت ظہیر نے آسکر ایوارڈ ملنے کے بعد گندی بستیوں اور ان بستیوں کے رہنے والوں پر فخر محسوس کرنے والوں پر بھی طنز کیا ہے کیوں کہ ایسے لوگ Fool's Paradise میں جیتے ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اگر یہ سرمایۂ افلاس اسی طرح آسکر دلاتا رہا تو شاید دنیا کے سب سے بڑے سرمایہ دار بھی ہم ہی نکلیں، بھلے ہی وہ مفلسی کی سرمایہ داری کیوں نہ ہو۔ تو آیئے عہد کرتے ہیں کہ ہم جھگی جھونپڑیوں اور گندی بستیوں کو خوب ترقی دیں گے، انہیں اور پھیلائیں گے، ان میں زندگی کو اور مشکل بنائیں گے اور ہر شہر میں کم سے کم ایک بڑی ... بلکہ ہو سکے تو بہت بڑی اور گندی بستی ضرور بسائیں گے۔''

نصرت ظہیر کی تحریروں میں طنز و مزاح کی تمام تر خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ نصرت ظہیر اسی طرح آب و تاب کے ساتھ لکھتے رہے تو طنز و مزاح کا یہ فن مزید ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے گا اور ان کے کالم سے قوموں کی زندگی میں تلاطم بھی پیدا ہوتا رہے گا۔

○

Residence: 262-D, Shipra Sun City
Indirapuram, Ghaziabad-201014
Mobile No: 09911796525
E-Mail: aquilahmad2@gmail.com

www.taemeernews.com

سراج نقوی

نصرت ظہیر کی طنز نگاری

کئی برس قبل جب میں نے نصرت ظہیر کا نام سنا اور ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین پڑھے تو خیال ہوا کہ نصرت ظہیر اعلیٰ پائے کا Sense of humour رکھنے والی کوئی 'معقول' سی صاحبہ ہوں گی۔ یہ خیال آتے ہی میرے جمالیاتی ذوق نے نصرت ظہیر کے کئی خیالی پیکر بھی تراش لیے اور ان سے شوق ملاقات بھی پیدا ہوا، لیکن کچھ عرصہ بعد میرے جمالیاتی ذوق کو یہ جان کر سخت دھچکا لگا کہ نصرت ظہیر صاحبہ نہیں صاحب ہیں۔ بہرحال اس مایوس کن اطلاع کے باوجود نہ جانے کیوں یہ غلط فہمی یا خوش فہمی پھر بھی برقرار رہی کہ موصوف ایک مناسب اور پرکشش شخصیت کے مالک ہوں گے، لیکن میری اس خوش فہمی کو بھی منھ کی کھانی پڑی۔ پہلی ملاقات میں ہی نصرت ظہیر مجھے قطعی بے ڈھب اور بے ہنگم سے انسان نظر آئے اور میں اس گتھی کو سلجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہا کہ اپنے چہرے پر اس قدر کرخت تاثرات سجائے رکھنے والے شخص کا قلم طنز و مزاح کی اس قدر شگفتہ تحریریں کس طرح لکھ پاتا ہے۔ نصرت ظہیر کے ظاہر و باطن یا یوں کہیں کہ چہرے اور قلم کا یہ تضاد سمجھنے سے میں آج تک قاصر ہوں۔

بہرحال برسوں پہلے کی پہلی ملاقات کے بعد نصرت ظہیر سے میری بالمشافہ ملاقاتیں تو کم ہوئیں لیکن راشٹریہ سہارا میں شائع ہونے والے ان کے طنزیہ مضامین پڑھنے کا موقع ملتا رہا۔ طنزیہ و مزاحیہ کا یہ مطالعہ کسی شوق سے زیادہ میری مجبوری تھا، اس لیے کہ ادارتی صفحہ کی ذمہ داریاں ہونے کے سبب مجھے اس صفحہ سے متعلق تمام مضامین پڑھنے ہی ہوتے تھے، لیکن مجھے یہ اعتراف ہے کہ یہ دفتری مجبوری بالآخر میری ذہنی مجبوری بھی بن گئی کہ آہستہ آہستہ نصرت ظہیر کے طنزیہ مضامین کا رنگ مجھ پر گہرا ہوتا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دفتری اور سماجی زندگی میں آج کے انسان کو جس طرح کی ذہنی کشمکش اور دباؤ سے گزرنا پڑتا ہے اس میں نصرت ظہیر جیسے ادیب کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین دماغی ٹانک کا کام کرتے ہیں۔

بہرحال یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ اچانک ایک روز راشٹریہ سہارا (اردو) کے دفتر میں یہ افواہ اڑی کہ موصوف ''عالمی سہارا ٹی وی'' جوائن کرنے والے ہیں۔ مجھے یہ خیال گزرا کہ 'عالمی سہارا' چینل پر کسی کامیڈی سیریل شروع کرنے کے لیے شائد نصرت ظہیر کی خدمات لی جائیں۔ حالانکہ اس وقت تک نصرت ظہیر ''قومی آواز'' سے ریٹائر ہو چکے تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ خود ''قومی آواز'' ریٹائرڈ ہو چکا تھا، یعنی بند ہو چکا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ایک ریٹائرڈ آدمی ٹریجڈی سیریل کی تو اچھی اسکرپٹ لکھ سکتا ہے لیکن کامیڈی سیریل کی نہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ کچھ دن بعد نصرت ظہیر خود 'بہ نفس نفیس' (یہاں نفیس لفظ کا استعمال میں اپنے Reservations کے ساتھ کر رہا ہوں) راشٹریہ سہارا کے دفتر تشریف لائے۔ دیگر افراد کے علاوہ مجھ سے بھی ملے اور یہ دھماکہ کیا کہ موصوف بہت جلد ہفت روزہ عالمی سہارا کے ایڈیٹوریل انچارج کے طور پر جوائن کرنے والے ہیں۔ میرے کئی ساتھیوں کا نصرت ظہیر کی ممکنہ آمد پر خیال تھا کہ موصوف کی آمد ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی قوت برداشت کا امتحان ثابت ہوگی۔ کئی لوگوں کو تو ان کی آمد کی خبر سن کر ہی اختلاج اور زبان میں خارش جیسی بیماریاں لاحق ہوگئیں۔ خود مجھے کئی روز تک 'یا حفیظ' اور 'یا شافی' کی تسبیح پڑھنی پڑی۔ بہرحال جب نصرت ظہیر نے ہفت روزہ ''عالمی سہارا'' کے ادارتی انچارج کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میرے کئی ساتھیوں نے نصرت ظہیر کے تعلق سے جن اندیشوں اور شکوک کا اظہار کیا تھا ان میں سے کئی درست بھی ثابت ہوئے، وہ جب تک 'سہارا' میں رہے

www.taemeernews.com

'عالمی سہارا' کے ادارتی اسٹاف کو بہت پابندی سے اپنا بلڈ پریشر چیک کرانا پڑتا تھا، اس لیے کہ ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا موضوع زیر بحث آ جاتا تھا کہ جس کے بعد نصرت ظہیر اور ساتھیوں میں زبانی معرکہ آرائی شروع ہو جاتی اور بلڈ پریشر میں اضافہ کے منطقی انجام تک پہنچ کر ہی ختم ہوتی۔ خدا کا شکر یہ ہے کہ اس اضافہ نے کبھی خطرہ کے نشان کو پار نہیں کیا۔ پھر اچانک ایک روز مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ایک موضوع ایسا بھی ہے کہ جس سے خود نصرت ظہیر کا بلڈ پریشر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی پیشانی کا جغرافیہ بھی بدل جاتا ہے، یہ موضوع تھا 'ذکر امروہہ'۔ ایک امروہوی ہونے کے ناطے میں جب بھی ان سے گفتگو کرتا تو اس میں امروہہ کا ذکر ضرور شامل ہوتا، کچھ دن تک تو نصرت ظہیر یہ سب برداشت کرتے رہے لیکن پھر اکثر ایسا ہوتا کہ میں ایسا کوئی ذکر چھیڑتا اور موصوف فوراً دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے ہتھیار ڈال دیتے کہ بس ..... جس روز ہفت روزہ عالمی سہارا کے آخری صفحات پریس میں بھجوانے کا دن ہوتا نصرت ظہیر کا چہرہ، ان کی بوکھلاہٹ، گھبراہٹ، بات بات پر چڑچڑاپن اور ساتھیوں کے ساتھ تیز لہجہ میں بات کرنا قابل دید ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نصرت ظہیر کے طنزیہ مضامین کا کوئی قاری اگر اس موڈ میں نصرت ظہیر کو دیکھ لیتا تو شائد اس بات پر قطعی یقین نہ کرتا کہ ان میں حس مزاح جیسی کوئی چیز بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن بہرحال یہ سچ ہے کہ بظاہر کڑوا، کسیلا، بد دماغ اور Short tempered نظر آنے والا یہ شخص ایک اعلیٰ پائے کا طنز نگار بھی ہے۔

غالباً مجتبیٰ حسین نے اپنے کسی مضمون میں لکھا ہے کہ 21 ویں صدی میں انسان کو ہنسانا ایک مشکل کام ہے۔ نصرت ظہیر یہ مشکل کام کر رہے ہیں اور بخوبی کر رہے ہیں۔ ان کی تحریروں میں سماج کے اوبڑ کھابڑ راستوں کی نشاندہی جس ہلکے پھلکے انداز میں کی گئی ہے اس نے ان کی عوامی مقبولیت میں خاص کردار ادا کیا ہے۔ دانشورانہ بوجھل پن اور فلسفیانہ مشکل پسندی سے نصرت ظہیر کو خدا واسطے کا بیر ہے۔

دل پر جبر کر کے چند مثالیں آپ بھی دیکھ لیں۔ ایک مضمون کا یہ جملہ قابل غور ہے کہ 'اسپتال سے مطمئن ہونے کے بعد میں ایک پولس تھانے کی طرف چل دیا کہ زندگی وہاں اسپتالوں سے بھی زیادہ علیل پائی جاتی ہے۔'' مذکورہ مختصر سا جملہ اسپتالوں اور تھانوں کے خراب حالات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ایک دوسرے طنزیہ مضمون میں نصرت ظہیر کا پسندیدہ کردار میاں عبدالقدوس خفیہ کیمرے لگانے کے سوال پر جواب دیتا ہے کہ'' دو ہی جگہیں ہیں جہاں خفیہ کیمرے لگانے سے سماج اور انسان کو فائدہ ہوسکتا ہے، یا تو کیمرہ آدمی کی پیشانی پر لگا دیا جائے تاکہ سماج کو پتہ چلتا رہے کہ وہ کس کو کس طرح اپنا شکار بنانے جارہا ہے یا پھر کیمرہ انسان کے باطن میں نصب ہونا چاہیے، تاکہ اسے یہ پتہ چلتا رہے کہ اس وقت وہ کیا کر رہا ہے۔''

ایک اور مضمون میں دلی پولس اور اسپیشل پولس کا فرق اس طرح بیان کرتے ہیں ''اسپیشل پولس دراصل اسی دہلی پولس کی ایک شاخ ہے۔ دونوں میں فرق بس اتنا ہے کہ دہلی پولس محض عام طور سے آپ کے لیے آپ کے ساتھ رہتی ہے، جبکہ اسپیشل پولس خاص طور سے آپ کے لیے آپ کے ساتھ رہا کرتی ہے۔ ہمارے سیکولر نظام میں چونکہ اقلیتوں کو عموماً کمزور اور پسماندہ پایا جاتا ہے اس لیے یہ اسپیشل پولس اقلیتوں کا اور ان میں بھی مسلمانوں کا خاص طور پر خیال رکھتی ہے۔'' مذکورہ جملوں میں جو طنز ہے اسے ہر وہ آدمی محسوس کرسکتا اور سمجھ سکتا ہے جو ملک میں مسلمانوں کی پولس کے ذریعہ اندھا دھند گرفتاری کے واقعات سے واقف ہے۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ نصرت ظہیر کے طنزیہ مضامین سماج کی ناہمواریوں کے خلاف ایک مؤثر آواز ہیں اور یہ آواز کہیں بھی اپنے قاری کو بوجھل پن کا احساس نہیں ہونے دیتی بلکہ پیچیدہ سے پیچیدہ اور انتہائی سنجیدہ مسائل کو بھی اس دلچسپ پیرائے میں پیش کرتی ہے کہ قاری پڑھتے پڑھتے مسکرا اٹھتا ہے اور یہی وہ خوبی ہے جو کسی طنز نگار کو بڑا بناتی ہے۔ نصرت ظہیر بھی یقینی طور پر ایک بڑے طنز نگار ہیں، لیکن مزاج کے اعتبار سے وہ بچے ہیں اور یہ 'بچپن' بھی اب ان کی پہچان بن چکا ہے۔

☆......☆......☆

www.taemeernews.com

فاروق ارگلی

نصرت ظہیر کی کثیر جہتی

طنز و مزاح دوسرے، تیسرے یا کون سے درجے کا ادب ہے، یہ تو اُردو کے مدار المہام، محققین عظام اور ناقدین کرام جانیں، ہم ایسے سادھارن پڑھنے سیکھنے والے تو بس اتنا جانتے ہیں کہ بات میں بات نکالنا، لفظ لفظ میں فرحت و انبساط کے شگوفے کھلانا، ہنسی ہنسی میں نشتر زنی اور سماج کی جراحی کے کرتب دِکھانا خالہ جی کا کھیل نہیں ہے۔ ادبی دُنیا میں جتنی مختلف الخلقت، ساخت برانڈ اور کوالٹی کی دانشوریاں پائی جاتی ہیں سب مل کر بھی اس دانشورانہ سچائی کو جھٹلا نہیں سکتیں کہ طنز و مزاح کوئی کتابی یا نصابی علم نہیں جسے کوئی استاد شاگرد کو سکھا سکے۔ یہ ایسا فنِ تخلیق ہے جو مزاج کی فطری شگفتگی، قدرتی ذہانت، مشاہدے کی قوت اور کتابِ زندگی کو بین السطور تک حرف حرف پڑھ جانے کا عطیہ ہے اور بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اسے نئے موسموں کا تغیر کہیں یا وقت کی ستم ظریفی کہ اس ترقی یافتہ عہد میں ہر قسم کی دانشوری کی پیداوار میں بے تحاشہ اضافے کے باوجود طنز و ظرافت کی پود ناپید ہوتی جارہی ہے۔ یونیورسٹیوں، کالجوں، کتابوں، رسالوں، اخباروں، شاعروں اور سیمناروں میں خاصی بھیڑ ہے مگر وہ جنس ندارد ہے جسے طنز و مزاح نگار کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ خانۂ ادب کبھی بے چراغ نہیں رہتا۔ دنیا لاکھ ماتم کدہ بن جائے غموں اور کلفتوں کو قہقہوں میں اُڑانے والے آتے ہی رہیں گے۔ تعداد میں کم سہی لیکن آج کی اُردو کے سنجیدہ اور رنجیدہ منظرنامے کو اپنی شوخیِ قلم سے زعفران بنانے والے موجود ہیں۔ ابھی دُنیائے اُردو کے بزرگ ظرافت نگار مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین خدا کے فضل سے زندہ سلامت ہیں اور ان کے پیچھے آنے والوں کی صف میں ایک جواں قلم اور جواں فکر شخصیت نے اُردو تہذیب و ادب کے عالمی منظرنامے پر جو رنگ بکھیرے ہیں، اس کا نام ہے نصرت ظہیر، جو گزشتہ تین دہائیوں سے اپنی ظریفانہ اور طنزیہ تحریروں کا جادو جگا رہے ہیں۔ لیکن جو چیز انھیں خاص بناتی ہے وہ ان کی کثیر جہتی ہے۔ وہ اُردو کے سینئر صحافی ہیں، سیاسی مبصر، طنزیہ فکاہیہ کالم نگار، سنجیدہ شاعر، نقاد، مبصر اور مترجم ہیں، اور یوں اُردو زبان و ادب کا فروغ ان کے لیے مقصدِ حیات ہے۔

پچھلے پچاس باون برسوں سے دِلّی شہر کا ادبی صحافتی منظرنامہ راقم الحروف کے سامنے ہے۔ اس مدت میں ایسی ایسی نامور شخصیتوں کو قریب سے دیکھا جن کے نام جریدۂ عالم پر نقش ہیں۔ لیکن 1981 میں سہارنپور یوپی سے دہلی وارد ہونے والے نصرت ظہیر جیسا اور نہیں دیکھا جس نے دہلی میں قدم رکھتے ہی چونکانا شروع کردیا اور جتنی تیزی سے دہلی کی صحافت اور ادبی ماحول پر اپنی گرفت بنائی وہ حیرت ناک تھی۔ دراصل نصرت اپنی طبیعت، اپنے مزاج اور اپنے حالات سے ایک غیر معمولی انسان ہیں۔ ان کی زندگی بڑی طوفانی قسم کی رہی ہے۔

نصرت ظہیر کے قلم کا غلغلہ اس وقت پورے زور وشور سے سنائی دینے لگا جب 1987 میں انھوں نے 'قومی آواز' میں 'دہلی ڈائری' کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے 'تحت اللفظ' کے عنوان سے یومیہ فکاہیہ طنزیہ کالم لکھنا شروع کردیا۔ یہ طنز و مزاح کے میدان میں ان کی زبردست چھلانگ تھی۔ ایک اور اخبار (اخبار مشرق میں انھوں نے چند ماہ 'وغیرہ وغیرہ' کے نام سے یومیہ کالم لکھا) کئی سال تک قومی آواز

www.taemeernews.com

کے سنڈے ایڈیشن میں ادبی خاکوں کا سلسلہ 'بقلم خود' لکھتے رہے۔ 'قومی آواز' میں ہی ان کا ایک غیر معمولی مزاحیہ ناول 'ابن بطوطہ کا دوسرا سفر' بالاقساط شائع ہوا۔ قلم کی روانی کا اندازہ ان کے شرد ماتی دنوں میں لکھے گئے کالموں سے بہ آسانی ہو سکتا ہے۔

'تحت اللفظ' کے بعد نصرت ظہیر کے نثری مضامین کے خوبصورت مجموعے 'بقلم خود'، 'خرانٹوں کا مشاعرہ' اور 'نمی دانم' شائع ہو چکے ہیں، موخرالذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے بین الاقوامی پبلشنگ ادارے پینگوئن نے شائع کیا ہے۔ پینگوئن کے لیے وہ انگریزی کے صحافی افتخار گیلانی کی مشہور کتاب 'مائی ڈیز ان پریزن' کا ترجمہ 'تہاڑ میں میرے شب و روز' کے عنوان سے کر چکے ہیں جو پینگوئن کی پہلی اردو کتاب تھی۔ ساہتیہ اکادمی سے اس ترجمہ پر آپ کو ترجمہ کا ایوارڈ بھی حاصل ہو چکا ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ نین تارا سہگل کے انگریزی ناول 'رچ لائک اس' کا بھی انھوں نے 'ہم امیر لوگ' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ خود کو 'سابق شاعر' لکھا ہے، لیکن وہ 'سابق' کبھی نہیں رہے، شاعری نے اُن کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ اور اب ان کا شعری مجموعہ بھی آرہا ہے۔ طنز ومزاح میں اُن کا قلم مسکراہٹیں اور قہقہے لٹاتا رہا ہے لیکن اس کے برعکس ان کی سنجیدہ شاعری نئی غزل کے باوقار لب و لہجے کے ساتھ قاری اور سامع کی رُوح میں اُتر جانے کی تمام خوبیوں سے مالا مال ہے۔

اپنی صحافتی زندگی میں نصرت ظہیر کئی بیرونی ممالک کا سفر کر چکے ہیں۔ 2005ء میں انھوں نے افغانستان کے اولین جمہوری انتخابات کی کوریج کے سلسلے میں کابل اور غزنی میں خاصا وقت گزارا اور افغانیوں کی زندگی اور معاشرت کا بہت قریب سے جائزہ لیا۔ 2007ء میں انھوں نے کیوبا کا دورہ کیا اور بین الاقوامی تہذیبی نیرنگی کانفرنس میں ہندوستانی وفد کے ساتھ اُردو کی نمائندگی کی۔ 2007ء میں دوبار لندن کا سفر کیا، لندن یونیورسٹی میں ان کے اعزاز میں مشاعرہ کا انعقاد کیا۔ 2010ء میں جدہ اور ریاض میں ہونے والوں مشاعروں میں شرکت کی اور عمرہ و زیارت کی سعادت حاصل کی۔

ذاتی زندگی میں نصرت نہایت حلیم، بردبار اور ہمدرد انسان ہیں، ہر کام میں سلیقہ اور پابندی وقت کے قائل ہیں۔ یوں تو بڑے خوش مزاج ہیں لیکن مرضی کے خلاف کوئی بات ہو تو غصے کا پارہ ساتویں آسمان پر چڑھ جاتا ہے، لیکن یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔ غیبت اور بناوٹ کے فن سے واقف نہیں، خواہ کوئی بھی ہو بات کھری کریں گے اور منہ پر کریں گے انجام خواہ کچھ بھی ہو۔ مگر انجام اچھا ہی ہوتا ہے۔ انھیں جاننے والے ان کی صاف گوئی کی قدر کرتے ہیں۔ ☆☆

موبائل: 9212166170

مارکٹ میں پیش کرتے ہی

لاسا لمسا مکس چائے

اب ہر ایک کی پسند بن گئی ہے
اتنے کم عرصے میں اتنی مقبولیت حاصل کرنا
اللہ کا فضل وصدقہ نبی کریم ﷺ ہے

نیلگری ٹی ایمپوریم

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد
فون: 24618340، 24745372

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

میں اور میں

ایک دن مجھے خیال آیا کہ صحافت کے پچھلے تیس پینتیس برسوں میں درجنوں اہم اور غیر اہم شخصیتوں کے انٹرویو لے کر چھاپ دیے مگر آج تک یہ توفیق نہ ہوئی کہ خود اپنا کوئی انٹرویو لکھ سکتا یا پھر دوسروں سے ہی لکھوا لیتا۔ سوچا دوسروں کو میرا انٹرویو لینے کا خیال پتہ نہیں کب آئے کیوں نہ ایک روز موقع پا کر خود ہی اپنا انٹرویو کرڈالوں، کہ میں کون ہوں، میں کیا ہوں، میں کیوں ہوں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوچ کر اور خود کو فرصت سے پا کر ایک دن میں نے ٹیلی فون اٹھایا اور اپنا نمبر گھما دیا۔ دوسری طرف سے فون مصروف ملا۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس وقت میں پوری طرح فرصت سے خالی بیٹھا ہوں تو پھر میرا فون مصروف کیوں تھا؟ اور وہ بھی تب جب کہ فون کے دوسری طرف بھی میں ہی تھا، کوئی اور بالکل نہیں تھا۔

مجھے خود پر شک ہو گیا۔ کہیں میں خود سے چھپ کر کسی اور سے تو فون پر باتیں نہیں کرتا۔ یاد آیا، ایک دفعہ بیوی نے بھی کچھ ایسا ہی شک ظاہر کیا تھا کہ میں فون پر چھپ چھپ کر نہ جانے کس سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ میں سنجیدگی سے سوچنے بیٹھ گیا مگر کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ کچھ اردو کے جدید افسانے جیسی بات ہو رہی تھی کہ بار بار پڑھیے پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔ مگر اس بار بھی مصروفیت کی ٹون سنائی دیتی رہی۔ آخر خود کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے خیال سے میں نے ٹیلی فون ایکسچینج سے رابطہ کیا اور انھیں فون ملانے کے ساتھ یہ پتہ لگانے کے لیے کہا کہ اس وقت میرا فون مصروف کیوں ہے۔ انھوں نے نمبر نوٹ کرنے کے بعد کہا کہ حضرت یہ تو آپ کا ہی نمبر ہے۔ اس پر میں نے کہا، میں اپنے آپ سے ہی بات کرنا چاہتا ہوں۔ جواب میں آپریٹر نے مختلف ضوابط کے ذیلی ضابطوں کا حوالہ دے کر جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ٹیلی فون ایکٹ کے تحت کسی صارف کو خود اپنے آپ سے بات چیت کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی چنانچہ جب بھی کوئی خود اپنا نمبر ملاتا ہے تو اسے مصروفیت کی ٹون سنا دی جاتی ہے۔

حالانکہ یہ انسانی حقوق کی صریح خلاف ورزی تھی کہ انسانی معاشرے میں رہ کر انسان خود سے بھی کلام نہ کر سکے۔ اس پر سپریم کورٹ میں پی آئی ایل بھی ڈالی جا سکتی تھی، لیکن پھر خیال آیا کہ پی آئی ایل یعنی مفاد عامہ کی عرضی میں چونکہ سب سے پہلے یہ حلف نامہ دینا پڑتا ہے کہ مدعی کا زیر مقدمہ معاملے سے کوئی ذاتی تعلق نہیں ہے، اس لیے کہیں وکیل مخالف یہ قانونی نکتہ نہ اٹھانے لگے کہ پہلے سائل کو حقوق انسانی سے اپنی لاتعلقی ڈکلیئر کرنی ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں مدعی کو یہ اعلان کرنا ہوگا کہ نہ تو وہ خود ذاتی طور پر انسان ہے نہ اس کا بنی نوع انسان سے کوئی تعلق ہے، نیز وہ ایک جاندار محض ہے جس کا دور دور تک انسانیت سے کوئی لینا دینا نہیں۔

صرف ایک ٹیلی فون کال کے لیے انسانیت سے دست بردار ہو جانا مجھے ٹھیک نہیں لگا، اس لیے مجبوراً میں نے ایک خط اپنے نام ٹائپ کیا جس میں انٹرویو کے لیے وقت دینے کی مودبانہ گزارش کی گئی تھی اور کوریئر سروس والے کو بلا کر کہا کہ اس لفافے کو مکتوب الیہ تک پہنچا دے۔ اس نے لفافہ لے کر پوچھا کہ اسے آپ کس سروس سے بھیجنا چاہیں گے، سادہ سروس سے یا فوری سروس سے۔ میں نے کہا فوری سروس بہتر رہے گی کیونکہ میں ذرا جلدی میں ہوں۔ بس پر وہ بولا کہ فوری سروس کے ڈیڑھ سو روپے لگیں گے۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں۔ اس نے مجھ سے ڈیڑھ سو روپے وصول کیے، رسید بنا کر دی، پھر الٹے پاؤں دس قدم واپس جا کر رکا، رک کر پلٹا اور گن کر اتنے ہی قدم اٹھاتے ہوئے واپس میرے پاس آ گیا۔ واپس آ کر اس نے کال بیل بجائی، ایک کاغذ پر میرا نام پتہ لکھا، اس پر مجھ

www.taemeernews.com

سے وصولیابی کے دستخط لیے اور یہ تمام کارروائی مکمل کرنے کے بعد لفافہ واپس میرے ہاتھ میں تھما کر یہ جا وہ جا!

میں حیرت سے آنکھیں مل کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ اتنی ایماندار، صاف ستھری اور سریع رفتار کوریئر سروس سے پہلی بار میرا واسطہ پڑا تھا۔ ورنہ پرائیویٹ کوریئر سروس کے سلسلے میں میرا عام تجربہ یہ رہا ہے کہ شادی بیاہ کے دعوت نامے ولیمے کے اگلے روز ملتے ہیں اور ادبی سیمینار میں شرکت کی پر خلوص درخواست ٹھہرانے کا وقت نکل جانے کے بعد موصول ہوتی ہے۔ بہرکیف، لفافہ کھول کر خط پڑھا تو یہ دیکھ کر طبیعت نہایت شاداں وفرحاں نیز مسرور ہوئی کہ آخر کسی نے تو میری قدر و قیمت کو پہچانا۔ خط میں مجھ سے کچھ اس طرح انٹرویو کے لیے وقت دینے کی درخواست کی گئی تھی گویا میں کوئی وی آئی پی ہوں۔ عبارت یوں تھی:

محترم المقام، ادیب عالی شان، سالارِ دانش دوران، قبلہ نصرت ظہیر صاحب مدظلہ العالی! آداب وتسلیمات!

بعد آداب وتسلیمات کے میں کورنش بجالاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ کون ہے روئے زمین پر جو شاعری اور نثر، طنز اور مزاح، ادبی اور غیر ادبی صحافت نیز کالم نگاری وغیرہ میں آپ کی فتوحات سے واقف نہ ہو۔ اگر ایسا کوئی ہے تو ناچیز کی رائے میں اسے سیارۂ مریخ، بلکہ ہو سکے تو عطارد پر بھیج دینا چاہیے تاکہ زمین پر بے علموں کا بوجھ کچھ کم ہو سکے۔ خادم، کم ترین وہیچ مداں آپ کی شاعری کے منفرد لب ولہجے، نثر کے دل نشیں انداز، طنز ومزاح کی بالیدگی و ژولیدگی اور دوسری کچھ اسی قسم کی خصوصیات کی وجہ سے آپ کا مداح وخیر خواہ وغیرہ ہے۔ نیز ملتجی ہے کہ آں جناب، خاکسار کو برائے انٹرویو کچھ وقت اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے نکال کر مرحمت فرمادیں تاکہ راقم السطور وخادم الحروف ہر گیارہ ماہ بعد پابندی سے شائع ہونے والے اپنے سہ ماہی رسالے میں آپ کا انٹرویو چھاپ کر اور اپنے لاعلم قارئین کی معلومات میں بیش بہا اضافہ کر کے عنداللہ ماجور ہو سکے۔ انٹرویو کے لیے اپنی منظوری دے کر اور پر تکلف ڈنر یا لنچ سے پہلے کا کوئی وقت مقرر فرما کر حقیر، فقیر واعلیٰ مدیر کو رسالہ ہذا کے دفتر پر مطلع فرمادیں تاکہ یہ انٹرویو جلد از جلد ریکارڈ کیا جاسکے جو کہ یقیناً اردو زبان وادب کی تاریخ کا ایک یادگار اور تاریخی انٹرویو ہوگا اور جسے آنے والی نسلیں سرمۂ چشم ونظر سمجھ کر آنکھوں سے لگاتی رہیں گی اور جو کہ وغیرہ وغیرہ۔

اپنی تعریف میں اس قدر غیر جانب دارانہ، معروضی اور بے لاگ وبے باک تحریر پڑھ کر کچھ دیر تک میں خوشی سے کانپتا رہا۔ اگرچہ اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھا تھا کہ کسی نے تحریری طور پر کورنش بجائی ہو۔ اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم نہیں کہ کورنش کس طرح بجایا جاتا ہے، آیا یہ کوئی ساز ہے یا کچھ اور نیز اس سے کیسی آواز نکلتی ہے پھر بھی چونکہ اسے میرے احترام میں بجایا گیا تھا اس لیے میں کافی مسرور ہوا اور دیر تک مسرور رہا۔ خط کو بصد اشتیاق دوبارہ پڑھا تو مزید معلوم ہوا کہ مجھے عنداللہ ماجور کا مطلب بھی معلوم نہیں ہے۔ نیز اس پر بھی یقین نہ آیا کہ نئی نسل تو بالوں میں تیل تک ڈالنے کی روادار نہیں، آنکھوں میں سرمہ کیوں کر لگائے گی! پھر بھی ان سب الفاظ کا استعمال چونکہ میری مدح سرائی کے لیے کیا گیا تھا اس لیے پڑھتے وقت یوں معلوم ہوا جیسے لکھنے والے نے خط کے لفظوں میں حقیقتوں کے موتی پرو دیے ہیں۔

بہرکیف میں نے خط میں سب سے نیچے لکھا ہوا ادبی رسالے کے دفتر کا ٹیلی فون نمبر ملایا اور دوسری طرف سے فون اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔ یعنی فون مصروف نہیں تھا۔ تبھی کسی نے فون اٹھایا اور نسوانی آواز میں ہیلو کہا۔ نسوانی آواز سنتے ہی میرا دل اسی طرح اچھل کر حلق میں آگیا جس طرح کسی خوش شکل خاتون کو دیکھ کر آجاتا ہے۔

''ہیلو آپ کون بول رہے ہیں اور کس سے بات کرنی ہے۔'' نسوانی آواز نے پوچھا۔

''جی میں نصرت ظہیر بول رہا ہوں اور اپنے آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب... کیا نام بتایا آپ نے؟...''

''جی میرا نام نصرت ظہیر ہے محترمہ اور مجھے اپنے آپ سے

www.taemeernews.com

بات کر کے یہ بتانا ہے کہ میں انٹرویو دینے کے لیے تیار ہوں، نیز یہ کہ وہ جس دن چاہیں لنچ پر تشریف لائیں اور ڈنر تناول فرما کر ہی جائیں...'' میں نے آسان ترین لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی۔

''پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہیں... ٹھہریے، میں اپنے شوہر کو بلاتی ہوں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور میں سناٹے میں آ گیا۔ یہ ایک دم شوہر کہاں سے بیچ میں آ گیا؟ ہر چند میں نے نسوانی آواز سے کوئی بداخلاقی نہیں کی تھی پھر بھی مجھے شبہ تھا کہ وہ ضرور اپنے شوہر نامراد کو شبہ میں ڈال دے گی، اور شبہ میں چونکہ دنیا کا ہر شوہر شیر بن جاتا ہے خواہ ڈیڑھ پسلی کا ہی کیوں نہ ہو... اس لیے میں دل تھام کر فون پر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک بار خیال آیا کہ کیوں نہ فون خود ہی کاٹ دوں، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری، لیکن تبھی دوسرے کمرے سے بیوی ہانپتی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں، ''یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ کچھ پتہ بھی ہے دوسرے کمرے میں کیا ہو رہا ہے؟''

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں اور بھی سٹ پٹا گیا۔

''ذرا جلدی چلو، اُدھر لینڈ لائن فون پر کوئی مردوا تمھارا نام لے کر چھیڑ رہا ہے... کہتا ہے لنچ پر آؤ اور ڈنر کھا کر جاؤ... ہائے ہائے گول گول آنکھوں سے کیا دیکھ رہے ہو، میرا کلیجہ ہل رہا ہے، جلدی چلو اور اس کی خبر لو...''

ساری بات سمجھ میں آنے پر میں نے اطمینان کا سانس لیا، اور انھیں بتایا کہ نیک بخت وہ کوئی مردوا نہیں میں ہوں۔

''توبہ توبہ...'' انھوں نے دونوں گال پیٹ لیے۔ ''فون پر اپنی بیوی کو چھیڑتے ہو؟ شرم نہیں آتی تمھیں...''

وہ اور بھی نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں، تاہم میں دوسرے کمرے میں پہنچا، ریسیور کان سے لگا کر 'ہیلو' کہا، لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ہیلو... ہیلو... دوسری طرف سے لگاتار خاموشی سنائی دیتی رہی۔ گہری اور مکمل خاموشی... اور میں سوچنے لگا، واقعی، مواصلاتی انقلاب کے اس دور میں آدمی کا اپنے آپ سے رابطہ قائم کرنا کس قدر مشکل ہو گیا ہے!

آخر ایک روز لنچ سے پہلے اپنے بتائے ہوئے مقررہ وقت پر انٹرویو لینے کے لیے میں اپنے گھر پہنچ گیا۔ ڈھائی منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر ہانپتے کانپتے اپنی کال بیل بجائی۔ تیسری یا شاید چوتھی گھنٹی پر کچھ آہٹ سی ہوئی اور دوسری طرف غالباً 'کی ہول' سے جھانکا جانے لگا۔ میں نے بھی سوراخ پر آنکھ لگا دی۔ دوسری جانب ایک خوف ناک آنکھ، مجھے ایک آنکھ سے گھور رہی تھی۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ تبھی آواز آئی اور پوچھا گیا ''کون؟''

میں نے نام بتا دیا، نصرت ظہیر۔ پوچھا گیا ''کس سے ملنا ہے۔'' وہ بھی بتا دیا، نصرت ظہیر صاحب سے۔ اس پر سوال ہوا ''کیا کام ہے؟'' میں نے کہا 'انٹرویو لینا ہے۔' پوچھا گیا ''کس کا۔'' اب میں جھنجھلا گیا۔ ''جناب میں کسی ملٹی نیشنل بنک کا قرضہ وصول کرنے نہیں آیا ہوں جو آپ اس طرح سوال پر سوال کیے جا رہے ہیں۔ میں ایک صحافی ہوں اور اپنے ہم زاد و ہم ذات، جناب نصرت ظہیر نے مجھے انٹرویو لینے کے لیے یہی وقت دیا تھا۔ اب خدا کے لیے یہ نہ پوچھنا شروع کر دیں کہ میں صحافی کیوں ہوں، میری کیا اوقات ہے، کیا نسب ہے، کیا ذات ہے، وغیرہ وغیرہ۔''

''چلیے وغیرہ وغیرہ نہیں پوچھتے۔'' اُدھر سے آواز آئی۔ ''مگر باقی تو بتا دیجیے۔ ذات، اوقات اور حسب و نسب...''

ایک تو زینے کی چڑھائی سے سانس پھولا ہوا۔ اس پر اول جلول سوالات۔ میرا موڈ سچ مچ خراب ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے، آپ سوال کرتے رہیے، میں چلا...'' یہ کہہ کر مڑا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ ''ارے ارے آپ تو برا مان گئے۔'' دروازے میں کھڑے شخص نے کہا جو ناک پر نیچے کو سرکی ہوئی عینک اور رنگے ہوئے بالوں کی وجہ سے خود اپنا ہی بزرگ معلوم ہو رہا تھا۔ مصافحے کی آڑ میں اس نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑا اور یہ کہتے ہوئے اندر لے چلا کہ یہ سوال تو تفنن طبع کے لیے پوچھے گئے تھے ورنہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کس ارادے سے آیا ہوں۔

انٹرویو کے لیے مجھے ایک ایسے کمرے میں بٹھا دیا گیا جو کسی ایڈیٹر کا کمرہ کم اور کباڑی کی دوکان زیادہ لگ رہا تھا۔ دائیں

www.taemeernews.com

کتابیں، بائیں کتابیں، بستر پر کتابیں، سرہانے کتابیں، پاؤں کی طرف کتابیں۔ حتیٰ کہ بند اور کھلی الماریوں میں بھی کتابیں، رسالے، اخبار اور طرح طرح کی فائلوں کے خوف ناک فولڈر رکھے پاٹتے ہوئے تھے۔

"یہ میری خواب گاہ ہے۔" انھوں نے اعلان کیا۔

"اور آپ سوتے کہاں ہیں۔" میں نے چاروں طرف نگاہ ڈال کر پوچھا۔

"کیا مطلب؟" انھوں نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔ "میرا خیال ہے آپ اپنے انٹرویو تک محدود رہیں تو ٹھیک ہے۔"

میں بھی سمجھ گیا کہ اگر اس تنک مزاج شخص کے ساتھ وقت ضائع نہیں کرنا ہے تو انٹرویو ایک دم شروع کر دینا چاہیے۔

"اچھا چلیے انٹرویو شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلے انٹرویو کے اس مشہور ترین سوال کا جواب دیجیے کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے۔" میں نے ایک اسٹول نما کرسی پر خود کو بٹھا کر پوچھا۔

"بڑا ہی واہیات اور فضول ترین مشہور سوال ہے۔ بھئی سب لوگ اپنے وقت پر پیدا ہوتے ہیں اور جگہ بھی کم و بیش ایک ہی ہوتی ہے کوئی پلنگ، چارپائی یا اسپتال کا زچگی وارڈ وغیرہ۔ آگے بڑھیے..." انھوں نے اپنے بستر کے بیچوں بیچ سے کتابیں سرکا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"چلیے پھر اپنے والدین کے بارے میں ہی کچھ بتائیے۔" میں نے محتاط ہو کر پوچھا۔

"میرے والدین خود اپنے والدین کی اولاد ہیں جو بذاتِ خود اپنے اپنے والدین کی اولاد ہوا کرتے تھے جن کے والدین خود بھی... میرا مطلب ہے ہمارے یہاں شروع سے ہی والدین کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اگلا سوال۔"

"یہ بتائیے آپ نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی اور کہاں تک حاصل کی۔"

"غالباً کسی اسکول میں۔ یا شاید مدرسے میں۔ یا پھر مسجد میں۔ بہت پرانی بات ہو گئی ہے۔ ٹھیک سے یاد نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کسی لائبریری میں حاصل کر لی ہو۔ دراصل میرا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ ابتدائی تعلیم کا مجھے شروع ہی سے اتنا شوق تھا کہ کہیں سے بھی حاصل کر لیتا تھا۔ ایک دفعہ تو میں نے سب کی نظر بچا کر ریڈیو سے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ مگر والد صاحب نے پکڑ لیا۔ شاید انھیں غلط فہمی تھی کہ میں بھی انھی کی طرح ریڈیو پر لتا منگیشکر کے گانے سنتا ہوں۔ جب کہ ایسا نہیں تھا۔ میں محمد رفیع کے گانے بھی شوق سے سنتا تھا۔ بعد میں آشا بھونسلے، مکیش، منا ڈے اور سی ایچ آتما بھی اچھے لگنے لگے۔ اوفوہ! آتما صاحب اتنے نچلے سُر اور اتنی بھاری آواز میں گاتے تھے کہ آس پاس رکھے ہوئے تانبے پیتل کے برتن بھی لرزنے لگتے۔ ایک بار میں نے ان کے سُر میں سُر ملا کر 'پریتم آن ملو...' گانے کی کوشش کی تو گلے سے کچھ ایسی عجیب و غریب آوازیں برآمد ہونے لگیں کہ گلی کے کتوں میں جھگڑا ہو گیا اور وہ نہ جانے کیوں کافی دیر تک ایک دوسرے پر بھونکتے رہے۔ میرا خیال ہے یا تو ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہو گی یا پھر یہ غلط فہمی کہ ان ہی میں سے کوئی کسی گانے کی نقل کر رہا ہے۔ دراصل کتوں کو نقالی سخت ناپسند ہے۔ کبھی آپ کسی کتے کے سامنے اس کی نقل اتار کر دیکھیے، وہ آپ پر چڑھ دوڑے گا... ہاں، آپ کیا پوچھ رہے تھے..."

"میں ابتدائی تعلیم کی بات کر رہا تھا..."

"ہاں آپ نے پوچھا تھا کہ میں نے کہاں تک ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب میرے ابتدائی تعلیم کے استادوں کو اچھی طرح یقین ہو گیا کہ انھیں ابتدائی تعلیم کی جتنی باتیں معلوم تھیں وہ سب مجھے پڑھا چکے ہیں تو انھوں نے مجھے ثانوی تعلیم کی کلاس میں داخلہ دے دیا۔ مگر مجھے تو ابتدائی تعلیم کا چسکا لگ چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ثانوی کلاسوں میں بھی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ثانوی سے آگے بڑھا تو اس میں بھی مجھے ابتدائی تعلیم کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ سب طرح کی تعلیموں سے فارغ ہو کر پانچ بچا کر میں کافی دور نکل آیا مگر صاحب مجال ہے جو اس ابتدائی تعلیم نے میرا پیچھا چھوڑا ہو۔ آج اتنے برسوں بعد بھی کہتی رہتی ہے کہ مجھے حاصل کرو، مجھے حاصل کرو۔ آخر حد ہوتی ہے

www.taemeernews.com

کسی بات کی۔ یقین کیجیے کہ اب تو یہ کم بخت ابتدائی تعلیم میری عادت ثانیہ مرزا... معاف کیجیے عادت وہ بن چکی ہے کیا کہتے ہیں اسے...''

''عادتِ ثانیہ!''

''جی ہاں وہی۔ جہاں جاتا ہوں، جس سے ملتا ہوں، جو دیکھتا ہوں جو سنتا ہوں اس سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے لگتا ہوں۔ پھر بھی یہ کم بخت ہے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ رات دن خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میرے معبود، میرے پروردگار، میرے وغیرہ وغیرہ... مجھے اس سے نجات دلا۔ یا تو اسے مکمل کردے یا مجھے اٹھا لے...'' انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ میں ان کی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ چھوٹے سے کمرے کا ماحول بوجھل ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے ماحول بدلنے کے لیے وہی ذکر چھیڑ دیا جو عموماً ماحول بدلنے کے لیے لوگ چھیڑ دیا کرتے ہیں۔

''آج کل موسم بڑا عجیب ہے۔ یہ بتائیے آپ کا پسندیدہ موسم کون سا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ گیلی آنکھوں میں شرارت چمکنے لگی۔

''یہ آپ نے سب سے اچھا سوال کیا۔ سردیوں میں مجھے موسم گرما، گرمیوں میں موسم باراں اور برسات میں موسم سرما سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس لیے یقین سے کسی ایک موسم کے بارے میں نہیں کہہ سکتا۔ میرے خیال سے موسموں کی ترتیب میں کچھ خامی ہے۔ مئی جون میں کڑاکے کی ٹھنڈ پڑتی اور دسمبر جنوری میں لو کے جھکڑ چلتے تو کتنا اچھا رہتا۔''

''اور موسم بہار کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''اف! یہ آپ نے کس موسم کا ذکر کر دیا۔ یہی تو میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ موسم آتا کب ہے۔ کچھ لوگ مارچ اپریل کہتے ہیں۔ مگر ان دنوں میں عموماً پت جھڑ ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اگست ستمبر میں بتاتے ہیں۔ مگر ان دنوں یا تو بارش رہتی ہے یا اُمس پڑتی ہے۔ اردو کا شعری ادب بہار اور خزاں کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ بہار آتے ہی گریباں پھاڑنے اور خزاں آتے ہی سرسام شروع ہو جانے کی باتیں اکثر شاعر کرتے ہیں مگر کسی شاعر کو توفیق نہیں ہوئی کہ ان مہینوں کا ذکر بھی کر دیتا جب اس پر یہ اول جلول کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ اطبا بھی اس بارے میں ٹھیک سے نہیں بتاتے سوائے اس کے کہ جب مطب میں مریضوں کی بھیڑ ہو تو بہار ہے ورنہ خزاں۔ خود مجھ پر یہ کیفیات کئی بار طاری ہوئی ہیں۔ مگر اس سے بھی کچھ نہ کھلا۔ جب جب اپنا اور اپنے سے زیادہ دوسروں کا گریبان پھاڑنے کو جی چاہا، خیال گزرا کہ ہو نہ ہو یہی موسم بہار ہے۔ مگر کیلنڈر پر دیکھا تو جون چل رہا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ سرسام چڑھنے پر خزاں کا شبہ ہوا تو پتہ چلا جنوری ہے۔ غرض یہ عمر ہونے کو آئی مگر آج تک موسم بہار کے درشن نہ ہوئے۔''

''بہت خوب۔ ویسے آپ کی عمر کیا ہے۔''

''دیکھیے، ادیب سے، خاص طور سے اردو ادیب سے اس کی عمر پوچھنا بری بات ہے۔ لیکن آپ اپنے آدمی ہیں اس لیے موجودہ سنہ میں سے سال پیدائش منہا کر کے حاصل منہا سے شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کے سال گھٹا دیں کیونکہ وہ علی الترتیب والدین اور منکوحہ شریف کے حکم کے بموجب گزارے گئے سال تھے۔ پھر اس میں سے بھی ابتدائی تعلیم والا وہ زمانہ منہا کر لو جو اساتذہ اور ممتحن حضرات کے اطمینان اور تشفی کے لیے گزارا گیا، اس کے بعد ایک آدھ برس باقی رہ جائے تو اسے اتفاقیہ حادثہ یا راؤنڈ فیگر بنانے کے لیے چھوڑ دو۔ سچ پوچھو تو اپنے لیے ایک برس بھی نہیں گزارا ہے۔ یوں سمجھو کہ میری عمر صفر ہے۔ گول گول زیرو۔''

''مگر اس حساب سے تو آپ کی عمر مائی نس minus پندرہ سال ہو جائے گی۔ یعنی آپ کی پیدائش میں بھی ابھی پندرہ سال باقی ہیں۔'' میں نے کہا تو آنکھیں اور چمکنے لگیں۔ بولے: ''واہ! مسلمان ہونے کے باوجود کیا صحیح حساب لگایا ہے۔ سچ کہا۔ اردو کے ہر ادیب کی ادبی ولادت کم از کم پندرہ سال بعد عمل میں آتی ہے۔ آؤ اسی بات پر لنچ ہو جائے۔ باقی انٹرویو پھر سہی۔''

''مگر ابھی تو لنچ کے وقت میں کچھ دیر ہے۔''

''کیا بات کرتے ہو۔ ظہر کی اذان ہو چکی۔ مومن پر ظہرانہ فرض ہو گیا۔ مجھے کیا اپنی طرح بے دین سمجھ رکھا ہے؟'' انھوں نے مجھے بازو پکڑ کر اٹھا لیا۔

☆......☆......☆

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

امروہے کا جو ذکر کیا!

غالب نے کہا تھا:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اسی طرح میر سے منسوب ہے کہ لکھنؤ میں موصوف نے آہ بھری تو دل سے دلّی ہی کی ہوک اٹھی:

جس کو فلک نے لوٹ کے تاراج کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

ایک اور مرحوم ادیب نے جن کا شمار آئی اے کے پروردہ اعلیٰ اردو ادیبوں میں ہوتا ہے شاعری تو کی دہلی میں، لقمے توڑتے رہے امریکہ والوں کے مگر جب خود اپنے اوپر کتاب لکھی تو نام رکھا 'لاہور کا جو ذکر کیا!'

خود ناچیز کم ترین بھی پیدا ہوا سکندرا باد میں، عمر کا نصف حصہ گزارا دہلی میں، لیکن جب خواب دیکھتا ہے تو منظر اس میں خواہ دفتر واقع سہارا کمپلیکس نوئیڈا کا ہو، کھڑکیاں اس کی کھجور تلے یا خانی باغ ضلع سہارنپور میں ہی کھلتی ہیں۔ خواب میں نظر آنے والے شہر کا نام چاہے لندن یا قاہرہ ہو مگر پل کمبوہان اور بازار نخاسہ اس میں ضرور نظر آتے ہیں بھلے ہی ان کا نام ٹیمس برج اور پکاڈلی سرکس کیوں نہ رکھ دیا گیا ہو۔

لیکن صاحب جیسی دیوانگی میاں بقراطی کی شخصیت میں امروہہ کے لئے دیکھی ویسی نہ کہیں سنی نہ پڑھی۔ کہنے کو وہ ہمارے پڑوس میں چائے کی چھوٹی سی دوکان چلاتے ہیں، جہاں چائے اس قدر عمدہ ملتی ہے کہ بندھے ہوئے گاہک دور دور سے اسے پینے آتے ہیں۔ چنانچہ دوکان کافی چلتی ہے۔ لیکن دوکان سے بھی زیادہ چلتی ہے ان کی زبان جو ہر ایک موضوع کو فلسفے میں اور ہر فلسفے کو امروہے میں اس طرح تبدیل کر دیتی ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو مجھے ان کی چائے سے زیادہ ان کی باتوں میں زیادہ مزا آتا ہے۔ اصلی نام ان کا شبراتی ہے کہ شب برات کے روز پیدا ہوئے تھے، لیکن قابلیت ایسی بلا کی بھری ہوئی ہے کہ کسی نے ایک دن ان کی ناقابلِ فہم فلسفیانہ باتوں سے جھنجلا کر کہہ دیا کہ تم شبراتی ہو یا بقراطی، ذرا دیر کو چپ نہیں بیٹھ سکتے؟ یہ سنتے ہی میاں شبراتی نے چائے کا گلاس نہ جانے کس زاویئے سے اس شخص کو پکڑایا کہ خود تو اپنی گدی سے لڑھک کر پیچھے گر گئے اور تمام کھولتی ہوئی چائے چھلک کر، بلکہ اچھل کر گاہک کے منہ پر جا پڑی۔ ادھر لوگ میاں شبراتی کو سنبھالتے رہے اور اُدھر گاہک درد سے چیختے ہوئے اپنے منہ کو پونچھتا اور اپنے سفید کرتے پر پڑی ہوئی چائے کے داغ رومال سے صاف کرتا رہ گیا۔

بعد میں ہمدرد گاہکوں نے اس شخص کے غیر مہذب انداز پر میاں شبراتی کے اضطراری ردِّ عمل کی خوب خوب تعریف کی۔ لیکن اسی دن سے ان کا نام بقراطی پڑ گیا۔ لوگ بہت جلد شبراتی کو بھول گئے اور اس کی جگہ بقراطی نے لے لی۔ پھر یہ نام ان پر بجتا بھی خوب تھا۔ ان کی باتیں ہی ایسی ہوتی تھیں۔ چائے کو ہی لے لیجئے۔ پورا علاقہ ان کی چائے کا دیوانہ تھا پھر بھی وہ خود اس کے سب سے بڑے نکتہ چیں تھے۔ کہتے تھے: ''اجی یہ بھی کوئی چائے ہوئی۔ بار بار اونٹی ہوئی چائے میں تازہ چائے ملائے جا رہے ہیں، ایک ایک چائے کو دس دس ابال دیئے جا رہے ہیں،

www.taemeernews.com

اس میں ادرک اور الائچی کے دانے ڈال کر جوش دیا جا رہا ہے، لاحول ولا قوت۔ چائے نہ ہوئی جوشاندہ ہو گیا۔ ایک دفعہ تو جی میں آیا کہ ادرک اور الائچی کے ساتھ کچھ پیاز، ہینگ اور کالی مرچ بھی بھگونے میں ڈال لوں، جو ہو گی دیکھا جائے گا، مگر پھر بیوی بچوں کا خیال آ گیا۔ میاں قسم خدا کی، چائے تو ہمارے امروہہ میں بنتی تھی۔ بالکل نخالص۔ خوشبو ایسی کہ ہمارے گھر سے دوسرے محلّے تک جاتی تھی۔ سچ۔ یقین کیجئے۔ ارے آپ ہنس رہے ہیں...''

''لگتا ہے آپ کے یہاں چائے کیتلی کی بجائے دیگ میں بنتی ہوگی...'' میں نے ہنس کر کہا۔

''نہیں خیر بنتی تو چھوٹی کیتلی میں تھی، لیکن جیسے ہی چائے کی کیتلی انگیٹھی پر سنسناتی، مرزا علیم بیگ، جو میرے والد کے جگری دوست تھے کھانستے ہوئے پردہ ہٹا کر گھر میں آ دھمکتے۔ اور ایسا تقریباً ہر روز ہوتا تھا۔ اب آپ بتائیے۔ رہتے تھے وہ دوسرے محلّے میں۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ اِدھر چائے انگیٹھی پر چڑھی اور اُدھر مرزا صاحب نازل۔ بلکہ ایک دفعہ تو انہوں نے صاف کہا بھی کہ میاں رمضانی کیا کروں تمہارے گھر چائے اتنی عمدہ بنتی ہے کہ اس کی مہک مجھے دور سے کھینچ لاتی ہے۔ اب کہئے!''

صرف چائے میں نہیں دنیا کی ہر بات میں ان کا امروہہ بسا ہوا تھا۔ آپ کسی موضوع پر کوئی بھی بات کیجئے وہ امروہہ کو بیچ میں لائے بغیر نہیں رہیں گے۔ آم کا ذکر ہو تو امروہہ سے اچھا آم کہیں کا نہیں ہوتا یہ بات اکثر امروہیوں کے منھ سے سنی ہے۔ میاں بقراطی سے بھی سنی۔ میں نے مقابلے پر ملیح آباد کے آم رکھ دیئے۔ بلکہ ذرا رگ حمیت پھڑکی تو بہٹ کے آموں کا بھی ذکر لے آیا جو سہارنپور کا ہی قصبہ ہے اور جہاں ایک عرصہ تک آموں کا قومی میلہ بھی لگا کرتا تھا۔ میاں بقراطی صبر سے میرا بیان سنتے رہے اور پھر بڑے اطمینان سے بولے: ''برخوردار، کچھ بھی کہو، آم صرف امروہہ کا ہوتا ہے۔ باقی سب عوام ہیں۔ آیا عقل شریف میں؟''

ایک بار چائے کی دوکان کے آگے سڑک پر کوئی بلّی کسی گاڑی کے نیچے آ کر زخمی ہو گئی۔ پھر کیا تھا، شام ہونے تک کوئی درجن بھر امروہی بلّیاں میاں بقراطی کی زبان سے کانوں کا دماغ چاٹتی رہیں۔ میں جب پہونچا تو شاید تیرہویں بلّی کا ذکر خیر چل رہا تھا۔ ''میاں ایسی گھیم شحیم اور نیک اور دین دار بلّی نہ اس سے پہلے کہیں دیکھی نہ بعد میں۔ ریڈیو پر کلام پاک آ رہا ہو تو اس کے سامنے ایسے خشوع و خضوع سے جا بیٹھتی تھی کہ ہم کھیلتے بچّوں کو بھی اسے دیکھ کر شرم آ جاتی۔ اذان ہوتے ہی کسی کونے میں دبک کر ایسے بیٹھ جاتی تھی کہ آنکھوں کے آگے سے کوئی چوہا انھلاتا ہوا سینہ تان کر بھی گزر جائے تو پلک نہ جھپکاتی۔ اس کے باوجود رعب اور جلال ایسا تھا کہ دوسری بلّیوں کے برعکس بڑے شہانہ انداز میں اس طرح سڑک پار کرتی جیسے کوئی کتا ٹہل رہا ہو۔ بلکہ ایک بار تو آپ یقین نہیں کریں گے میں نے اپنی آنکھوں سے چشم خود یہ چشم دید منظر دیکھا کہ وہ پیچھے پیچھے تھی اور ایک کتا بچنے کے لئے آگے آگے بھاگا جا رہا تھا۔ ارے آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟ بھائی صاحب وہ کہیں اور کی نہیں امروہہ کی بلّی تھی۔ خدا بخشے میرے دادا تو اپنے ساتھ اسے حج پر لے جانے والے تھے مگر سعودیوں نے اجازت ہی نہیں دی۔''

ایک روز آزمانے کے لئے میں نے ایک ایسا ذکر چھیڑا جس کا امروہے سے وہ کوئی تعلق نہیں جوڑ سکتے تھے۔ میں نے انہیں دوبئی میں دنیا کا سب سے اونچا کمرشیل ٹاور تعمیر ہو جانے کی خبر سنائی جس کی ایک سو ساٹھ منزلیں ہیں اور بلندی 828 میٹر۔ یہ بتا کر میں ان کا منھ دیکھنے لگا۔ نزول امروہہ میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ''دوبئی کی ایک عمارت اتنی اونچی ہے مگر خود وہ کتنا اونچا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' میں ٹپٹا گیا۔

''مطلب یہ عزیزم کہ دوبئی سطح سمندر پر واقع ہے۔ جبکہ امروہہ دوبئی سے ماشا اللہ 240 فٹ کی بلندی پر بسا ہوا ہے۔ پورے ایک قطب مینار کی اونچائی پر!'' انہوں نے کہا اور

www.taemeernews.com

میں ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

ایک دن میں پتہ نہیں کس ذہنی کیفیت میں تھا کہ ان کے امروہے پن پر غصہ آگیا۔ ''یار بقراطی صاحب۔ مجھے لگتا ہے آپ کو امروہہ کی بیماری ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے آپ جلدی سے کسی ماہر نفسیات سے رجوع کیجئے۔ ایک ہی زندگی میں اتنا سارا امروہہ ٹھیک نہیں ہے۔''

میری بات اور لہجے کا ایسا اثر ہوا کہ چائے کا برتن اٹھاتا ہوا ان کا ہاتھ رک گیا اور عجیب سی خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر دھیمی آواز میں بولے۔ ''میاں آپ امروہے کے نہیں ہیں اس لئے کہہ رہے ہیں۔ ذرا اندر تک جھانک کر دیکھئے۔ ایک امروہہ ہر دل میں جاگتا پائیں گے۔ کہیں اس کا نام لکھنؤ ہوگا، کہیں بجنور، کہیں سہارنپور تو کہیں سکندرآباد۔ کوئی اسے لاہور کہتا ہے کوئی کلکتہ۔ یہ سب امروہے ہماری ہجرتوں نے آباد کئے ہیں۔ ان میں ہمارے ماں باپ بھی رہتے ہیں بھائی بہن بھی۔ ہمارا بچپن بھی ہمارا لڑکپن بھی۔ غور سے دیکھئے یہ امروہہ آپ کے اندر بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ وہ گانا یاد ہے متاڈے کا؟

ماں کا دل بن کر کبھی سینے سے لگ جاتا ہے تو
اور کبھی ننھی سی بیٹی بن کے یاد آتا ہے تو
جتنا یاد آتا ہے مجھ کو اتنا تڑپاتا ہے تو
تجھ پہ دل قرباں...

یہ رومال لے لیجئے۔ شاید آنکھ میں کچھ گر گیا ہے۔''

میں نے ان کے ہاتھ سے رومال لے لیا۔ مجھے واقعی اس کی ضرورت تھی۔۔

☆

بم لہری

راجستھان کی ریت میں جب بائنڈروجن بم چھوڑا گیا تو میاں عبدالقدوس نے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا۔ ''بم تو ہمارے خمیر اور ضمیر میں شروع سے شامل ہے۔ لہٰذا بم بنانا ہمارا پیدائشی حق ہے۔''

ہم نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

بولے۔ ''ہم شنکر جی کے پجاری ہیں۔ دن رات بم بھولے کا جے کارا لگاتے ہیں اور وہ ہمارا مشہور لوک گیت نہیں سنا تم نے۔ بم بم بم بم لہری۔ اس میں تو اتنا بم ہے کہ اسے گیت سے نکال دو تو صرف لہری باقی بچتی ہے۔ پھر ہمارے ریت رواج دیکھ لو۔ شادی بیاہ میں بارات نکلے تو بم چھوڑتے ہیں۔ لڑکی والے کے یہاں پہنچیں تو بم کا گولا داغتے ہیں کہ لو بھئی ہوشیار باش، ہم آگئے ہیں۔ اس کے بعد دلہن لے کر جاتے ہیں تو پھر بم چلائے جاتے ہیں تا کہ پورے شہر کو بارات کی باعزت واپسی کا پتہ چل جائے۔ پرانے زمانے میں بادشاہ حضرات اولاد کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئے ہوں اور اپنی موت آپ مرے ہوں تب بھی بم چھوڑے جاتے تھے اور نئے بادشاہ کی تاج پوشی ہوتی تھی تب بھی بم کا گولہ چھوٹتا تھا تا کہ تمام رعایا اچھی طرح جان جائے کہ نئی حکومت آگئی ہے اور اب ڈاکہ، چوری، زنا، اغوا، قتل، جنگ اور لوٹ مار، سب کام نئے بادشاہ کے حکم سے ہوں گے! آج بھی جب کوئی غیر ملکی صدر یا بادشاہ ملک کے دورے پر آتا ہے یا پندرہ اگست اور چھبیس جنوری پر ہم قومی پرچم لہرتے ہیں تو توپوں کی سلامی دی جاتی ہے اور توپ میں بندوق کی گولیاں نہیں بم کے ہی گولے رکھ کر چھوڑے جاتے ہیں۔ پھر یہ جنگجو، اور آتنک وادی کیا کرتے ہیں۔ یہ تو کسی رسم و رواج کے بغیر بھی، بلاوجہ، یوں ہی شوقیہ طور پر بموں کے دھماکے کرتے رہتے ہیں۔ دیکھ لو، پچھلے دنوں ممبئی مدراس اور دہلی میں کتنے بم دھماکے ہوئے۔ درجنوں بے قصور مارے گئے اور سیکڑوں بے قصور پکڑے گئے۔ تو میاں، جب ادنیٰ سے ادنیٰ، گرے سے گرا دہشت گرد بھی بم چلالیتا ہے تو سرکار کیا کسی سے کم ہے۔ کیا اُسے بم بنانے کا حق نہیں۔ اور وہ بھی تب جب کہ ہمارے کلچر اور سوسائٹی میں یہاں سے لے کر وہاں تک بم ہی بم چل رہے ہیں___''

تقریر اتنی مدلل اور پر اثر تھی کہ ہم کافی دیر تک بید لرزاں کی طرح لرزتے رہے۔

(بم لہری، نمی دانم)

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

مسلمان اور پیاز

(ان دنوں لکھا گیا جب ملک میں پیاز کی قلت تھی اور کئی جگہ چناؤ ہونے والے تھے)

صاحب ،اس ملک میں سیکڑوں قومیں اور ہزاروں ذات برادریاں قرن ہا قرن سے موجود ہیں۔ پگڑی والے سکھ ہیں، شراب اور سور کو یکساں حلال ماننے والے کرسٹان ہیں،صرف دن کے اجالے میں کھانے پینے ،یعنی رات کا روزہ رکھنے والے جین حضرات ہیں،خود اپنا ہی سر منڈا لینے والے بودھ ہیں، لاکھوں دیوی دیوتاؤں کو ماننے اور نہ بھی ماننے والے قسم قسم کے ہندو ہیں اور اپنے نام کے ساتھ کوئی نہ کوئی والا لگانے والے پارسی ہیں (باٹلی والا، دارو والا وغیرہم) اور ان کے علاوہ بھی بہت سے والے ہیں۔

لیکن جب الیکشن کا زمانہ آتا ہے تو سب کو بس ایک ہی والے کی تلاش رہتی ہے۔حلال گوشت کھانے والے مسلمان کی!

یعنی مسلمان نہ ہوئے پیاز ہو گئے۔ان معنوں میں نہیں کہ چھلکے اتارتے جاؤ، اتارتے جاؤ اور آخر میں بھی بس چھلکا ہی ہاتھ آئے۔ بلکہ اس مفہوم میں کہ بینگن بھی ہیں، آلو بھی ہیں، ٹنڈے بھی ہیں، مولی بھی ہے، مگر پیاز نہیں تو کوئی سبزی ترکاری ذائقہ نہیں دیتی۔جس طرح آج کل نہیں دے رہی ہے۔ اور حکومت بے چاری پاکستان سے پیاز درآمد کرنے پر مجبور ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ اپنے ملک میں مسلمان بہ افراط دستیاب ہیں اور انہیں پاکستان یا بنگلہ دیش سے درآمد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ملک میں جہاں جائیے،ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں!خاص کر گندی بستی اور جیلوں میں۔

ویسے یہ پاکستان سے پیاز خریدنے کی بھی خوب رہی۔ یوں سمجھئے کہ حکومت نے جو اعلان کیا ہے، اس کی رو سے، دو چار ہفتوں کے بعد ہم اپنے اپنے گھروں میں ہندوستانی کی بجائے پاکستانی پیاز کتر رہے ہوں گے۔ جو سنا ہے اتنی ہی کسیلی اور رسیلی ہوتی ہے جتنی ہندوستان اور بنگلہ دیش کی! کسی کی پیاز سے بھی گودا نہیں نکلتا۔بس چھلکے ہی چھلکے نکلتے ہیں۔ کچھ کچھ یہی حال تینوں ملکوں کے مسلمانوں کا ہے۔

اطبا پیاز کے طبی خواص کی وجہ سے اس کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں پیاز قدرت کی بخشی ہوئی بڑی بیش قیمت شئے ہے۔ شئے یوں کہ ابھی تک یہ طے نہیں ہو پایا ہے کہ پیاز سبزی ہے، پھل ہے، میوہ ہے یا محض بدبو ہے۔لسانیات کے ماہر تو اس کی جنس بھی طے نہیں کر پائے ہیں کہ مذکر ہے یا مونث۔بس اسے جنسِ بازاری کی شق میں ڈال دیا ہے اور کہتے ہیں کہ جنسی معاملات سے بھی اس جنس کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ جہاں تک تذکیر و تانیث کا تعلق ہے تو کچھ لوگ اسے مذکر سمجھ کر کھاتے ہیں مگر زیادہ تر مونث مان کر ہی مزا لیتے ہیں۔اور رہ گئی اس کی خوبیوں کی بات تو ایک پہونچے ہوئے (پتہ نہیں کہاں پہونچے ہوئے) حکیم کا کہنا ہے کہ، بخدا اگر پیاز میں بدبو نہ ہوتی تو ایک عدد پیاز ہزار دینار میں بھی سستا تھا/تھی۔

مسلمانوں کی، خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں کی بات بھی یہی ہے۔مذکورہ حکیم یہاں ہوتا تو یقین کیجئے، اپنے قول میں 'پیاز' کی جگہ 'مسلمان' کہہ جاتا، جو جمعہ کے جمعہ نہاتے ہیں پھر بھی (یا شائد اسی لئے) بدبو دیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

بلکہ یوروپ کے ایک مفکر نے (جسے پتہ نہیں کس بات کی فکر تھی) مسلمانوں کے بارے میں اس سے ملتی جلتی ایک بات کہہ بھی دی ہے۔ کہتا ہے: اسلام بہترین مذہب ہے اور مسلمان بد ترین قوم! بات تلخ ہے، ناگوار ہے، مگر سچ ہے۔ پیاز کی بدبو کی طرح!

پھر بھی الیکشن کا زمانہ ہو تو اپنے دیش میں بھی برے مسلمان سب کو بھلے لگنے لگتے ہیں۔ پیاز کے بغیر ترکاری اچھی نہیں بنتی اور مسلمان کے بغیر چناؤ کی ہانڈی نہیں پکتی۔

چنانچہ آج کل دونوں کے بھاؤ چڑھے ہوئے ہیں۔ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ پیاز مسلمانوں کی قیمت تک پہونچ گئی ہے یا مسلمان پیاز کے بھاؤ تک بلند ہو گئے ہیں۔ یہ تو پاکستانی پیاز اور لوک سبھا چناؤ کے نتائج آنے کے بعد ہی پتہ چل پائے گا کہ کون بڑا ہے اور کس کی اوقات زیادہ ہے۔ پیاز کی یا مسلمان کی؟

پیاز اور مسلمان کی قیمتیں بڑھنے چڑھنے کا یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار دونوں کے دام آسمان چھو چکے ہیں اور پھر واپس زمین پر آ چکے ہیں۔

اقتصادیات کے ماہر کہتے ہیں پیاز کہنے کو ہے تو ایک معمولی سی چیز، لیکن معیشت سے اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ جب جب پیاز کے دام چڑھتے ہیں شیئر بازار گر جاتا ہے۔

چنانچہ آج کل بھی ممبئی کا سینسیکس اور نیشنل انڈیکس لڑھکا ہوا ہے۔ اور تو اور روپے کی قیمت بھی لگاتار گر رہی ہے۔

یہ روپے کی قیمت بھی جناب عجیب چیز ہے۔ خادم کی سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ کہ روپیہ سستا یا مہنگا کیسے ہوتا ہے۔

جب بھی پنواڑی کو دس کا نوٹ دے کر تین روپے کا پان لیا ہے تو اس نے ہمیشہ تین روپے ہی کاٹے ہیں۔ وہی ماہرین جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، کہتے ہیں کہ روپے کی قیمت اب اتنی کم ہو گئی ہے کہ کہ سو پیسے والا ایک ہندوستانی روپیہ، سن ساٹھ کے مقابلے میں پندرہ پیسے کا رہ گیا ہے۔ جب کہ خاکسار کو آج تک کوئی دوکاندار یا بنک ایسا نہیں ملا جو پندرہ تو چھوڑیئے، پچاس ساٹھ پیسے میں ہی ایک روپیہ عنایت کر دے۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ روپے کی قیمت افراطِ زر سے گھٹتی ہے اور افراطِ زر وہ بیماری ہے جو معیشت کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔ چہ خوب! عام لوگ بے چارے دن رات ایک کر کے چند روپے کما پاتے ہیں اور صبح شام روپے کی کمی کا رونا روتے ہیں، اور آپ ہیں کہ افراطِ زر کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اگر افراطِ زر اتنی ہی بری چیز ہے، اور اس سے ملکی معیشت کو اتنا ہی نقصان پہونچتا ہے تو ٹاٹا برلا اور امبانی کو افراطِ زر کے جرم میں گرفتار کیوں نہیں کر لیتے۔ ارے بھئی سیدھی سی بات ہے۔ جتنی افراطِ زر ہو گی اتنی ہی زر کی افراط ہو جائے گی۔ اتنا ہی زیادہ ملک میں روپیہ ہو گا۔ اور پھر اتنی ہی زیادہ لوگوں کی جیب بھاری ہو جائے گی۔ اب بتایئے۔ اس میں رونے دھونے اور فکر مند ہونے کی کیا بات ہے؟

فدوی کی تو یہ دعا ہے کہ افراطِ زر خوب بڑھے۔ اتنی بڑھے کہ غریب کے گھر میں بھی افراطِ زر پائی جانے لگے۔ روپیہ خوب سستا ہو۔ اتنا سستا ہو جائے کہ مفت ملنے لگے۔ سب کی جیبیں نوٹوں سے بھر جائیں۔ لوگ بنکوں میں جائیں اور اپنی ضرورت کے مطابق تھیلوں میں روپے بھر کر گھر لے آئیں۔ بازاروں میں روپیہ دس روپے نہیں تو سو روپے کلو ہی ملنے لگے۔ آمین! ثم آمین!

میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ پتہ نہیں کیا کہنا چاہتے ہیں یہ ماہرینِ اقتصادیات۔ پیاز، شیئر بازار، افراطِ زر، روپئے کی قیمت۔ عجیب گورکھ دھندا ہے صاحب! مسلمان کا حساب سیدھا ہے۔ الیکشن ہوں تو مہنگا ہو جاتا ہے۔ اور الیکشن گزر جائیں تو کوئی دھیلے کو نہیں پوچھتا۔ البتہ یہ پہلا موقع، بلکہ حسنِ اتفاق ہے کہ مسلمان کے ساتھ پیاز بھی مہنگی ہو گئی ہے۔ اور یہ بات خود مسلمان کے لئے خاصی تکلیف دہ ہے۔ کیوں؟ تو سنئے۔ یوں تو مانا جاتا ہے کہ نیا نیا مسلمان پیاز بہت کھاتا ہے۔ لیکن دیکھنے میں

www.taemeernews.com

آیا ہے کہ پرانے مسلمان بھی کافی پیاز کھا جاتے ہیں۔ بے چاری چٹنی اور نہاری پر گزر بسر کرنے والی قوم کبھی کبھی ذائقہ بدلنے کے لئے انڈے آملیٹ کا سہارا لے لیا کرتی تھی، اب پیاز کی قلت نے اسے بھی ایک لگژری بنا دیا ہے۔ پیاز کے ساتھ لذتِ آملیٹ بھی گئی۔ ان حالات میں اسے ملتِ بیضا کہنا بھی دل کو دکھانے والی بات ہے۔

دراصل پیاز سے مسلمان کا رشتہ بڑا پرانا ہے۔ مغلِ اعظم بلیک اینڈ وہائٹ کے دربار میں جو نو رتن تھے، ان میں ایک مسلمان اس قدر پیاز کھاتا تھا کہ اس کی عرفیت ہی دو پیازہ ہوگئی تھی۔ اور ظاہر ہے وہ خاصا پرانا مسلمان تھا۔ تقریباً ساڑھے چار سو سال پرانا۔ (ملا دو پیازہ تاریخ کا پہلا اور آخری ملا ہے جس نے ایک ترکاری کو اپنی عرفیت بنا کر مسلمان اور پیاز کے باہمی تعلق کا ایک تاریخی حوالہ فراہم کیا اور دونوں کی نسبت کی طرف بھی ایک بلیغ اشارہ کر دیا۔ یعنی، ایک ملا: دو پیاز)

ایک بات اور، پیاز میں مذکورہ بالا پہونچے ہوئے حکیم کے بقول چاہے جتنی بد بو ہو، لیکن جب گھی میں تل کر اس کا بگھار ترکاری میں لگاتے ہیں تو بگھار کی سگندھ نتھنوں سے ہوتی ہوئی سیدھی روح میں اتر جاتی ہے اور حقیر سے حقیر دال کو بھی شاہی پکوان بنا دیتی ہے۔

مسلمانوں کا بھی ان دنوں یہی حال ہے۔ ہر پارٹی اپنی سیاست اور چناؤ کی ہانڈی میں مسلمانوں کا بگھار لگانے کے چکر میں ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس بگھار کی سگندھ روح میں اترتی ہے یا کرسیِ اقتدار پر جلوہ افروز ہونے والوں کے شکم میں۔ اللہ رحم کرے!

☆......☆......☆

عادتیں

بھائی الیاس عجیب و غریب شخصیت کے مالک ہیں۔ جب بھی جو بات دماغ میں سما جائے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ جب انہیں کیمیا بنانے کا شوق ہوا تو ہر چند کہ کاروباری پریشانیوں نے انہیں کشتہ روزگار بنا رکھا تھا، مگر وہ برسوں دہرہ دون کے جنگلوں میں جنگلی گھی کوار اور چوگوشی تر پھلا ڈھونڈتے رہے تاکہ پارے کو قائم کرنے کا وہ صحیح نسخہ تیار ہو جائے جو ایک عیار بزرگ سیاہ ریش نے انہیں جاہل میں آکر دے دیا تھا اور جس پر عمل کے دوران وہ ایک آنچ کی کسر سے خود مرتے مرتے بچے تھے۔

تصوف کی طرف راغب ہوئے تو روزانہ صبح کو زعفرانی لباس میں سر پر سبز عمامہ باندھ کر دونوں ہاتھوں میں جلتی ہوئی اگر بتیاں لئے جنگل کی طرف نکل جاتے، شام کو حق ہو، حق ہو کی گردان پر گردن ہلاتے واپس آتے اور اس حالت میں خود بھی کسی بزرگ کا چلتا پھرتا مزار نظر آتے رہتے۔

اسی طرح جب انہیں حکمت کا شوق ہوا تو یہ عالم تھا کہ روز طب یونانی کی نہ جانے کب کب کی بوسیدہ کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے۔ کوے کی چونچ، الو کے پر اور مینڈک کی کلیجی جیسی چیزوں سے طرح طرح کے امراض کی عجیب و غریب دوائیں اور کشتے بنا کر خود پر ہی ان کے تجربے کرتے اور آئے دن طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے رہتے۔

یونانی ادویات میں ان دنوں ان کا عقیدہ اس قدر پختہ تھا کہ ناشتہ میں چائے کی جگہ جوشاندہ پیتے، ڈبل روٹی پر شہد یا مکھن کی جگہ کبھی اطریفل زمانی لگایا جاتا کبھی خمیرہ مروارید مشکی عنبریں۔ دوپہر کے کھانے میں اکثر بکرے کی کلیجی کا عرق خمیرہ گاؤزبان کے ساتھ نوش فرماتے اور رات کے کھانے میں املتاس کے بیجوں سے بگھری ہوئی اڑد کی دال کے ساتھ دانہ خشخاش کی بھجیا دسترخوان پر موجود ہوتی۔ یہ سب چیزیں کھانے کے بعد ہاضمہ درست رکھنے کے لیے نوسادر، سیاہ نمک اور پھٹکری سے تیار کئے گئے معدہ شکن چورن کو سفوف لبوب کبیر کہہ کر خود بھی کھاتے اور اپنی طرح دوسروں کا پیٹ بھی خراب کرتے۔ کبھی کبھار مٹھائی کھانے کو جی چاہتا تو رس گلہ پر آنولہ یا سیب کے مربے کو اور ربڑی پر خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا کو ترجیح دیتے۔ (جان ہے تو جہان ہے پیارے، بقلم خود)

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

دل بھی یارب کئی دیے ہوتے!

ان دنوں پورے ملک میں گردوں کی چوری کا معاملہ گرم ہے اور ہم پچھلے کئی ہفتوں سے سوچ رہے تھے کہ اس خوبصورت، دل نشیں اور روح پرور موضوع پر دو چار باتیں ہو جائیں۔ لیکن کیا کیجئے۔ یہ ایٹمی دھماکے کسی اور بات کا موقع ہی نہیں دے رہے ہیں۔ جہاں دیکھئے، ہندوستانی اور پاکستانی بموں کی بات چل رہی ہے۔ آج کل ہر چیز میں بم نظر آ رہے ہیں۔

بجٹ آیا تو اس پر بھی بم کا سایہ پڑا رہا۔ یہاں تک کہ سرکار ابھی مارنے پٹرول کے دام بڑھائے تو ایک دل جلے کارٹونسٹ نے اسے بھی بم کہہ دیا اور اپنے کارٹون میں یہ دکھایا کہ پہلے ہم نے بانڈ روجن بم چھوڑا اب پٹرول بم چھوڑ رہے ہیں۔

پھر، بابری مسجد کو مندر بنانے کی جو تیاری ان دنوں چل رہی ہے اسے بھی ایک بم کہا جا رہا ہے جو پتہ نہیں کس الیکشن سے پہلے پھٹے گا۔ یہ غالباً بابری بم کہلائے گا۔ (ویسے بھی بابری اور مسجد کے پہلے حروف ملائیں تو بم ہی بنتا ہے) جس راجستھان میں پوکھرن کے دھماکے ہوئے تھے اس کے ایک شہر میں رام مندر کے دروازے بنائے جا رہے ہیں۔ ستون تراشے جا رہے ہیں۔ اور لطف کی بات دیکھئے، اسی راجستھان کی راجدھانی میں ایک اجتماعی زنا شدہ (Gang-Raped) خاتون کے ساتھ مکرر ارشاد کے طور پر ایک اور ریپ کر دیا گیا۔

یہ راجستھان بھی عجیب دھرتی ہے صاحب۔ یہاں جوہری بم بھی چلتے ہیں۔ بت بھی تراشے جاتے ہیں اور زنا بالجبر بھی جاری رہتے ہیں! کچھ لوگ تو اس ریپ کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ جس وقت میاں عبدالکلام بم دھماکے کو فائنل ٹچ دے رہے تھے، عین اسی وقت جے پور کے بعض جیالے اور جوشیلے جوان، مذکورہ خاتون کے ساتھ منہ کالا فرما رہے تھے۔ واہ صاحب، کیا بات ہے!

اور جناب یہ منہ کالا کرنے کا محاورہ بھی عجیب ہے۔ کئی لوگ اس محاورے کی سرخی والی خبروں کا مطالعہ بڑے شوق و ذوق سے کرتے ہیں۔ خاص طور سے خبر کے اس حصے کا جس میں منہ کالا کرنے کی ترتیب و ترکیب پوری تفصیل سے بیان کی گئی ہو۔ دیکھا گیا ہے کہ یہ تفصیلات کئی قارئین پر زبردست نفسیاتی اثر ڈالتی ہیں۔ کئی زود حس قارئین کا تو غصہ سے منہ کالا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔ پھیپھڑے لوہار کی دھونکنی کی طرح سانس لینے لگتے ہیں اور طیش کے عالم میں دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں۔

اکثر یہ تمام جوش و جذبہ اور غصہ زانیوں کے خلاف اور متعلقہ زن سے ہمدردی میں ہی نہیں بلکہ اس شومئ قسمت کے لئے بھی ہوتا ہے کہ ہائے، منہ کالا ہونے کے وقت ہم موقع واردات پر نہ ہوتے، تھوڑی سی روسیاہی ہمیں بھی مل جاتی۔

مگر تتلانے والے اردو داں حضرات کے لئے یہ محاورہ خاصی مشکل پیدا کر سکتا ہے۔ ایک ادیب اتفاق سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا کوئی دلچسپ کتاب پڑھ رہا تھا۔ تبھی اس کے توتلے نوکر نے آ کر اطلاع دی کہ جناب بیگم صاحبہ آپ کو اندر بلا رہی ہیں۔ ادیب نے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ جا کر کہہ دو، صاحب مطالعہ کر رہے ہیں۔ نوکر نے جا کر بیگم صاحبہ کو بتا دیا۔ اب وہ تو جانتی ہی تھیں کہ نوکر توتلا ہے۔ سنتے ہی ان کا پارہ چڑھ گیا۔ تیر کی طرح

www.taemeernews.com

سیدھی ڈرائنگ روم پہنچیں اور ادیب کی کمر پر دوہتڑ رسید کر کے بولیں "مردود کہیں کے، دن دہاڑے یہ حرکت، سچ بتاؤ میرے علاوہ اور کون ہے وہ جس کے ساتھ تم منہ کالا کرتے ہو؟"

اب یہ ہماری اور غالباً خود اٹل جی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ بم چھوڑ کر ہم سرخ رو ہوئے ہیں یا روسیاہ!

بہرکیف بات ہو رہی تھی گردوں کی۔ جن کی چوری آج کل دھڑا دھڑا چل رہی ہے۔ ظاہر ہے بم کی طرح یہ بھی ہماری سائنسی ترقی کی ہی ایک نشانی ہے کہ جس انسانی تہذیب کا ارتقا بردہ فروشی سے ہوا تھا اسے ہم نے گردہ فروشی کے دور میں پہنچادیا ہے۔ انسانی اعضا تبدیل کرنے میں اب ہم نے اس درجہ مہارت حاصل کرلی ہے کہ اسے تجارت بنادیا ہے اور چوری چونکہ تجارت کا جزو لاینفک ہے اس لئے بات اب اعضا کی چوری تک پہنچ گئی ہے اور خدا نے چاہا تو ایک دن وہ بھی آجائے گا جب یہ چوری ڈکیتی کی شکل اختیار کرلے گی اور معاملہ دن دہاڑے چھینا جھپٹی تک پہنچ جائے گا۔

یعنی لوگ گھروں سے نکلیں گے تو راستے میں موٹر سائیکل پر سوار نامعلوم نقاب پوش، آدمی کو روک کر اس کا ایک کان کھینچ لیں گے، آنکھ چرالیں گے یا ناک صاف کردیں گے۔ بیچارا صبح کا بھولا آدمی گھر سے دونوں ہاتھ ہلاتا منہ سے سیٹی بجاتا نکلے گا اور شام کو صرف ایک ہاتھ ہلاتا منہ لٹکائے واپس آئے گا!

اصل میں اس تمام صورت حال کے لئے، خاکم بدہن، بڑی حد تک اللہ میاں بھی ذمہ دار ہیں۔ جنہوں نے دوسرے جانوروں کی مانند انسان کو بھی اپنے کرم اور فیاضی سے نواز دیا ہے جبکہ انسان کی فطرت کو دیکھتے ہوئے انہیں ذرا احتیاط سے کام لینا چاہئے تھا۔

اب دیکھئے۔ اچھا خاصا ایک گردے سے کام چل سکتا تھا۔ مگر اللہ میاں نے ایک فاضل گردہ اسٹپنی کے طور پر دے دیا کہ جا، ایک خراب ہووے تو دوسرے سے کام چلائیو! چنانچہ دیکھ لیجئے۔ جو لوگ غریب ہیں وہ اپنا گردہ بیچ کر لکھ پتی بننے کے چکر میں رہتے ہیں اور جو اُن سے بھی زیادہ غریب ہیں ان کے گردے آپریشن کے ماہر ڈاکٹر چوری کرلیتے ہیں۔ اسی طرح آدمی کے لئے ایک آنکھ کافی تھی۔ مگر قدرت نے ایک کی جگہ دو دے دیں اور یوں نہ صرف ایک آنکھ کا کانا بیچنے کے لالچ کی گنجائش پیدا کردی بلکہ بہت سے لوگوں کو کانا یا بھینگا ہونے کی خواری میں بھی مبتلا کردیا۔ اگر آدمی کو صرف ایک آنکھ دی گئی ہوتی تو نہ اس کے دماغ میں کانا بیچ کر موٹی رقم پانے کا لالچ پیدا ہوتا، نہ کوئی بھینگا ہوتا کہ آپ اس سے ٹھیک طرح آنکھیں بھی نہ ملاسکیں اور یہ تک نہ جان پائیں کہ اس کی نظر آپ پر ہے یا بغل میں کھڑی ہوئی آپ کی بیوی پر۔ پھر جنس مخالف کو آنکھ مارنے کے واقعات بھی کم ہوتے۔ یا شاید بالکل ہی نہ ہوتے۔ آدمی جنس مخالف کو چھیڑنے کے لئے کچھ اور چاہے مارلیتا مگر آنکھ نہ مارتا۔ اگر مارتا بھی تو دیکھنے والے کو پتہ ہی نہ چلتا کہ کیا مارا جارہا ہے۔

تاہم ایک آنکھ ہونے سے سب سے اچھی بات یہ ہوتی کہ لیڈر اور منسٹر حضرات اپنے تمام ووٹروں کو، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، امیر یا غریب، اونچی ذات کے یا نیچی ذات کے، سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے۔ یہی نہیں پھر آدمی کا چشمہ بھی یک چشمی ہوا کرتا۔ اس کے علاوہ آدمی اور دجال میں بھی کوئی فرق نہ رہ جاتا جو فطرتاً ویسے بھی نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارے دوست شجاع خاور کو یہ مشہور شعر نہ کہنا پڑتا کہ:

جو دل سے برا ہے وہ بہرحال برا ہے
دو آنکھیں بھی رکھتا ہو تو دجال برا ہے

اور ہاں، آنکھیں چار ہونے کا محاورہ بھی ایجاد نہ ہوتا۔ لوگ صرف آنکھیں دو کرکے کام چلالیا کرتے جس کا منطقی نتیجہ از روئے حساب یہ نکلتا کہ ناکامی عشق کے واقعات بھی آدھے رہ جاتے۔

یہی معاملہ کانوں کا ہے۔ آدمی کے دو کان ہونے سے ایک مشکل تو یہ ہے کہ اردو میں دوکان لکھو تو پڑھنے والا خواہ مخواہ غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آدمی

www.taemeernews.com

کے کانوں کا ذکر ہو رہا ہے یا اس کی دکان کا جس میں ایک دروازہ ہوتا ہے اور جو قانوناً صبح کھلنی اور شام کو بند ہو جانی چاہئے۔

اللہ میاں نے شاید سوچا ہوگا کہ آدمی کو ایک کی جگہ دو کان دے دیئے تو وہ دوسروں کی باتیں زیادہ اچھی طرح اور زیادہ توجہ سے سنے گا۔ جبکہ یہ مقصد صرف ایک کان دینے سے زیادہ بہتر طور پر حاصل ہوتا کیونکہ اس صورت میں آدمی کو کسی کی بات ایک کان سے سننے اور دوسرے کان سے نکال دینے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

پھر ایک کان ہوتا تو دنیا میں کن میلئے بھی آدھے ہوتے۔ کان کے ڈاکٹروں کا کام بھی آدھا رہ جاتا اور شریر بچوں کو بزرگوں کے ہاتھوں کان اینٹھے جانے پر تکلیف بھی آدھی جھیلنی پڑتی۔ کیونکہ وہ صرف ایک کان اینٹھ سکتے تھے دو نہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ دو عدد کان ہونے سے صرف امریکہ کی ڈولبی (Dolby) کمپنی اور جاپان کے اسٹیریو پلیئر بنانے والے کارخانوں کو فائدہ ہوا ہے۔ کیونکہ آدمی کا ایک کان ہوا کرتا تو ڈولبی ساؤنڈ اور اسٹیریو فونک ساؤنڈ کسی کام کی نہ ہوتی اور الیکٹرانک میوزک انڈسٹری اربوں کھربوں ڈالر کے کاروبار سے محروم رہ جاتی۔

اس کے برعکس قدرت کی بوالعجبی دیکھئے کہ آدمی کو کان تو دو دے دیئے مگر ناک صرف ایک عطا کی ہے۔ جبکہ ہمارے حساب سے ناک کم از کم دو عدد ہونی چاہئے تھیں۔ اس طرح آدمی کی کئی مشکلیں کم ہو جاتیں۔

میاں عبدالقدوس کہتے ہیں کہ قدرت نے آدمی کو ناک ایک عدد اور کان دو عدد اس لئے دیئے ہیں کہ وہ عینک ٹھیک سے لگا سکے۔ اگر کان صرف ایک اور ناک دو عدد ہوتیں تو خاص مشکل پیدا ہو جاتی۔ خاص طور سے چشمہ ایجاد کرنے والے کے لئے!

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ عینک جس بصارت اور بصیرت کو درست کرنے کے لئے لگائی جاتی ہے اس سے زیادہ اہم چیز ہے انسان کی عزت آبرو۔ آپ نے دیکھا ہوگا، کئی معاملوں میں ذرا ذرا سی بات پر آدمی کی ناک کٹ جاتی ہے۔

ان اینٹی دھماکوں کو ہی لے لیجئے۔ ہم نے کئے تو پاکستان کی ناک کٹ گئی اور جب اس نے کئے تو ہماری کٹ گئی۔ چنانچہ دونوں نکٹے اب اس چکر میں ہیں کہ کسی طرح ان پانچ عظیم نکٹوں کے کلب میں شامل ہو جائیں جنھوں نے اپنی ناکوں کے چکر میں ساری دنیا کو ناک آؤٹ کر رکھا ہے۔

اگر آدمی کی دو ناکیں ہوتیں تو آج پیاز پچیس روپے کلو نہ بک رہی ہوتی۔ جی۔ کیا فرمایا۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کوئی بات نہیں۔ آپ نے وہ شعر تو سنا ہوگا:

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانوں کا ہوگا

یعنی شہد کی مکھی باغ میں گئی تو پھولوں کا رس جمع کرے گی۔ اس سے شہد بنائے گی تو موم ٹپکے گا۔ موم جمع ہوگا تو شمع بنے گی اور شمع جلی تو پروانہ راکھ ہوگا۔

اسی طرح ہندوستان کی ناک کا سوال نہ ہوتا تو وہ بم نہ چھوڑتا۔ اس سے پاکستان کی ناک نہ کٹتی تو وہ چین سے بم ادھار لے کر ہندوستان کی ناک نہ کاٹتا۔ دونوں کی ناک نہ کٹتی تو امریکہ کی ناک بھی نہ کٹتی۔ اس کی ناک نہ کٹتی تو وہ اقتصادی پابندیاں نہ لگاتا اور ممبئی سین سیکس میں گراوٹ نہ آتی جس سے پیاز کے دام بڑھے ہیں۔ سب کے پاس دو عدد ناک ہوا کرتیں تو ایک کٹنے کی صورت میں کم از کم دوسری تو بچی رہتی۔

یہی معاملہ ہاتھوں کا ہے۔ آدمی کو دو ہاتھ دے کر اللہ میاں نے پوری دنیا کو دوہری مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔

سب سے بڑا غضب تو دو ہاتھ ہونے سے یہ ہوا کہ دنیا میں قوال پیدا ہو گئے۔ قوالی کے لئے تالی ضروری ہے اور تالی دو ہاتھوں سے بجتی ہے۔ ایک ہاتھ ہوتا تو آدمی نہ تالی بجاتا نہ قوالی گاتا نہ قوال پیدا ہوتے اور ہوتے بھی تو وہ ٹنڈے قوال ہوتے۔ اور تب کم از کم یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ بے سرا قوال ایک ہاتھ ہارمونیم پر اور دوسرا اپنے کان پر رکھ کر خود تو اپنی کرخت آواز سے

www.taemeernews.com

آدھا بچا ہوا ہے اور منہ اور گلا پھاڑ کر باقی سب کے دو دو کان کھا رہا ہے۔ ٹنڈے قوال کو بہر حال اپنا واحد ہاتھ ہارمونیم پر رکھنا پڑتا اور دو تین قوالیاں خود اپنی آواز میں سننے کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے قوالی سے تائب ہو جاتا اور پوری دنیا قوالیوں سے نجات پا جاتی جن کا واحد فائدہ یہ ہے کہ رات کو کھلے میدان میں کرائی جائیں تو چند مچھر ضرور کم ہو جاتے ہیں۔

لیکن بات قوالیوں تک محدود نہیں۔ تالی اور بھی کئی معاملوں میں دخیل ہے۔ چنانچہ وہ بھی نہ ہوتے جن سے ہم سب پریشان ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ تالیاں نہ بجتیں تو جلسوں تقریروں اور لیڈروں میں کافی کمی آ جاتی اور عوام، عوامی رہنماؤں کے بغیر کافی سکون سے زندگی گزارتے۔ پھر تالی بجانے والی وہ مخلوق بھی نہ ہوتی جو 'ہیوں' میں ہے نہ 'شیوں' میں۔(He میں نہ She میں)

لیکن سب سے بڑا جو مسئلہ دو ہاتھوں سے پیدا ہوا ہے وہ ہے دائیں بازو اور بائیں بازو کا! بچپن میں ہم سمجھتے تھے کہ جو شخص دائیں ہاتھ سے قلم اور نوالہ پکڑتا ہو وہ دائیں بازو کا ہوتا ہے اور جو یہ دونوں کام بائیں ہاتھ سے اور طہارت دائیں سے کرتا ہے وہ بائیں بازو کا، یعنی کھبو ہوا!

لیکن، جیسے جیسے عمر بڑھی، من پرتن کا میل چڑھا، بات صاف ہوگئی۔ انگلینڈ میں رواج تھا کہ بادشاہ شاہی دربار میں اپنے دائیں ہاتھ پر وزیروں اور خاص چہیتوں کو اور بائیں ہاتھ پر انہیں بٹھاتا تھا جنہیں وہ اپنا مخالف سمجھتا تھا۔ یہیں سے رائٹسٹ اور لیفٹسٹ یعنی دائیں بازو اور بائیں بازو کا چکر چل پڑا۔ بیسویں صدی میں تو یہ چکر ایسا چلا کہ روسیوں اور چینیوں نے دنیا کے آدھے لوگوں کو بائیں بازو والا بنا ڈالا اور امریکہ اور اس کے سامراجی ساتھی دائیں بازو والے بن گئے۔ البتہ جن کے دونوں بازو ٹھیک تھے، جیسے ہم، تو انہیں ناوابستگی کی سزا جھیلنی پڑی۔

اب ذرا سوچئے۔ انگلینڈ کا وہ بادشاہ اگر ٹنڈا ہوتا تو اسے بائیں جانب بھی دائیں بازو والوں کو بٹھانا پڑتا اور آج دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ پس ثابت ہوا کہ آدمی کو قدرت نے اگر صرف ایک ہاتھ دیا ہوتا تو نہ دایاں بازو ہوتا نہ بایاں۔ ہاں مسلمانوں اور یہودیوں کو ضرور خفت اٹھانی پڑتی۔ بے چارے نماز کے بعد صرف ایک ہاتھ سے دعا مانگتے ہوئے عجیب سے لگتے۔

لیکن سب سے بڑا فائدہ ایک ہاتھ ہونے کا آدم زاد کو یہ ہوتا کہ اس نے جتنی ترقی اب تک کی ہے، اس سے آدھا ترقی یافتہ ہوتا چنانچہ آدھا غیر محفوظ ہوتا اور بے روزگاروں کی تعداد بھی گھٹ کر آدھی رہ گئی ہوتی! بلکہ شاید بالکل ہی نہ ہوتی۔ علاوہ ازیں آدھی ترقی سے آدمی کی بربادی بھی آدھی ہو جاتی۔ آدھے بم گرتے، آدھی جنگیں ہوتیں آدھی...وغیرہ وغیرہ!

ہاتھوں کے علاوہ بھی انسان کو کئی چیزیں قدرت نے جوڑوں کی شکل میں عطا کی ہیں۔ مثلاً ٹانگیں دو عدد۔ پھیپھڑے دو عدد۔ اور گردے بھی دو عدد جن کی چوری کے واقعات اپنے دیش میں کافی بڑھ گئے ہیں۔ منظم گردہ فٹ پاتھ پر پڑے کسی غریب مریض کو علاج کے بہانے پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں لے جاتے ہیں اور وہاں بے ہوشی کی دوا دے کر اس کا گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ پھر غریب آدمی کا یہ گردہ کسی امیر بے گردہ کو لاکھوں روپے میں بیچ دیتے ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معاملے میں حکومت ڈاکٹروں کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہے۔ آخر وہ غریبوں کے گردے کے سرکاری ریٹ کیوں مقرر نہیں کر دیتی۔ تاکہ یہ دھندا بھی دوسرے غیر قانونی دھندوں کی طرح قانونی شکل اختیار کر لے۔ ظاہر ہے۔ کسی بھی غیر قانونی دھندے سے نجات پانے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اسے قانونی قرار دے دیا جائے۔

اور پھر گردہ ہی کیوں؟ باقی اعضا کے لئے بھی ریٹ مقرر کئے جا سکتے ہیں۔ جراحتی سائنس روز بروز ترقی کرتی جا رہی ہے۔ گردے اور آنکھ بدلنے کی بات پرانی ہوئی۔ اب تو کان، ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ بدلنے کی طرف پیش رفت ہے۔

افریقہ میں ایک ڈاکٹر نے آدمی کے جسم میں بندر کا دل لگا دیا تھا۔ اور حال ہی میں آپ نے سنا ہوگا ایک ہندوستانی ڈاکٹر

www.taemeernews.com

نے سور کا دل آدمی کے سینے میں فٹ کردیا۔ جس کے بعد وہ (آدمی) کچھ عرصہ زندہ رہ کر مرگیا اور ڈاکٹران دنوں جیل میں ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں، اس ڈاکٹر نے خواہ مخواہ سور کو تکلیف دی۔ اگر اسے سور کے دل کی ہی ضرورت تھی تو انسانوں میں ڈھونڈتا۔

اصل میں قدرت بھی اپنے آپ میں ایک زبردست پیوندکار ہے۔ کئی بار وہ اتنی عمدگی اور صفائی سے آدمی کے دماغ میں لومڑی کا مغز اور آنکھوں میں طوطے کی آنکھ لگا دیتی ہے اور مزاج میں گرگٹ کے رنگوں کی ایسی پیوندکاری (Grafting) کردیتی ہے کہ بڑے سے بڑا ماہر بھی پتہ نہیں لگا سکتا۔ اور کبھی پتہ لگتا بھی ہے تو تب تک کافی دیر ہوچکی ہوتی ہے۔

چنانچہ اگر تمام انسانی اعضا کے عام ریٹ مقرر کردیے جاتے، جیسے کہ مزدوروں کو جسمانی حادثہ پیش آنے کی صورت میں معذوری کا معاوضہ دینے سے متعلق قوانین میں درج ہیں تو غریب آدمی، خاص طور سے وہ غریب آدمی جسے کوئی مزدوری بھی نہیں ملتی، اپنی غریبی مٹانے کے لئے سیدھا کسی اسپتال پہنچتا اور اپنے آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں یا گردے، کلیجی کی ریٹ لسٹ ڈاکٹر کو تھما کر پہلے تو حضرت داغ دہلوی کا یہ شعر سناتا کہ:

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھا دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

اور پھر گا کر کہتا:

چاہے تو مورا جیا لے لے، سانور یا...

یہ اور بات ہے کہ بعض غریب اس قدر غریب الغربا ہوتے ہیں کہ اتنا سب کرنے پر بھی ان کی غربت دور نہ ہوتی۔ اس صورت میں بیچارے وہی دعا کرتے جو غالباً مرزا غالب نے ڈیڑھ سو برس پہلے کی تھی۔

میری قسمت میں غم گر اتنے تھے
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے!

(جون، 1998)

دہلی کی بسیں

اتفاق سے جس روٹ کی بسوں سے ہمیں دفتر جانا پڑتا ہے اس پر بسوں میں اندر اور باہر مسافروں کی اس قدر بھیڑ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی تو بس بھی دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو کئی مرتبہ محض اندازے سے سمجھنا پڑتا ہے کہ جس جگہ لوگوں کا جم غفیر دکھائی دے رہا ہے، آدمی پر آدمی چڑھا بیٹھا ہے، کوئی کسی کی ٹانگ کھینچ رہا ہے، کوئی کسی کو دھکا دے رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ فساد شکن فورس اب آیا ہی چاہتی ہے، تو اگر بیچ میں وشو ہندو پریشد یا بابری مسجد ایکشن کمیٹی نہ ہوئی تو ایک نہ ایک بس ضرور ہوگی۔

ایسی حالت میں ہمارے لیے یہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ بس میں داخل ہونے کا دروازہ کس طرف ہے؟ اور یہ کہ وہ آرہی ہے یا جارہی ہے؟

آخر جب بھیڑ سمیت بس آگے کھسکتی ہے تب جاکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارے! اس کا پچھلا دروازہ تو آگے ہے!

اس کے بعد ہم بس پکڑنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں اور تب تک دوڑتے رہتے ہیں جب تک اگلے اسٹاپ پر نہیں پہنچ جاتے۔ یقین کیجیے، کئی مرتبہ ہم سڑک پر اسی طرح بذریعہ بس پیدل دوڑتے دوڑتے دفتر اور گھر پہنچ کر، جلد آنے کے لیے افسروں کی شاباش اور گھر والوں کی دعائیں لے چکے ہیں۔

(سفر وسیلۂ ظفر، بقلم خود)

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

ایک اخباری بیان ہو جائے!

قارئینِ کرام! اطلاعاً عرض ہے کہ اس وقت میں بڑے جوش میں ہوں۔ جی چاہ رہا ہے کسی سے لڑ بیٹھوں۔ اور اگر کوئی لڑنے کو تیار نہ ہو تو کسی کو پکڑ کر اس کی پرزور مخالفت اور مذمت کر دوں۔ یا پھر اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کسی مسئلے پر کوئی متنازعہ بیان ہی دے ڈالوں!

جی ہاں! آپ نے درست اندازہ لگایا۔ دراصل میں ابھی ابھی ایک اردو اخبار پڑھ کر بیٹھا ہوں۔ اور اسی سے میری یہ حالت ہوئی ہے۔ ہمارے ملک میں اردو اخبار پڑھ کر مجھ جیسے کمزور دل قاریوں کا تقریباً یہی حال ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، رگوں میں خون تیزی سے سنسنانے لگتا ہے، کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگتی ہیں، آنکھوں میں ترمرے سے ناچنے لگتے ہیں، پھیپھڑے لوہار کی دھونکنی بن جاتے ہیں، اور وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اردو کے اکثر قارئین آپ کو بلڈ پریشر کی بیماری میں مبتلا ملیں گے۔ اردو کا اخبار پڑھتے ہی ہندوستانی قاری کے خون کا دباؤ اوپر نیچے ہونے لگتا ہے۔ جن کا 'لو' ہے ان کا 'ہائی' ہو جاتا ہے اور جن کا ہائی ہے وہ بالآخر قوم کے رہنما بن جاتے ہیں۔

سنا ہے عام طور پر لوگ خبریں پڑھنے کے لئے اخبار پڑھتے ہیں۔ لیکن اردو اخبارات کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ خبروں کے لئے اردو کا قاری بالعموم انگریزی یا ہندی کے اخباروں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اردو اخبار کی ضرورت اسے تب پیش آتی ہے جب اس کا علم ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ غیر زبانوں کے اخبار پڑھنے کے بعد باخبری کے بوجھ سے دبا، ہانپتا کانپتا قاری تھک کر اردو اخبار کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ جہاں بے خبری کے لطیف جھونکے اس میں توانائی کی ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں اور وہ سر سے علم کا سارا بوجھ اتار کر ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔

اس صورتِ حال سے کئی لوگ غلط نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ انگریزی اور دوسری زبانوں کے اخبار آدمی کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ جب کہ اردو اخبارات اس کی معلومات گھٹانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس قسم کے مفسدانہ خیالات رکھنے والے اشخاص کو پکڑ کر ان کی اچھی طرح مذمت، بلکہ ہو سکے تو بری طرح مرمت کر دینی چاہئے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ لیکن خبردار۔ یہ قدم تبھی اٹھانا چاہئے جب لا اینڈ آرڈر اس کی اجازت دے رہا ہو! یعنی پولس وغیرہ آس پاس نہ ہو۔

میرا خیال ہے اردو اخبارات پر تخفیفِ علم کا الزام سراسر بہتان ہے۔ جو لوگ اردو اخبارات کو بغور نہیں پڑھتے، یا جو اردو اخباروں کے مفید فوائد سے واقف نہیں، وہی اس قسم کی بہتان تراشی کر سکتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اردو اخبارات ہی ہیں جو اپنے خاص پڑھنے والوں کو خاص طرح کی معلومات خاص طریقے سے فراہم کرتے ہیں۔ وہ خاص معلومات جو دوسری زبانوں کے اخبارات میں قطعی نہیں ملتی۔

مثال کے طور پر اردو ہی کے اخبار ہیں جنہیں پڑھ کر آپ کو معلوم ہوگا کہ آج کل اردو قوم کس حال میں ہے اور یہ کہ ماشاءاللہ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا ہے۔ اردو کا اخبار قوم کو روزانہ اطلاع دیتا ہے کہ بحمداللہ قوم نے آج بھی کوئی ترقی نہیں کی۔ اس

www.taemeernews.com

کے ساتھ ہر سطح پر بخوبی تعصب برتا جا رہا ہے۔اردو اخبار کی خبریں، اس کے مضامین، تبصرے، مراسلات کا کالم، سب چیخ چیخ کر روزانہ بتاتے رہتے ہیں کہ ہمیں ملازمتوں میں مناسب نمائندگی نہیں مل رہی ہے۔ ہمارے کاروبار کو نقصان پہونچایا جا رہا ہے۔ ہمارے علاقوں میں جان بوجھ کر بجلی بھگا دی جاتی ہے۔ ہماری گلیوں کو صفائی کرمچاری یوں ہی چھوڑ دیتے ہیں۔آتے ہیں، سونگھتے ہیں، برا سا منھ بناتے ہیں اور دوسری قوم کی گلیاں صاف کرنے چل دیتے ہیں۔حد تو یہ ہے کہ ایک دن ایک اخبار نے یہ اطلاع دی کہ ٹی وی کے انعامی پروگراموں میں ہمیں پورا چانس نہیں دیا جاتا۔لاکھوں کروڑوں روپے کے انعامات دوسری قوموں کے ناظرین کو مل جاتے ہیں اور ہمیں دس بیس ہزار میں ٹرخا دیتے ہیں۔

انگریزی اخبارات میں عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ خبریں الگ ہوتی ہیں اور تبصرے الگ۔مگر اردو اخبارات میں ایسی کوئی تخصیص نہیں۔قارئین کی سہولت کے لئے دونوں کو ملا دیا جاتا ہے۔اور اس خوبی سے ملایا جاتا ہے کہ ہوشیار سے ہوشیار قاری بھی پڑھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ خبر کہاں سے شروع ہوتی ہے اور تبصرہ کہاں ختم ہوتا ہے۔کئی اخبار تو تبصرے پر اتنا زور دیتے ہیں کہ خبر بالکل ہی غائب ہو جاتی ہے۔صرف تبصرہ رہ جاتا ہے۔چنانچہ اکثر اردو قارئین اس زحمت سے بچا لئے جاتے ہیں کہ پہلے خبر پڑھیں اور پھر اپنی کوئی رائے قائم کریں۔خبر پڑھے بغیر ہی قاری اس پر ایک رائے کا مالک بن جاتا ہے۔ویسے سچ پوچھئے تو اردو قاری کو اس کی اجازت ہی نہیں ہے کہ وہ خود اپنی کوئی رائے بنا سکے۔اردو اخبار اسے بنی بنائی اور چھپی چھپائی رائے تھما دیتے ہیں کہ لو بیٹا اسے پکڑو اور ثواب دارین حاصل کرو۔

ایک چیز اردو اخباروں میں اور ہے جو بڑے سے بڑے انگریزی اخبار میں بھی بہت کم دیکھنے کو ملے گی۔وہ ہے اخباری بیان بازی۔دنیا کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر اردو کے اخبار میں آپ کو کوئی اخباری بیان نہ مل جائے!اردو قوم کا یہ حال ہے کہ اس کے ایک چوتھائی افراد اخبار پڑھتے ہیں باقی تین چوتھائی اخباری بیان دینے میں لگے رہتے ہیں۔سلیم پور کی گلی نمبر فلاں کی نالی میں اٹکی ہوئی غلاظت سے لے کر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل پر امریکہ کے کستے ہوئے شکنجے اور تنزانیہ و ہونولولو کے تازہ حالات تک کوئی مسئلہ کوئی سوال ایسا نہیں جو ان حضرات کی بیان بازی سے محفوظ رہ جائے۔کیسا بھی واقعہ کیوں نہ ہو، یہ اس پر اپنا بیان ضرور دیں گے۔بلکہ واقعہ نہ ہو تب بھی بیان داغ دیں گے کہ یہ کیوں نہیں ہوا؟ قائد ین ملت پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجئے۔ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جس کی دوکان اخباری بیان کے بغیر چل رہی ہو۔

اس پر ایک قائد ملت کی یاد آ گئی جو اتنے بڑے قائد ہیں کہ کئی بار ملت ان کے سامنے چھوٹی پڑ جاتی ہے۔ایک زمانے میں ان کی جماعت کا ایک اردو روز نامہ شائع ہوا کرتا تھا۔ظاہر ہے اس میں سب سے زیادہ خبریں خود ان کی ذات اقدس سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔صدر امریکہ کو اس کے فلاں بیان پر قائد ملت نے کس جرأت سے للکارا، حکومت کے کس اقدام کی امیر ملت نے پُرزور مذمت کی، کن فساد زدہ شہروں کا محبوب ملت نے دورہ کیا، آئندہ کن شہروں کے دورے کا امام ملت قصد رکھتے ہیں نیز اس ہفتے کہاں کہاں غازی ملت کا والہانہ و پر جوش خیر مقدم ہوگا وغیرہ۔سارا اخبار ایسی ہی تفصیلات سے بھرا رہتا تھا۔چنانچہ ایک دن اخبار بند ہو گیا۔مجاہد ملت بڑے پریشان ہوئے۔کہنے لگے اب قوم کا کیا ہوگا؟ ہر چند کہ قوم اس اخبار کے بند ہونے سے خوش تھی کہ چلو ملت کی علت سے چھٹکارا ملا۔مگر محسن ملت کو پھر بھی نادان قوم کی فکر تھی کہ کہیں وہ ان کی رہنمائی نہ ملنے سے گمراہ نہ ہو جائے۔

کسی نے ایسے میں رائے دی، اور بڑی قاعدے کی رائے دی کہ کسی اردو اخبار کے ریٹائرڈ منشی کو دو چار سو روپے ماہوار اور روٹی کپڑے و حجرہ مسجد کے مشاہرے پر رابطہ عامہ کا افسر مقرر کر لیجئے۔اخبار کی کمی پوری ہو جائے گی۔

www.taemeernews.com

رہبر ملت نے پوچھا وہ کیسے؟ رائے دینے والے نے کہا وہ ایسے کہ یہ ملازم روز آپ کا اخباری بیان تیار کر کے اخبارات کو اس کی نقلیں بھیجتا رہے گا اور اس طرح قوم کی یومیہ رہنمائی ہوتی رہے گی! انہوں نے فوراً مشورہ قبول کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو وہ صرف اپنے اخبار میں نظر آتے تھے، آج سب اخباروں میں نظر آتے ہیں۔ اور اس کے لئے نہ تو انہیں نیوز پرنٹ بلیک کرنا پڑتا ہے، نہ اردو صحافیوں کو خاکروبوں سے کم اجرت پر ملازم رکھنے کی ضرورت رہتی ہے، نہ کاتبوں کی اجرت دابنی پڑتی ہے۔ بس ہر روز ایک بیان اخبارات کو فیکس کر کے ان تمام غیر شرعی گناہوں سے بچ جاتے ہیں! دیکھی آپ نے اخباری بیان بازی کی شان؟

چنانچہ اس میں بھی کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ ہمارے اکثر قائدین روزانہ بیان دینے کی عادتِ قبیحہ میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ جب تک وہ دن بھر میں کسی مسئلے پر ایک دو اخباری بیان نہ دے لیں ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ کئی قائد تو بے احتیاطی میں اتنے زیادہ بیان دے ڈالتے ہیں کہ بعد میں مسئلے کم پڑ جاتے ہیں۔ اور انہیں دماغ پر زور ڈال کر نئے مسئلے ایجاد کرنے پڑتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک عبرت ناک واقعہ سن لیجئے۔ کہتے ہیں ایک قائدِ ملت کو ایک دن پیٹ میں بڑے زور کی مروڑ اٹھی۔ درد سے بے حال ہو گئے۔ حکیم ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔ کسی نے معجون کھلائی کسی نے انجکشن دیئے۔ مگر کچھ آرام نہ ہوا۔ قائد ماہیِ بے آب اور مرغِ بسمل کی طرح پلنگ پر تڑپ رہے تھے کہ اس روز ظہرانے میں انہوں نے بھی غذائیں علی الترتیب تلی اور بھنی ہوئی تناول فرمائی تھیں۔ آخر ایک شخص سے ان کا یہ تڑپنا نہ دیکھا گیا۔ پہلے تو وہ کچھ سوچتا رہا۔ پھر آگے بڑھا اور قائد کا کندھا ہلا کر بولا۔ ''قبلہ میں فلاں اخبار سے آیا ہوں۔'' سنتے ہی قائد نے آنکھیں کھول دیں اور نقاہت سے بولے۔

''جی، فرمایئے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

اس مردِ دانا نے کہا۔ ''حضرت میں آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ فلسطینی ٹھکانوں پر اسرائیل نے جو تازہ ترین حملے ایک گھنٹہ پہلے کئے ہیں، اس پر آپ کا کیا بیان ہے؟''

قائد کی آنکھوں میں یہ سنتے ہی اچانک غصہ جھلک آیا۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔ ماتھے کی رگیں پھول گئیں اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر کہنے لگے۔ ''میں اسرائیل کو خبردار کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ فوراً اپنی حرکتوں سے باز آ جائے ورنہ تمام عرب ملک متحد ہو کر اس کا قلع قمع کر دیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ پلنگ سے اٹھ بیٹھے اور تمام حکیم ڈاکٹر انہیں آنکھیں پھاڑے حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔ صرف ایک اخباری بیان نے قائد کی ساری تکلیف رفع کر دی تھی۔

قارئینِ کرام! اردو اخبارات کے بارے میں ابھی اور بہت سی باتیں ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ لیکن خادم کو اس وقت پیٹ میں کچھ مروڑ سی اٹھتی محسوس ہو رہی ہے۔ لہٰذا فی الحال ہمیں اجازت دیں کیونکہ اس بدنصیب کو تو کوئی ڈھنگ کا مسئلہ بھی یاد نہیں آ رہا ہے! ... خدا حافظ ...

☆ ... ☆ ... ☆

نامور مزاح نگار یوسف ناظم
کا دلچسپ سفرنامہ
امریکہ میری عینک سے
قیمت: ۶۰ روپے
بتوسط: شگوفہ حاصل کیجئے

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

ہوئے جی کے ہم جو رسوا...

خدا خدا کر کے بڑی مشکل سے ہم نے اپنے بارے میں بعض قارئین کی وہ خطرناک خوش فہمی دور کر دی تھی جو پرنٹ میڈیا میں ہمارے نام کی وجہ سے اکثر پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ کئی لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہم لکھتے نہیں بلکہ لکھتی ہیں۔ چنانچہ چند کرم فرماؤں نے عشق نامے بھی بھیجے۔ بلکہ ایک صاحب نے تو، جن کی پہلی منکوحہ کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا، باقاعدہ اپنی خضاب آلود مونچھوں والی تصویر بھیج کر ہمارے ساتھ رشتہ استوار کرنے کے لئے نیک خواہشات اور بری نیت کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ ان تمام عبرت ناک واقعات کی تفصیل ہم پہلے بھی ('بقلم خود' کے دیباچے میں) بیان کر چکے ہیں۔ لہٰذا انہیں دوہرانے سے اب کوئی فائدہ نہیں۔

اپنی سبھی کتابوں میں ہم نے اپنی سامنے کی ممکنہ حد تک واضح ترین مصدقہ تصویریں بھی شائع کیں تا کہ کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہ باقی رہے۔ کتابوں میں ان تصویروں کی اشاعت اور کالموں میں اپنی مردانگی کے اشارتاً اعلان کے بعد یہ دیکھ کر ہمیں خاصا اطمینان ہوا کہ عشق نامے آنا بند ہو گئے اور لوگوں نے ہماری عمر اور خانگی کوائف کے بارے میں جاسوسی کرنا چھوڑ دیا۔ بلکہ ایک صاحب نے ایک بزرگوار کے بارے میں ہمارا ایک سوانحی خاکہ پڑھ کر اس حیرت کا اظہار بھی کیا کہ وہ ہمیں خاصا عمر رسیدہ بوڑھا سمجھتے آئے تھے اور اب مضمون سے معلوم ہوا کہ ہم تو کافی کم عمر بزرگ ہیں، تو ہم اور بھی مطمئن ہو گئے۔ اور کچھ ایسی امید بندھ چلی کہ شائد اب ہمیں دوسری قسم یعنی دوسری صنف کے محبت نامے موصول ہونے لگیں۔

رفیقوں نے ہر چند سمجھایا کہ کہ میاں اردو زبان کا حال چاہے جتنا بھی خراب ہو گیا ہو مگر اردو خواتین کا ذوق ابھی اتنا پست، اور فہم اتنی ناقص نہیں ہوئی ہے کہ وہ غیر پروفیسر اردو مصنفین سے عشق فرمانا شروع کر دیں۔ پھر بھی دل کے نہاں خانوں میں آرزوئیں دم سادھے بیٹھی تھیں (براہِ کرم دم کو بالضم نہیں بالفتح پڑھیں)۔ امید تھی کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ جب بھی ڈاکیہ ڈاک لاتا ہر لفافے کو اس امید میں سونگھتے کہ شائد اس سے عطرِ شمامہ کی خوشبو آ رہی ہو۔ لیکن کسی سے بجلی کا بل نکلتا تو کسی سے واٹر سپلائی کاٹ دینے کا نوٹس۔ پھر بھی ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ آس باندھے رہے کہ ایک نہ ایک دن تو کوئی لفافہ مہکے گا۔

مگر افسوس! ایسا کچھ نہیں ہوا۔ البتہ یہ یقین آ گیا کہ اردو کی کتابیں صرف چھپنے سے پہلے پڑھی جاتی ہیں۔ کاتب، پروف ریڈر اور خود مصنف کے ذریعے۔ اس کے بعد کچھ ہوا تو بس یہ ہوا کہ اتر پردیش کی اردو اکادمی نے ہمیں ایک کتاب پر ایوارڈ دے کر ہماری رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی اور ہمارے سارے خواب چکنا چور کر دیئے۔ اعزاز ملنے سے عموماً لوگوں کی عزت افزائی ہو جایا کرتی ہے مگر ہم ہیں کہ اپنی عزت کے لئے آج تک یہ اعزاز چھپائے پھر رہے ہیں۔ آپ سے بھی یہ ذکر اس امید کے ساتھ کر رہے ہیں کہ اس قصے کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھیں گے۔

لیکن ایسا نہیں کہ ایوارڈ کے اعلان کے ساتھ ہی ایک دم یہ سب کچھ ہو گیا۔ اعلان اخبار میں چھپا تھا اور اس میں یہ کہا گیا تھا کہ ہمیں ساڑھے تین ہزار روپے ایک توصیفی سند کے ساتھ

www.taemeernews.com

عطا کئے جائیں گے۔ کب عطا کئے جائیں گے اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ بہر حال ہم بے تابی سے صرف رقم کا انتظار کرنے لگے کہ توصیفی سند ظاہر ہے ہمارے کسی کام کی نہیں تھی۔ ویسے بھی نہ تو اس سے گھر کا راشن آسکتا تھا اور نہ ہی بنک اس طرح کی اسناد قبول کرتے ہیں۔ توصیفی سند کا تو صرف یہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ ایک بڑے سے فریم میں ڈرائنگ روم کی دیوار پر ٹانگ کر بلب کی روشنی اس پر فوکس کر دی جائے تاکہ اردو نہ جاننے والے ملاقاتیوں پر رعب پڑتا رہے۔

ہفتہ گزرا، مہینے گزرے۔ لیکن نہ چیک آیا نہ سند۔ پہلے تو ہم نے سمجھا کہ یو پی میں اکثر سرکاریں بدل جایا کرتی ہیں۔ اس لئے ہوسکتا ہے اکادمی نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو۔ پھر جب چناؤ کا اعلان ہوا تو دوستوں نے ڈھارس بندھائی کہ میاں وہاں الیکشن کا ضابطۂ اخلاق نافذ ہو گیا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے اکادمی نے جو بہر حال ایک سرکاری ادارہ ہے اپنا اخلاق درست رکھنے کے لئے تمہارا اعزاز روک لیا ہو۔ حالانکہ یہ ڈھارس خاصی ہتک آمیز تھی پھر بھی ہم سوچنے لگے کہ الیکشن کمیشن واقعی بڑا سخت ہو گیا ہے اور اب وہ کسی بھی حکومت کو چناؤ کے اعلان کے بعد اس خیال سے عوام کے فائدے کا کوئی کام نہیں کرنے دیتا کہ اس سے انتخابی نتائج نہ متاثر ہو جائیں۔

اس روز پہلی بار ہمیں اپنی ذاتی اہمیت کا بھی اندازہ ہوا کہ ہم کوئی ایسے ویسے عام قسم کے عوام نہیں بلکہ خاص طرح کے خاص عوام ہیں اور ہمارا ووٹ ہی نہیں ہمیں ملنے والا ایوارڈ بھی سرکاروں کو الٹ پلٹ سکتا ہے۔

لیکن یہ خیالات بھی غلط نکلے۔ کوڈ آف کنڈکٹ چلا گیا۔ نئی سرکار آگئی۔ مگر ہمارا ایوارڈ نہیں آیا۔ آخر جب ایوارڈ کے اعلان کی پہلی سالگرہ نزدیک آئی اور اکادمی پر نئے سال کے اعزازات واجب ہو گئے، تب جا کر ڈاکیہ ہمارے ایوارڈ کی ڈاک لے کر آیا۔ اور ہم نے سب سے پہلا کام ڈاک کھول کر یہ کیا کہ رقم کا چیک نکالا اور بنک میں ڈال آئے۔ مگر بنک سے واپسی کے بعد جب توصیفی سند پر نظر ڈالی تو روح فنا ہو گئی۔

سند میں لکھا تھا کہ محترم/محترمہ فلاں ولد فلاں کو ان کی فلاں کتاب پر ایوارڈ دینے کی توثیق کی جاتی ہے۔ فقط چیئرمین فلاں۔

اور ستم اس میں یہ کیا گیا تھا کہ محترم/محترمہ میں سے ہمارے محترم کو قلم زد کر دیا گیا تھا۔ یعنی ایک طرح سے اکادمی نے اپنے تئیں اس کی تصدیق کر دی تھی کہ ہم ''یا خدا!'' نہیں، ''ہائے اللہ!'' بھی نہیں، بلکہ ''اوئی اللہ!'' ہیں جس کے ساتھ فوراً چوڑیوں کی کھنک سنائی دے جایا کرتی ہے۔ مارے ڈر کے ہم دیر تک بے حس وحرکت بیٹھے رہے۔ ہاتھ تک نہ ہلائے، مبادا کسی قسم کی کھنک سنائی دینے لگے!

تو جناب اس طرح دبیز کاغذ پر توصیفی سند دے کر ہماری اصل حیثیت اور جملہ صلاحیتوں کو غیر مستند بنا دیا گیا۔ اور اس دن ہمیں معلوم ہوا کہ یو پی کی حکومت نے ہمیں ضابطۂ اخلاق کا نہیں بلکہ ضابطۂ بداخلاقی کا نشانہ بنایا ہے۔ نیز یہ کہ اب اس کی اردو اکادمی چاہتی تھی کہ ہم اس کی عطا کردہ سند کو خوب صورت فریم میں جڑوا کر اور اپنی بیٹھک میں لٹکا کر خود اپنی رسوائی کا سامان کر لیں تاکہ سند رہے کہ ہم غیر مستند ہیں۔

اتفاق سے سند دوستوں نے بھی دیکھ لی کہ ایسی چیزیں دوست ضرور دیکھ لیتے ہیں۔ ایک سے دوسرے کو، دوسرے سے تیسرے کو اور تیسرے سے باقی شہر کو پتہ چل گیا کہ ہم ایک بار پھر مشکوک ہو گئے ہیں۔ ایک خیر خواہ نے یہ بتا کر ہمارا خون خشک اور مستقبل تاریک کر دیا کہ اکادمی چونکہ ایک سرکاری ادارہ ہے اس لئے اب تمہاری حیثیت ایک سرکاری مشکوک کی ہو گئی ہے جو عام مشکوک سے کہیں زیادہ مشتبہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد ہمیں یہ بھی شبہ ہو گیا کہ کہیں چیک میں بھی تو مسٹر کی بجائے مس نہیں لکھ دیا گیا ہے۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ چیک باؤنس ہو جائے۔ بلکہ اس خیال سے تو ہمارے پسینے چھوٹ گئے کہ کہیں بنک والے ہماری ذات سے مشکوک ہو کر ہمارا بچا

www.taemeernews.com

کھچا کھاتہ بھی نہ منجمد کر دیں اور معاملہ برائے تفتیش سی بی آئی کو نہ سونپ دیا جائے۔ جو بالعموم جیل پہلے بھیجتی ہے باقی بات بعد میں سنتی ہے۔ لیکن بنک چونکہ سرکاری تھا اور ہم سرکاری عملہ کی قابلیت پر خاصہ بھروسہ رکھتے ہیں اس لئے جلد ہی مطمئن ہو گئے۔

مگر ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ اکادمی نے چونکہ تمہاری ...عصمت و عفت پر شک ظاہر کیا ہے اس لئے اس کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دو، ورنہ آگے چل کر تمہاری قانونی حیثیت میں طرح طرح کے اشکال پیدا ہو سکتے ہیں۔

''کیسے اشکال؟'' ہم نے پوچھا۔

انہوں نے جواب دیا۔ ''ہو سکتا ہے کہ تم ووٹ ڈالنے جاؤ اور تمہیں مرد کے بھیس میں زنانہ ووٹ ڈالتے ہوئے پکڑ لیا جائے۔ یا پھر تمہیں برقع اوڑھ کر اپنے مردانہ حق رائے دہی کا استعمال کرنا پڑے۔''

یہ دونوں صورتیں چونکہ، علی الترتیب مزید رسوائی اور مردانہ گرم نگاہی کا سبب بن سکتی تھیں اس لئے ہم سنجیدگی سے ازالہِ حیثیتِ عرفی پر غور کرنے لگے۔

مگر جب ایک وکیل سے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے آج تک کوئی مقدمہ نہیں ہارا ہے، اس سلسلے میں مشورہ کیا تو اس نیک بخت نے اور دبدھا میں ڈال دیا۔ وکیل تھا اس لئے فوراً وکالت پر اتر آیا۔ کہنے لگا، جیسے ہی تم یہ بیان دو گے کہ تمہیں مذکر کی بجائے مونث کہہ کر ذلیل کیا گیا ہے، اور عورتیں چونکہ بالعموم مونث ہوتی ہیں، اس لئے فوراً تحریکِ آزادیِ نسواں حرکت میں آجائے گی۔ اور شہر کی تمام بہن جیاں (بہن جی کی جمع) اکٹھی ہو کر تمہارے خلاف مقدمہ ٹھوک دیں گی کہ تم نے گرامر کی آڑ لے کر ان کی عزت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ پھر ان دنوں پوری دنیا میں 'یومِ خواتین' اور 'ہفتہِ خواتین' بلکہ 'عشرہِ خواتین' تک منانے کا رواج بھی چل پڑا ہے، جس کا مقصد لوگوں میں یہ بیداری لانا ہے کہ عورت ہر لحاظ سے مرد کے برابر اور ہم پلہ ہے۔ یہاں تک بھی خیر ٹھیک ہے کیونکہ اکثر مرد واقعی عورتوں کے برابر آ کر ان کے پلے بندھ جانے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ مگر مشکل تب آتی ہے جب مرد حضرات بیدار ہوتے ہیں اور عورتوں کے اس دعوے پر یقین کر لیتے ہیں کہ وہ ہر معاملے میں مرد کے برابر ہیں۔ حتیٰ کہ دھوکہ بازی، بے وفائی، مکاری اور کمینگی میں بھی۔ نہ مرد سے زیادہ نہ کم۔ لہٰذا ہو سکتا ہے یہ تنازعہ، بین الاقوامی شکل اختیار کر لے۔ اور اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں تمہیں ایک بین الاقوامی خطرناک شخص قرار دے دیا جائے۔ اس طرح تم سیدھے امریکی میزائلوں کی زد میں آ جاؤ گے۔ جن سے نپٹنے میں میاں صدام بھی اگر آج بر سرِ اقتدار ہوتے تو ہرگز تمہاری مدد نہ کرتے۔

''ہائیں! وہ کیوں؟'' ہم دھک سے رہ گئے۔

تس پر وہ نا معقول کہنے لگا، پوری دنیا میں صدام حسین اکیلا مرد ناداں تھا جس نے چاروں طرف نا مرد داناؤں سے گھرے ہونے کے باوجود دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد سے بے خوف ہو کر ٹکر لی اور اپنے مطلوبہ انجام کو پہونچا۔ لہٰذا ایسا شخص تمہاری مشکوک مردانگی کا دفاع کرتا تو اس کی عالمی سطح پر مسلّمہ مردانگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ اس لئے میری رائے ہے کہ حیثیتِ عرفی کا خیال چھوڑو اور دیوانِ حافظ کا اردو ترجمہ پڑھو۔ وہ عرفی سے بڑا شاعر تھا۔

یوں اس وکیل نے بنا مقدمہ لڑے تگڑی مشورہ فیس وصول کر لی اور ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ تاہم یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ موصوف نے آج تک کوئی مقدمہ کیوں نہیں ہارا تھا۔ ظاہر ہے مقدمہ ہارنے کے لئے مقدمہ لڑنا اوّل شرط ہے۔

اس دوران ایک تیسرے خیر خواہ نے شک ظاہر کیا کہ ہو نہ ہو، اس میں فاشسٹ طاقتوں کا ہاتھ ہے۔ کیونکہ تم اکثر بھگوا پریوار کو تنقید کا نشانہ بناتے رہتے ہو اور یو پی میں ان دنوں اسی کی منظورِ نظر سرکار ہے، اس لئے فسطائی سرکار کی فسطائی اکادمی نے پہلے تمہیں اعزاز دیا اور پھر توصیفی سند جاری کر کے محض ساڑھے

www.taemeernews.com

تین ہزار روپے میں تمہاری تذکیر القط کر دی۔ لہٰذا اب تم جو چاہے کر لو۔ ادبی تذکروں میں تمہاری تذکیر کا تذکرہ کبھی نہیں آئے گا۔ خواہ اب تمہارے مذکر ہونے پر کوئی مذاکرہ ہی کیوں نہ منعقد ہو جائے، لوگ تمہیں مونث ہی مانتے رہیں گے۔

تبھی ایک قانونی نکتہ ہمارے دماغ میں آیا۔ ہم نے کہا، اکادمی کسی بھی کتاب پر ایوارڈ دینے سے پہلے اس کی کچھ جلدیں ضرور منگاتی ہے۔ ہماری کتاب بھی اس کے پاس ہوگی۔ جس پر ہماری مردانہ تصویر صاف چھپی ہوئی ہے۔ تب وہ ایک مذکر کو مونث کیسے بنا سکتی ہے؟ اس پر تو اُس کے خلاف غلط بیانی اور مجرمانہ غفلت کا کیس بن جائے گا۔

یہ سن کر وہ دھیرے سے مسکرائے اور کہنے لگے۔ تصویر میں تم مرد تو دکھائی دیتے ہو مگر چونکہ تم مونچھیں نہیں رکھتے اس لئے شک کی قانونی گنجائش رہ جاتی ہے۔ اور اسی گنجائش کو ذہن میں رکھ کر فسطائی طاقتوں نے بڑے سوفسطائی انداز میں تمہیں مشکوک بنا دینے والی سند جاری کی ہے۔ چنانچہ اکادمی پر کیس کرنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ ابھی تو اس غلط فہمی نے دوسرا ہی رخ اختیار کیا ہے۔ بعد میں کہیں تیسرا رخ اختیار کر لیا تو تمہاری تو نہیں البتہ ہماری عزت پر ضرور حرف آ جائے گا کہ ہم ایسی مخلوق سے بھی جان پہچان رکھتے ہیں۔ ہم نے تڑپ کر آس پاس دیکھا۔ مگر ان کی قسمت اچھی تھی کہ وہاں ہمیں کوئی اینٹ نہیں دکھائی دی۔ ورنہ ان کا خواہ کچھ بھی ہوتا مگر ہم اقدام قتل کے کیس میں ضرور جیل پہونچ جاتے۔

اب آپ ہی بتایئے قارئین کرام، ہم کیا کریں؟ برسوں سے تذکیر کے صیغے میں لکھتے آ رہے ہیں۔ پھر بھی ایک سرکاری اکادمی کو ہماری تذکیر میں شبہ ہے۔ ہمارے خیال سے تمام غلط فہمی دور کرنے کا اب ایک ہی طریقہ باقی بچا ہے۔ اور وہ یہ کہ اپنی خاتونِ خانہ کو چیر مین اردو اکادمی کے سامنے لے جائیں اور اپنے حق میں ان کا حلفی بیان دلوا کر نیا اور پوری طرح سے مستند سند نامہ حاصل کر لیں۔

ضمیر صاحب

ایک ہیں محترمی و مکرمی ضمیر صاحب۔ آپ ان سے کبھی نہ کبھی ضرور ملے ہوں گے کیونکہ یہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی نے آج تک انھیں مجسم نہیں دیکھا۔ لہذا یہ بتا مشکل ہے کہ دیکھنے میں کیسے لگتے ہیں۔ خدوخال کس طرح کے ہیں۔ نین نقش کس قسم کے ہیں۔ ناک چپٹی ہے یا موٹی۔ آنکھیں کالی ہیں یا بھوری۔ گال پچکے ہوئے ہیں یا پھولے ہوئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر واقعی انھیں دیکھنا ہے تو آئینے میں دیکھنا چاہئے۔ لیکن جب بھی کوئی انھیں آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو دیکھنے والے کو خود اپنی شکل نظر آ جاتی ہے اور وہ لاحول پڑھ کر آئینہ ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ خود میں نے بھی ایک مرتبہ آئینہ سامنے رکھ کر ضمیر صاحب کو دیکھنے کی کوشش کی تو اس میں ایک عجیب اول جلول سے بدشکل آدمی کو اپنی طرف غصے سے گھورتے ہوئے پایا۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا وہ میں تھا۔ استغفراللہ کہہ کر میں نے آئینہ دوسری طرف رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ اگر ضمیر کا حلیہ ایسا ہے تو آدمی بے ضمیر ہی بھلا۔ کاروبارِ حیات ایسی بری شکل والے ضمیر صاحب کے بغیر زیادہ اچھی طرح چل سکتا ہے۔ (ایک ملاقات ضمیر صاحب سے)

یہ چونکہ ایک اہم خیال تھا اس لئے مناسب سمجھا کہ میاں عبدالقدوس سے مشورہ کر لیا جائے۔ وہ سنتے ہی کہنے لگے۔ ''عجیب احمق ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یوپی اردو اکادمی کی چیر مین بذاتِ خود ایک خاتون ہیں۔ جنہوں نے توصیفی سند میں اپنے ہاتھ سے دستخط کر کے تمہاری مردانگی کو قطع کیا ہے۔ پھر اتفاق سے تمہاری بیوی بھی خاتون ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دونوں خاتونیں ہم خیال ہو جائیں۔ آخر عورت ذات ہیں۔ عورتیں بالعموم ہم خیال ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگایا کرتیں۔ لہٰذا یہ سوچ لو کہ کہیں تمہارا نکاح نہ خطرے میں پڑ جائے۔'' یہ سن کر بے ساختہ جی چاہا کہ مارے افسوس کے ان کا سر پیٹ لیں!

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

خوابوں کی جھگی بستی

اور پھر سپریم کورٹ کے جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس بی ایل ہنسار یا نے فرمایا:

''...صحافیوں کو اگر آزادیٔ صحافت عزیز ہے تو انہیں رہائش یا دوسرے معاملوں میں حکومت سے کوئی رعائت نہیں مانگنی چاہئے۔ انہیں چاہئے کہ وہ جگی جھونپڑیوں میں (بھی) رہنے کو تیار رہیں...''

پچھلے دنوں چناؤ کے دوران مقامی امیدوار کو ایک جھگی بستی میں نوٹ اور دیسی شراب کی تھیلیاں بانٹتے دیکھ کر مجھے فاضل ججوں کا یہ قول یاد آ گیا۔

عالم فاضل ججوں کی دانشورانہ رائے کو یاد کر کے میرا دل ایک بار پھر خوشی سے جھوم اٹھا اور یہ سوچ کر فخر سے سینہ کئی انچ چوڑا ہو گیا کہ:

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

نیز، عدالتیں اب واقعی ہماری زندگی کی سچی رہنما بن گئی ہیں اور لگتا ہے کہ جمہوریت، دیانت داری، انصاف، سیکولرزم، سچائی اور برابری کے بنیادی عناصر خمسہ وشمہ اب ان ہی کے دم دم قدم سے باقی رہیں گے۔

یہی سب سوچتا ہوا ایک روز میں سپریم کورٹ کی طرف جا نکلا اور وہاں جو وکیل سب سے زیادہ فرصت میں خالی بیٹھا تھا، اس سے اپنا تعارف کرانے اور فاضل ججوں کے مشورے کا حوالہ دینے کے بعد میں نے کہا:

''جناب آپ نے صحافیوں کی آزادیٔ رہائش کے بارے میں ہمارے جسٹس حضرات کا یہ ریمارک تو سنا ہی ہوگا۔ لہٰذا میں عدالت کو اطلاع دینے آیا ہوں کہ مجھے اپنی صحافتی آزادی دل وجان سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لئے فوراً کسی جھگی جھونپڑی میں رہنے کو تیار ہوں۔ بتایئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

وکیل نے پہلے مجھے سر سے پاؤں تک اور پھر احتیاطاً پاؤں سے سر تک غور سے دیکھا۔ میرے معمولی کپڑے اور ان سے بھی معمولی جوتے دیکھ کر برا سامنہ بنایا اور پھر اپنے منشی کو بلا کر ڈانٹا:

''اسے کس نے اندر آنے دیا؟''

''جی میں نے! میں سمجھا کوئی مؤکل ہے۔'' منشی نے کہا۔

''اس کی حالت دیکھ رہے ہو؟ سپریم کورٹ میں آنے والے مؤکل ایسے ہوتے ہیں۔'' وکیل آخر وکیل تھا اس لئے جرح پر اتر آیا۔

''جناب پرانے گھسے پٹے مؤکل ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' منشی بولا۔ ''لگتا ہے ضلعی عدالت اور ہائیکورٹ میں اچھی طرح رگڑے کھا چکا ہے۔ دیکھتے نہیں اس کے جوتے کتنے گھس گئے ہیں۔ ان ہی کو دیکھ کر تو میں نے اسے آپ سے ملنے دیا۔ کیا فیس دینے میں آنا کانی کر رہا ہے؟''

''ابے احمق یہ مؤکل نہیں، صحافی ہے اور وہ بھی کوئی تھرڈ ریٹ صحافی۔ کہتا ہے میں جھگی جھونپڑی میں رہنا چاہتا ہوں۔''

وکیل کے کمرے سے باہر آنے پر منشی مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''کیوں بھئی، یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ بنگلہ دیش کے سیلاب زدگان ہو کیا؟'' منشی نے کسی قدر ہمدردی سے پوچھا۔

''نہیں یار، میں تو یہیں کا ہوں۔'' میں نے اسے بتایا اور پھر سارا قصہ سنا دیا۔

''اوہ! تو یہ بات ہے۔'' سب کچھ سن کر منشی نے کہا۔

www.taemeernews.com

''ہاں۔ یہی بات ہے۔'' میں نے کہا۔''میں اُس جھگی بستی کا پتہ پوچھنے آیا ہوں جس میں رہنے کے لئے جج صاحبان نے تیار رہنے کا حکم دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے! تم ایسا کرو، سامنے پرگتی میدان کے بس اسٹاپ پر چلے جاؤ۔ وہاں سے تمہیں زیرو نمبر کی ایک بس ملے گی۔ بس، اس بس پر سوار ہو جانا۔ وہ سیدھا تمہیں اس جھگی بستی تک پہنچادے گی۔ جس کا مشورہ ہائیکورٹ کے جج صاحبان نے دیا ہے۔''

وکیل کے منشی کا شکریہ ادا کر کے میں بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ جہاں تھوڑی دیر کے بعد سچ مچ زیرو نمبر کی ایک بس آ کر رک گئی۔ میں فوراً اس بس میں سوار ہو گیا۔ اور پھر یہ دیکھ کر تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بس بالکل خالی تھی۔ مسافر تو مسافر، اس میں کوئی ڈرائیور اور کنڈکٹر بھی نہیں تھا۔ بس یوں ہی اپنے آپ چلی جا رہی تھی!

منزل مقصود پر پہنچ کر بس اپنے آپ رک گئی۔ میں بس سے اتر گیا۔ وہاں سڑک کے کنارے لگے ہوئے ایک بڑے سے بورڈ پر موٹے حروف میں لکھا تھا:

'منزل مقصودٌ'

اس بورڈ کے پیچھے دور تک جھگیاں ہی جھگیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یوں سمجھئے کہ جھگیوں کا ایک جنگل اُگا ہوا تھا جس میں جھگیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ کوئی پیڑ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف گندگی اور غلاظت کے ڈھیر تھے اور یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ کس جھگی تک پہنچنے کے لئے کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔

مگر واہ! کیا عجیب جھگی بستی تھی۔ ایک ساتھ اتنی ساری جینوئن جھگیاں دیکھ کر سچ مچ جی خوش ہو گیا۔ سماج کے ہر طبقے کے لوگ وہاں موجود تھے۔

سب سے پہلے صحافیوں کی جھگیاں پڑتی تھیں جو ایک گندے نالے کے پشتہ پر آباد تھیں۔ ان میں سے ایک جھگی پر، جو اپنی خستہ حالی، پھٹی پرانی پولیتھین سے ڈھکی چھت اور آس پاس پھیلی گندگی کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی جھگی نظر آ رہی تھی، نظر پڑتے ہی میں چونک گیا کیونکہ اس کے ایک کونے پر گتے کا ایک ٹکڑا لگا ہوا تھا اور اس پر چاک سے لکھا: ''یہ اعلیٰ حضرت، صحافیٔ بے نظیر نصرت ظہیر صاحب کی جھگی ہے۔''

میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ ایک طرف سرکاری ملازموں کی جھگیاں تھیں۔ پاس ہی فقیر اور مداری آباد تھے۔ سامنے بڑے سرکاری افسروں، مثلاً آئی اے ایس، آئی پی ایس، آئی آر ایس اور آئی ایف ایس افسروں، چیف انجینئروں اور ڈاکٹروں وغیرہ کی جھگیوں کا پلاٹ پڑتا تھا۔ ڈاکٹروں کی جھگیوں میں کئی لوگ چھتوں اور گلیوں کو جراثیم کش دواؤں کے اسپرے سے ڈِس انفکٹ کر رہے تھے۔

ایک کونے میں شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور موسیقاروں نے جھگیاں ڈال رکھی تھیں۔ ان میں ہر دوسری تیسری جھگی سے تاک دھنادن، مکرر ارشاد اور مابعد الجدیدیات کا شور اٹھ رہا تھا۔ اسی طرح نیتا، وزیر، سکریٹری، انڈر سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری حضرات بھی الگ الگ جھگیاں ڈالے ہوئے تھے۔

میں نے دیکھا:

ایک جھگی کے باہر چندرا سوامی آلتی پالتی مارے بیٹھے بیڑی پی رہے ہیں اور بار بار ٹھنڈی آہیں بھر کر بیتے دنوں کو یاد کر رہے ہیں۔ ایک جھگی میں پرمود مہاجن چارپائی پر بیٹھے اپنا لیپ ٹاپ کمپیوٹر گود میں رکھ کر سر پکڑے بیٹھے ہیں۔ وینکیا نائیڈو اپنی جھگی کے صحن میں، یعنی جھگی کے باہر ٹوٹے پھوٹے اسٹول پر بیٹھے کسی کو اپنا بیان ڈکٹیٹ کرا رہے تھے۔

''...لکھو۔ یہ سب اپوزیشن کا سازش ہے۔ ہم کانگریس کو...''

''مگر یہ بیان تو خود آپ کے خلاف ہو جائے گا۔ آپ ہی تو اپوزیشن ہیں...'' ڈکٹیشن لینے والے نے یاد دلایا۔

''اوہو، چھ سال سرکار میں رہ کر ہم کو اپوزیشن کا خلاف بولنے کا عادت پڑ گیا ہے۔ اب یہ ڈکٹیشن چھوڑو، ہمارا پرانا اسٹیٹمنٹس کا فائل نکالو۔ ہر اسٹیٹمنٹ میں سرکار کا جگہ اپوزیشن اور اپوزیشن کا جگہ سرکار ٹائپ کرو... اور ڈیلی ایک اسٹیٹمنٹ ریلیز کرتے رہو۔ کیا

www.taemeernews.com

سمجھے!؟''

میں آگے بڑھ گیا۔

مس مایاوتی اپنی جھگی کے دروازے میں کھڑی ایک لڑکے کو ڈانٹ رہی تھیں۔

''اوئے تجھے میں نے کون سی چائے کا ڈبہ لانے کو بولا تھا اور تو یہ کیا اٹھا لایا...''

''یہ تاج محل چائے ہے بہن جی۔ سب سے بہترین اور...''

لڑکے نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اوئے تو منوادی ہے کیا؟... کہیں ملائم سے تو ملا ہوا نہیں ہے تو۔ بڑا آیا تاج محل کا ٹھیکیدار۔ ٹھہر ابھی چمٹے سے تیری خبر لیتی ہوں...''

تھوڑا آگے چل کر ایک ڈھابہ پڑتا تھا۔ اس پر ایک چھوٹا سا سائن بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا: 'لالو کا ڈھابہ'

نیچے یہ عبارت تحریر تھی۔

یہاں ہر قیمت کا ونج اور نان ونج کھانا ہر وقت تیار ملتا ہے۔ ہر تھالی کے ساتھ مویشیوں کے چارے کی ایک پلیٹ اور دودھ کا ایک کلہڑ مفت!

ایک جھگی کے دروازے پر لکھا تھا: 'بھونڈسی کا آشرم!'

یہ کافی وسیع و عریض، تقریباً دس پندرہ جھگیوں کے برابر ایک بہت بڑی جھگی تھی۔ اس کے باہر بڑھی ہوئی شیو والا ایک شخص ایک آنکھ بند کئے، مراقبہ کی حالت میں بیٹھا تھا۔ اس کے آگے کئی حجام دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ہر ایک بار بار پوچھتا جاتا تھا:

''حضور حکم ہو تو شیو بنادوں۔ میرے پاس ولائتی بلیڈ ہے!''

مگر مراقبہ میں بیٹھا شخص کوئی نوٹس نہیں لے رہا تھا اور ہر چند کہ وہ مراقبہ کی حالت میں تھا مگر اس کے دونوں ہاتھ سامنے ہوا میں لگاتار ہل رہے تھے اور دونوں ہاتھوں کی بڑی انگلیوں سے وہ ہوا میں کچھ عجیب قسم کی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی جوڑ توڑ میں مصروف ہو۔

میں نے پہچان لیا۔ یہ چندر شیکھر صاحب تھے۔ میں دور سے ہی آداب کر کے آگے بڑھ گیا۔ مگر کن انکھیوں سے دیکھا تو مراقبہ میں کھلی ہوئی ان کی واحد آنکھ غور سے میری نقل و حرکت دیکھ رہی تھی!

کافی دیر گھومنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ ہر چند اس بستی میں سماج کا ہر طبقہ، موجود تھا۔ لیکن طبقاتی فرق یہاں بھی برقرار تھا۔ میری ساری خوشی کافور ہوگئی۔ میں نے دیکھا، سرکاری ملازموں کی جھگیاں اس علاقہ میں تھیں جہاں سے پانی اور بجلی کی مین لائنیں گزرتی تھیں اور وہاں رہنے والے بہ آسانی پائپ اور تار ڈال کر پانی یا بجلی چوری کر سکتے تھے۔ افسروں، انجینئروں اور ڈاکٹروں کی جھگیاں بڑی صاف ستھری جگہوں پر تھیں اور ان میں ٹیلیفون تک لگے ہوئے تھے۔

وزیروں کی جھگیوں کے چاروں طرف لوہے کی خاردار تاروں کی باڑ لگی ہوئی تھی اور عام جھگی نشین ان میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ سیاست دانوں کی جھگیاں باہر سے خستہ حال اور ٹوٹی پھوٹی تھیں لیکن اندر سے پوری طرح پختہ۔ اور ان میں ٹیلی فون ٹیلی ویژن اور ایئر کنڈیشنر بھی تھے۔

اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ صحافیوں کو جھگیاں ڈالنے کے لئے گندے نالے کے پاس والی جگہ دی گئی تھی۔

میں دکھی دل کے ساتھ اپنی جھگی کی طرف چل پڑا۔ آخر یہاں بھی ناانصافی چل رہی تھی اور تبھی مجھے احساس ہوا کہ یہ عجیب وغریب بستی پورے سماج کا آئینہ تھی۔ مگر کچھ ایسا بھی تھا، جس کی کمی تھی۔ جسے وہاں ہونا چاہئے تھا، مگر نہیں تھا۔ میں نے دماغ پر زور ڈالا۔ ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر پوری بستی پر نگاہ دوڑائی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا تھا، جو نہیں تھا!

میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور گہرے کش لیتے ہوئے سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر جیسے پٹ سے کوئی کھڑکی کھل گئی اور میری سمجھ میں آگیا کہ وہ عجیب بات کیا تھی!

بستی میں سب کی جھگیاں تھیں، مگر ججوں کی جھگی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس بی ایل ہنسار یا کی بھی نہیں!

(تحریر: دسمبر 1996۔ نظر ثانی: 2013)

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

پچّیس گز کا مکان

جو لوگ اپنا مکان خود بنانے یا بنوانے کی خواہش دل میں رکھتے ہیں اُن کی رہنمائی کے لئے داناؤں نے یہ قول' کہہ' رکھا ہے کہ بے وقوف اس دنیا میں مکان بناتے ہیں اور عقل مند اُن میں رہتے ہیں۔

داناؤں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اُن کی کوئی بات دانائی سے خالی نہیں ہوتی۔ ہر معاملے میں کچھ نہ کچھ رہنمائی ضرور فرما دیتے ہیں۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک آدمی نہ جانے کن کن حالتوں سے گزرتا ہے، کیسے کیسے خیال اُس کے دماغ میں آتے ہیں، کیا کیا منصوبے وہ باندھتا ہے... لیکن ہر حالت ہر خیال اور ہر منصوبے کی راہ میں کوئی نہ کوئی ارسطو، افلاطون، کنفیوشس، سعدی، ملٹن، رسل یا اور کوئی نہیں تو شیکسپیئر صاحب جیسا کوئی شیخ یا پیر گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے، اور اپنے کسی نہ کسی قول سے فوراً آپ کے چودہ طبق روشن کر ڈالتا ہے۔ چنانچہ کچھ غلط نہیں جو بچپن سے ہی ہم داناؤں سے بچتے بچاتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آج بھی کسی شخص میں دانائی کی ذرا سی بو آئے تو ہم جھٹ اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ شائد اسی لئے بڑی حد تک چین سے جی رہے ہیں۔

ایک بار کسی بڑے آدمی سے کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ کو اس مقام تک پہونچانے میں سب سے بڑا ہاتھ کس کا ہے؟ اُنہوں نے فوراً جواب دیا میرے بزرگوں کا، کیونکہ اُنہوں نے جو کچھ مجھے کرنے کو کہا میں نے ہمیشہ اُس کے برعکس کیا۔ تاہم جہاں تک مکان بنانے کا تعلق ہے تو ہم نے دانا بزرگوں کے مذکورہ بالا قول کا ہر ممکن احترام کیا اور اپنا مکان بنانے کی بے وقوفی سے ہمیشہ بچتے رہے۔ اس بے وقوفی کا موقع ہم نے سدا دوسروں کو دیا اور ان کے بنائے ہوئے مکانوں میں کرائے پر رہ کر خود کو عقل مند اور دانشور سمجھتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ دانشوری کا یہ مظاہرہ ہمیں خاصا مہنگا پڑا۔

اس دوران اتفاق دیکھئے کہ دہلی شہر کی ایک غریب سی کالونی میں ایک غریب سے پراپرٹی ڈیلر نے پچیس گز زمین کا ایک ٹکڑا ہمیں مٹی کے بھاؤ بیچ دیا۔ ٹکڑا جسے پلاٹ کہنا ہمیں پلاٹ کی توہین معلوم ہوتا ہے، چونکہ بہت چھوٹا تھا اس لئے اُس پر مکان بنانے کا خیال تو خیر کیا آتا۔ ہم نے سوچا چلو آخرت کے ہی کام آ جائے گا، اور ہماری وفات حسرت آیات کے بعد گھر والوں کو ہماری میت ٹریفک اور مہنگائی کے اس دور میں یہاں وہاں نہیں ڈھونا پڑے گی۔ بڑے شہروں کا حال تو آپ جانتے ہی ہیں۔ سر چھپانے کے لئے مکان اور عزت سے مدفون ہونے کے لئے قبر کی جگہ ان میں بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ لہٰذا ہم خوش تھے کہ زندہ رہنے کے لئے مکان نہیں بنا تو کیا ہوا، قدرت نے مرنے کا ٹھور ٹھکانا تو کر دیا ہے۔

اپنے انتقالِ پُر ملال سے بعافیت فارغ ہو کر ہم پابندی سے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے رہے اور ماہ بہ ماہ ہماری ایک تہائی تنخواہ مکان مالک کے ہاتھوں میں پہونچتی رہی۔ لیکن جب عقل مندی حد سے گزر گئی اور ہماری تنخواہ میں مکان مالک کا حصہ ہمارے اپنے حصے سے تجاوز کر گیا تو ہمیں کچھ سوچنا پڑا۔ ورنہ اس سے پہلے تک ہم اتنے سعادت مند کرایہ دار تھے کہ ایک مرتبہ جب دوستوں میں گپ ہانکنے کا مقابلہ ہوا کہ اگر کسی کی دس کروڑ

www.taemeernews.com

کی لاٹری نکل آئی تو سب سے پہلے وہ کیا کرے گا، تب ہمارا جواب یہ تھا کہ سب سے پہلے ہم مکان مالک کا اگلے بیس برس کا کرایہ پیشگی ادا کر دیں گے اور آرام سے پوری تنخواہ اپنے اوپر خرچ کیا کریں گے۔ ہم اپنی اس ذہنی غلامی کے ساتھ عافیت سے زندگی گزارنے کو تیار تھے مگر جب بیوی نے اطلاع دی کہ آئندہ مہینے سے چھوٹی بچی کا دودھ بند کرنا پڑے گا اور خود وہ سبزی گوشت خریدنے کے لئے دو کلو میٹر دور رکشہ سے جانے کی بجائے اب پیدل آیا جایا کریں گی تو ہمیں اُن دونوں کے ساتھ دودھ والے اور رکشہ والے کی بھی فکر لاحق ہوگئی کہ ہماری وجہ سے کہیں ان کے چولہوں کی آنچ بھی نہ کم ہو جائے۔ اس روز پہلی بار ہمیں احساس ہوا کہ چولہوں میں بھی ایک طرح کی رشتہ داری ہوتی ہے۔

ایک خیر خواہ نے مشورہ دیا، وہ پچیس گز کی جگہ تو تمہارے پاس ہے ہی۔ اس پر مکان کیوں نہیں بنوا لیتے؟ ہم نے انہیں سمجھایا کہ میاں اتنی مختصر جگہ زندہ آدمیوں کے بقیدِ حیات رہنے کے لئے ناکافی و نا مناسب ہے۔ پھر ہمارے پاس اتنی رقم کہاں۔ مالکان مکانات نے ہمیں اتنی رقم جوڑنے کا موقع ہی کب دیا ہے کہ ہم اُن کی کرایہ داری سے باعزت بری ہوکر خود اپنا مکان بنانے کا خیال بھی دل میں لاسکیں۔ ہماری زندگی میں تو ممکن نہیں البتہ ہمارے فوت ہو جانے کے بعد ممکن ہے کہ اس جگہ آخرت کا گھر بن جائے۔

اس پر انہوں نے ہمیں قنوطی، یاسیت پرست، بلکہ رجعت پسند جدید یا ہونے تک کا طعنہ دے دیا اور بولے کہ شکر کرو تمہارے پاس دلی شہر میں پچیس گز کا پلاٹ ہے، ورنہ ایک مغل بادشاہ کو تو یہاں دو گز زمین تک میسر نہیں آئی تھی۔ اور وہ شعر بھی غالباً تم نے نہیں سنا ہے کہ...

کہہ دے ظفر سے جا کے یہ کوئی مزار میں
دو گز زمین ملتی ہے ستر ہزار میں
(اسرار جامعی)

اس لئے خاک ڈالو اپنے خیالات پر اور کسی ملٹی نیشنل بنک سے قرض لے کر دو تین کمرے بنوا ڈالو۔ کم بخت مکان مالک سے تو نجات ملے گی۔

ہم نے انہیں سمجھایا کہ جناب من پچیس گز کی زمین پر ایک ہی کمرہ بن جائے تو غنیمت ہے۔ ورنہ دو تین کمروں کے لئے تو ہمیں دائیں بائیں سرکاری زمین پر غیر قانونی قبضے کرنے پڑیں گے۔ اور چونکہ غیر قانونی قبضے قانوناً غیر قانونی ہوتے ہیں اس لئے ان قبضوں کے بعد یقین ہے کہ جیل میں ضرور ہمارا دائمی گھر بن جائے گا۔

اس مرتبہ انہوں نے ہمیں پہلے سے بھی زیادہ ترس کھانے والی نگاہوں سے دیکھا اور اظہارِ تأسف کے انداز میں بولے۔ ''مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے۔ کیونکہ تمہاری عقل کا پلاٹ اس زمین سے بھی زیادہ مختصر معلوم ہوتا ہے۔'' پھر یکایک غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''ارے بھائی اگر دائیں بائیں نہیں پھیل سکتے تو کیا ہوا۔ نیچے سے اوپر تو جا سکتے ہو۔''

ہم نے کہا بے شک۔ اوپر تو ایک دن سبھی کو جانا ہے۔ مگر ہم ابھی سے کیوں اوپر جائیں۔ اس بار انہوں نے جھنجھلا کر ہمارا سر پیٹ لیا۔ بولے۔ ''معلوم ہوتا ہے آج کل مابعد جدید ادب کا کچھ زیادہ ہی مطالعہ کرنے لگے ہو۔ اماں بندۂ خدا، اگر دائیں بائیں کمرے نہیں بنا سکتے تو کیا ہوا۔ تلے اوپر تو بنا سکتے ہو۔ ڈرائنگ روم پر بیڈ روم، بیڈ روم کے اوپر بیت الخلا، اُس کے اوپر باورچی خانہ... ایسا کرنے سے تمہیں کون روک سکتا ہے۔ آسمان تو بلا شرکتِ غیرے اوپر والے کی ملکیت ہے۔ لہٰذا وہاں کوئی قانون بھی آڑے نہیں آسکتا۔'' اس سے پہلے کہ ہم کچھ اور کہتے انہوں نے ہمارا بازو پکڑا اور یہ کہتے ہوئے ساتھ لے لیا کہ چلو تمہیں ایک بہت ہی ذہین اور پہونچے ہوئے نقشہ نویس کے پاس لئے چلتا ہوں۔ انشاء اللہ ایسا نقشہ بنا کر دے گا کہ بیڈ روم، ڈرائنگ روم، کچن، باتھ روم، ٹائلٹ سب پچیس گز میں اوپر تلے نکل آئیں گے۔

www.taemeernews.com

ہم اس شرط پر ان کے ساتھ چل دیے کہ نقشہ کی ترتیب وہ نہیں ہوگی جو ان کے ذہن میں تھی۔ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ اس مکان کے مالک اور مدیر چونکہ ہم ہیں لہٰذا اس کی فہرست مضامین ہم خود مرتب کریں گے۔

بہر حال وہ ہمیں ایک نقشہ نویس کے پاس لے گئے۔ تمام کیفیت سننے کے بعد نقشہ نویس نے ہم سے مجوزہ مکان میں رہنے والے نفوس کی تعداد پوچھی، پھر ان کی عمریں الگ الگ اور کُل ملا کر دریافت کیں، اور یہ سب تفصیل ایک نوٹ بک میں درج کرنے کے بعد فیتے سے ہمارا ناپ لینا شروع کر دیا۔

ہم نے انھیں فوراً یاد دلایا کہ جناب ہم شیروانی سلوانے نہیں بلکہ مکان کا نقشہ بنوانے آئے ہیں۔ انھوں نے بڑے اطمینان سے کہا، خاموش رہو وہی بنا رہا ہوں۔ تمہارا ناپ لینا اس لئے ضروری ہے کہ دروازے کی اونچائی اور زینے کی چوڑائی کا ٹھیک ٹھیک حساب لگایا جا سکے۔

مگر جب وہ ہماری گردن ناپنے لگے، اور وہ بھی محاورے سے نہیں بلکہ فیتے سے، تو ایک خوف کی جھرجھری سی ہمارے تن بدن میں دوڑ گئی۔

ہم نے نہایت عاجزی سے عرض کیا۔ قبلہ ہمارا خودکشی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اور پھر پھانسی گھر الگ سے کون اپنے گھر میں بناتا ہے۔ اس کے لئے تو چھت کے پنکھے ہی کام میں آ جاتے ہیں۔

اس پر وہ کہنے لگے، میرے عزیز آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں پھانسی کے لئے نہیں بلکہ کھڑکیوں کے سائز کے لئے گردن کا ناپ لے رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مکان بننے کے بعد آپ کسی کھڑکی سے منھ باہر نکال کر جھانکیں اور بس پھر جھانکتے ہی رہ جائیں۔ اور راہ چلتے لوگ دیکھ کر یہ سوچنے لگیں کہ مکان مالک نے بری بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا عجیب ہنڈیا دیوار پر لٹکا رکھی ہے۔ کھڑکی کم از کم اتنی بڑی ضرور ہونی چاہئے کہ اس میں آدمی کی گردن نہ پھنسے اور ایک بار کھڑکی میں گردن ڈال دے تو واپس نکال بھی سکے۔ اس پر ایک پھڑکتا ہوا شعر یاد آ گیا سن لیجئے۔ کہا ہے...

جھانک کر جب اس نے چلمن ڈال دی
دیکھنے والے نے گردن ڈال دی

یوں جی بھر کے دن دہاڑے ہماری توہین کر چکنے کے بعد وہ حضرت دیر تک کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے رہے اور پھر شمع ادبی معمے جیسا ایک نقشہ ہمارے ہاتھ میں تھما کر بولے...

''جائیے کسی اچھے سے راج مستری کو یہ نقشہ دے دیجئے، خدا نے چاہا تو ایسا عمدہ مکان بنے گا کہ زندگی بھر اسے چھوڑنا نہیں چاہیں گے۔ اور چاہیں گے تو مکان آپ کو نہیں چھوڑے گا۔''

ہم نے ایک حسرت بھری آہ کھینچی اور نقشہ جیب میں رکھ کر ان کے دفتر سے باہر آ گئے۔ ہمیں اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے مختصر سے قطعہ اراضی پر جو کہ ایک اوسط کنبے کی قبروں کے لئے بھی ناکافی ہے زندہ آدمیوں کے لئے پورا ایک مکان بن سکتا ہے! ایسا مکان جس میں ڈرائنگ روم، بیڈ روم، کچن، باتھ روم، ٹائلٹ سب الگ الگ ہوں؟

مگر جیب میں جو نقشہ تھا وہ کہتا تھا، ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے۔ ہم بار بار نقشہ جیب سے نکال کر دیکھتے اور دیکھ کر واپس جیب میں رکھ لیتے۔

آخر اس متواتر عمل سے ہمیں یقین آ گیا کہ اس نقشے کی بدولت ہم کرایہ دار سے مالک مکان کے رتبے کو پہونچ سکتے ہیں یہ باور کرتے ہی ہم خوشی سے جھوم اٹھے۔ یکا یک پوری دنیا ہمیں پرائی بیویوں کی طرح حسین معلوم ہونے لگی۔ سینے میں آرزوؤں کا سمندر جوش مارنے لگا۔ مسرت و شادمانی کے جذبات تھے کہ چھلکے آتے تھے۔ ایک لمحے کو جی چاہا کہ نکڑ پر جو پولس والا کھڑا ہے، پاس جا کر اس کی کمر پر خوش دلی سے ایک زوردار دھپ رسید کر دیں اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کر کے زور سے بغل گیر ہو جائیں۔ مگر نہ جانے کس پُر اسرار طریقے سے اسے ہمارے

www.taemeernews.com

ارادوں کا علم ہو گیا اور وہ ہمیں خشونت سنگھ آمیز نگاہوں سے مشکوک انداز میں گھورنے لگا۔ چنانچہ ہم نے فوراً اپنے پُر خطر اظہارِ مسرّت کو ملتوی کر کے نقشہ جیب میں رکھ لیا۔

مگر پولس والا بھی پورا بزرگِ باراں دیدہ تھا۔ تیزی سے ہمارے قریب آکر بولا ''کیا چھپایا ہے فوراً نکالو!''

ہم نے مکان کا نقشہ جیب سے نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ کاغذ کو آزاتر چھا کر کے ہائی اسکول کی سند کی طرح جانچنے اور ہماری طرف ہفتہ طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ چند لمحوں تک وہ ادبی معمے جیسے اُس نقشے کو سمجھنے اور اپنی سرکاری آنکھوں کے ترازو سے ہماری حیثیت کا وزن تولنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اچانک پورا ٹول نکال کر سر کو گول گول گھماتے ہوئے بولا ''ہوں! تو یہ کوئی سرکاری راز ہے۔ کسی فوجی اڈے کا نقشہ۔ تھانے چلو۔''

ہم نے سمجھایا کہ جنابِ والا آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ پچیس گز کے مکان کا نقشہ ہے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ پچیس گز کے مکان میں رہنے والے سرکار سے تو کیا آپس میں بھی ایک دوسرے سے رازداری نہیں برت سکتے۔ اور پھر پچیس گز میں کوئی فوجی اڈہ تو دور رہا فوجی بیت الخلا تک نہیں بن سکتا۔ چاہیں تو نقشہ نولیس کے یہاں چل کر تصدیق کر لیں کہ یہ واقعی مکان کا نقشہ ہے یا نہیں۔

ساری بات سن کر اس نے کہا ''یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ یہ مکان کا نقشہ ہے، مگر مجھے شبہ ہے کہ اس نقشے کی مدد سے ایٹمی آب دوز کا نقشہ بھی تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے چلو تھانے۔''

یہ کہ کر اس نے پھر رشوت خور آنکھوں سے دیکھا اور پیٹھ موڑ لی۔ دائیں ہاتھ سے وہ ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر رہا تھا جب کہ پیچھے کی طرف مڑی ہوئی بائیں ہتھیلی کچھ اور ہی کہہ رہی تھی!

ہم سمجھ گئے۔ جائے مفر کوئی نہیں۔ چنانچہ چپ چاپ جیب سے بیس کا نوٹ نکال کر بائیں ہتھیلی پر رکھا اور اپنا نقشہ اور دونوں پاؤں سر پر رکھ کر کالونی کی طرف بھاگ لئے۔

وہاں پہونچ کر ہم نے علاقہ کے سب سے مشہور راج مستری کے گھر کا رخ کیا جس کے بارے میں لوگوں نے بتایا کہ پچیس گز کے مکان بنانے میں بلا کا ماہر ہے۔ اور یہ بھی کہ کالونی کے ۹۰ فیصد ثابت و سالم مکان اُسی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ''اور باقی دس فیصد؟'' ہم نے احتیاطاً پوچھا۔ جواب ملا ''وہ بھی بنائے تو اُسی نے تھے مگر جلد ہی ٹوٹ پھوٹ کر گر گئے۔ جیسی اللہ کی مرضی!'' ہم سمجھ گئے یہاں بھی جائے مفر نہ تھی۔ مستری کے گھر جا کر دستک دی تو مکان کے باہر نالی کے قریب بیٹھ کر بیڑی پھونکتے ہوئے ایک مدقوق سے شخص نے پوچھا ''مستری جی کو پوچھ رہے ہو کیا؟''

ہم نے کہا ہاں۔ بولا ''وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔ کیا کام تھا؟'' ہم نے بتا دیا، مکان بنوانا ہے۔ کہنے لگا۔ ''یہ بات ہے تو میں ہی مستری جی ہوں اور یہ میرا ہی مکان ہے۔ لائیے نقشہ دکھائیے!''

ہم نے نقشہ اس کے حوالے کر دیا۔ مستری نے پہلے خوب گھما پھرا کر نقشے کا جائزہ لیا اور پھر اُسے آسمان کی طرف اٹھا کر اس طرح آر پار دیکھنے لگا جیسے پانچ سو کے نوٹ کا دھاگا دیکھتے ہیں۔ اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد مستری نے پوچھا۔ 'سب اسی کے مطابق بنوانا ہے؟'' ہم نے کہا بالکل۔ وہ بولا ٹھیک ہے، بن جائے گا۔ ہم نے پوچھا کب تک؟ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں اور انگوٹھوں پر حساب لگا کر بتایا، ویسے تو کام ایک ہفتے کا ہے مگر انشاءاللہ ایک مہینے میں پورا ہو جائے گا۔

حالانکہ جواب کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر ہم یہ سوچ کر چپ رہے کہ پہونچا ہوا مستری ہے اور چونکہ ہر بڑے فنکار کی بعض باتیں عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں اس لئے شائد ہم بھی اس کے فنکارانہ نکتے کی تہہ تک نہیں پہونچ پا رہے ہیں۔

خیر صاحب اگلی صبح مستری نے ہم سے دو بار دیسی گھی کے سوا سولڈ و بازار سے منگوائے ان میں سے چار مکان کی چاروں دیواروں کی بنیاد میں رکھ دئے اور باقی اپنے دو عدد بیلداروں اور اپنے درمیان غیر مساویانہ طور پر تقسیم کروا کر بنیاد کی کھدائی شروع

www.taemeernews.com

کرادی۔ اگر چہ ان میں سے ایک لڈو بھی ہمارے پلّے نہیں پڑا تاہم اپنا مکان بننے سے ہم اس قدر خوش تھے کہ اتنی خوشی شاہجہاں کو تاج محل بنواتے وقت بھی نہ ہوئی ہوگی۔ اور ہوتی کیوں نہیں آخر ہم بھی تو اپنے خوابوں کا تاج محل بنوا رہے تھے۔ اور وہ بھی صرف پچیس گز میں، دوگنا جس کا پچاس گز ہوتا ہے!

مگر یہ سرشاری زیادہ دیر نہ رہ سکی۔ کیونکہ اس کے بعد شروع ہوگیا مستری کی ہدایتوں کا لا متناہی سلسلہ۔ ریت منگاؤ، اینٹیں لاؤ، سیمنٹ کی بوریاں بھجواؤ۔ ریت والے سے کہو ریت میں مٹی زیادہ آرہی ہے۔ اینٹ والے کو تاکید کرو کہ کچی اور ٹیڑھی اینٹیں نہ بھیجے۔ یہاں تک بھی خیر ٹھیک تھا۔ لیکن بعد میں یہ ہدایتیں نئی شکلیں اختیار کرنے لگیں۔ ایک مزدور میرا کھانا لینے گیا ہے دوسرے کے پیٹ میں درد ہے ذرا اینٹوں کی ترائی کر دیجئے، اور آٹھ آٹھ اینٹوں کی ڈھیریاں میرے دائیں ہاتھ کی طرف چن دیجئے۔ یا فلاں بیلدار آج غچہ دے گیا ہے، ذرا سیمنٹ اٹھوا کر ریت میں ملوا دیجئے۔ یا چھوٹا مستری فلموں کا ازحد شوقین ہے اور آج نئی فلم کا پہلا شو دیکھنے گیا ہے، ذرا اینٹوں کے رَدّے رکھوا دیجئے۔ یوں سمجھئے کہ ایک مہینے میں ہم آدھے مستری بن چکے تھے اور مکان ابھی آدھا بھی نہیں بنا تھا۔

ہم نے مکان کی تعمیر میں تاخیر کی شکایت کی تو بگڑ کر کہا ''نقشے کے مطابق مکان بنوانا ہے تو اسی طرح بنے گا۔ جلد بازی میں کوئی چیز ٹیڑھی بن گئی تو کون ذمہ دار ہوگا؟'' ہم نے باہر کی ایک دیوار کے بارے میں کہا کہ وہ تو پہلے ہی ٹیڑھی بنی ہوئی ہے۔ اس پر مستری نے کمال خود اعتمادی سے کہا جناب دیوار ٹیڑھی نہیں آپ خود ٹیڑھے کھڑے ہیں اور گردن ٹیڑھی کر کے ٹیڑھا دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد موصوف نے ایک جھٹکے سے ہماری گردن اپنی دانست میں سیدھی کر کے دیکھنے کو کہا تو ہم سچ مچ گھبرا گئے کیونکہ اس پُر درد اور گردن شکن زاویہ سے دیکھ کر یوں لگا جیسے دیوار اررا کر ہمارے اوپر ہی گرنے والی ہے۔ لیکن ڈر کر وہاں سے فوراً ہٹنے کے بعد جب ہم نے فیتے سے ناپ کر دیکھنے کو کہا تو اچھی طرح پیائش کرنے اور انگلیوں پر جلدی جلدی کوئی حساب لگانے کے بعد اس نے صرف اتنا قبول کیا کہ دیوار ٹیڑھی نہیں البتہ کچھ ترچھی ضرور بن گئی ہے۔ جس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اوپر کی چھت کچھ اور چوڑی ہو جائے گی اور چھت پر جو کمرہ بنے گا اس میں آپ کپڑے رکھنے کی ایک فاضل الماری کھڑی کر سکیں گے۔ لہٰذا یہ غلطی نہیں بلکہ استادی ہے۔

ہم اگر چہ آدھے مستری ہو چکے تھے مگر ابھی اتنے ماہر نہیں تھے کہ اس کے حسن کاریگری کو ٹھیک سے سمجھ کر کوئی رائے دے سکتے، لہٰذا چپ رہے۔

آخر خدا خدا کر کے دو ماہ میں مکان پورا ہوا۔ اس دوران ہم دفتری کام سے کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر چلے گئے تھے۔ شہر سے واپس آ کر مستری اور اس کے مزدوروں کا حسب بے باق کرنے کے بعد ہم ذرا دور کھڑے ہو کر مکان کا نظارہ کرنے لگے۔ واقعی تلے اوپر تین کمرے بننے کے بعد وہ کچھ مکان سا ہی معلوم ہو رہا تھا۔ مگر جب اس میں داخل ہونے لگے تو پتہ چلا کہ داخلی دروازہ ہی غائب ہے۔ گھبرا کر مستری سے پوچھا ''اس میں داخلہ کیسے ہوگا؟''

اس نے جھٹ لکڑی کی ایک سیڑھی کھڑکی پر ٹکا دی اور کورنش بجانے کے انداز میں جھک کر بولا۔ ''آیئے تشریف لایئے!''

سیڑھی پر چڑھ کر ہم بحالت رکوع اندر داخل ہوئے۔ وہاں سے اوپر جانے کا راستہ پوچھا تو مستری نے ایک اور سیڑھی اُس چوکور سوراخ پر لگا دی جسے ہم روشن دان سمجھے تھے۔ اُس سے ایک پختہ زینہ منسلک تھا جو اوپر کے کمرے میں کھلتا تھا۔ زینے کے ہر پائدان پر سجدہ کرتے ہوئے ہم اوپر پہونچے اور پھر اسی طرح رکوع اور سجدے کرتے ہوئے ہم نے پورے مکان کی سیر کی۔ تب جا کر بڑی مشکل سے مکان کا جغرافیہ سمجھ میں آیا۔

جسے ہم اپنی دانست میں غسل خانہ سمجھے تھے وہ بیڈ روم نکلا۔ جو ٹائلٹ دکھائی دیتا تھا وہ اصل میں کچن تھا۔ اور جو شرطیہ طور پر ایک گودام تھا اُس کے بارے میں مستری نے قسمیں کھا کھا کر

www.taemeernews.com

پبلک اسکول

پبلک اسکول، پبلک کے ذریعے چلنے والے پبلک کے وہ اسکول ہوتے ہیں، جو پبلک کے لئے نہیں ہوتے۔ یہ خاص اسکول ہوتے ہیں جو خاص پبلک کے لئے خاص طور پر مخصوص ہوتے ہیں۔ عام پبلک یعنی ہما شما کے لئے عام اسکول ہوتے ہیں جو میونسپل کارپوریشن کھولتی ہے۔ (ہما شما سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی ذہنی نشو ونما ہما اور شمع جیسے رسائل پڑھنے سے ہوئی ہو)

بنیادی فرق ہر دو اسکول میں یہ ہوتا ہے کہ پبلک اسکول میں تعلیم پر کم اور تعلیم دینے کے جدید طریقوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ جبکہ کارپوریشن کے اسکولوں میں دونوں میں سے کسی چیز پر زور نہیں دیا جاتا۔

ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ پبلک اسکول میں بچوں کی فیس زیادہ اور ٹیچر کی تنخواہ کم ہوتی ہے۔ جبکہ میونسپل اسکول میں بچوں کی فیس بہت کم اور ٹیچروں کی تنخواہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اتنی زیادہ کہ بے چارے بڑی مشکل سے خرچ کر پاتے ہیں اور کبھی کبھی تو ایک مہینے کی تنخواہ خرچ نہیں ہو پاتی کہ دوسرا مہینہ آ جاتا ہے۔

کچھ اور چھوٹے موٹے فرق بھی ہیں۔ مثلاً ایک فرق یہ ہے کہ پبلک اسکول کے بچے اسکول کی بس یا اپنی کار میں آتے جاتے ہیں۔ جبکہ میونسپل اسکول میں بلا تفریق مذہب وملت، ہر بچے کو پیدل آنے کی اجازت اور سہولت رہتی ہے۔ چاہے اس کا گھر اسکول سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو! (تعلیم بالغاں، بقلم خود)

خواتین

پچھلے دنوں آپ کے اس کالم نگار کو اردو خواتین کے ایک ادبی اجتماع میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ خواتین شروع سے فدوی کی کم زوری رہی ہیں۔ چنانچہ سب سے زیادہ میں ان ہی سے ڈرتا ہوں۔ اچھی خواتین مجھے اتنی اچھی لگتی ہیں کہ ان کے سامنے آتے ہی خود بخود دل میں ایک نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بری خواتین تو جناب میں نے آج تک دیکھی ہی نہیں۔ بلکہ کبھی کبھی میں سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہوں کہ دنیا کی کوئی بھی خاتون بری کیوں کر ہو سکتی ہے جب تک کہ آپ اس سے نکاح نہ فرما چکے ہوں۔

(سیمینار میں ہاتھی)

انکشاف کیا کہ وہ ہمارا ڈرائنگ روم ہے۔

سب سے اوپر کی چھت پر دو فٹ چوڑا ایک پلیٹ فارم نما چھجہ بڑے خطرناک ڈھنگ سے باہر کو نکلا ہوا تھا، جس پر کوئی روک نہیں تھی اور ذرا سی بے احتیاطی وہاں کھڑے ہونے والے کو فلم 'تیسری منزل' کا پہلا سین دکھا سکتی تھی۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا یہ کیا ہے، تو فرمایا، کبھی گھر میں کسی کا پتنگ اڑانے کو جی چاہے تو یہاں آ کر شوق پورا کر سکتا ہے۔

ہم اس شوق کے یقینی انجام سے لرزتے کانپتے اُس عظیم الشان بھول بھلیاں سے باہر آ گئے، اور خود کو بقید حیات پا کر اطمینان کا سانس لینے لگے۔ مستری نے یہ حالت دیکھ کر ہمدردی سے ہمارا شانہ تھپتھپایا اور بولا۔ ''صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ کچھ دن رہو گے تو آہستہ آہستہ مکان کی عادت پڑ جائے گی۔ سب یاد ہو جائے گا کہ کچن کون سا ہے اور باتھ روم کدھر ہے۔ اور اگر خدانخواستہ مکان کے مطابق اپنی یادداشت کو نہ ڈھال سکو تو یادداشت کے مطابق مکان کو ڈھال لو۔''

''وہ کیسے؟'' ہم نے حیرت سے پوچھا۔

مستری نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور ایک زوردار کش لینے کے بعد بولا۔ ''وہ ایسے کہ جس چیز کو غلطی سے جو سمجھتے ہو وہی سمجھتے رہو۔ مثلاً کچن میں بستر بچھا لو، باتھ روم میں کھانا بنانا شروع کر دو، ٹائلٹ میں...''

ہم نے فوراً کانوں پر ہاتھ رکھ لئے کہ اس سے آگے سننے کی تاب ہم میں نہیں تھی۔

☆......☆......☆

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

مہنگائی کی ایف آئی آر

زندگی سے میں اتنا تنگ آ چکا تھا کہ ایک دن سیدھا علاقے کے پولس تھانے پہونچ گیا۔ جیسے ہی تھانے میں داخل ہوا ایک شخص نے جو اپنی مونچھوں اور باقی شکل سے پکا بدمعاش لگتا تھا، مجھے روک لیا اور بڑے گستاخانہ لہجے میں بولا۔

''اوئے! منھ اٹھائے کہاں جارہے ہو؟''

پتہ چلا وہ پولس والا تھا اور سیدھا باتھ روم سے آرہا تھا، اس لئے وردی میں نہیں تھا اور اسی لئے میں نے اسے بدمعاش سمجھ لیا تھا۔ پولس والے کو میں نے بتایا کہ مجھے تھانیدار صاحب سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ اس پر اس نے تھانیدار کے کمرے کے باہر بیٹھے ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا، پہلے داروغہ صاحب سے ملو۔

داروغہ کو جس کی وردی پر 'ڈیوٹی آفیسر' کا بلا لگا ہوا تھا، میں نے سلام کیا ہی تھا کہ ایک ساتھ کئی سوال مجھ پر داغ دئے گئے۔ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ کس سے ملنا ہے؟ کس نے مارا ہے؟ کوئی ضمانتی ساتھ لائے ہو؟ اور ایک بار پھر یہ کہ کون ہو؟

میں نے دست بستہ کہا۔ جناب میں عوام ہوں، اپنے گھر سے آیا ہوں، مجھے مہنگائی نے مارا ہے، اور میرا کوئی ضمانتی نہیں ہے اور مکرر عرض ہے کہ میں عوام ہوں، صرف عوام ہوں اور عوام کے سوا کچھ نہیں ہوں۔

داروغہ پر اس جواب کا گہرا اثر ہوا اور وہ کافی مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے سر ہلا کر تھانیدار سے ملنے کی اجازت دے دی۔

تھانیدار کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ کچھے اور بنیان میں کرسی پر بیٹھا کسی اردلی سے مالش کرا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی تھانیدار نے اردلی کو باہر بھیج دیا اور دیوار پر ٹنگی ہوئی خاکی قمیص پہن کر بولا ''کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں جناب؟''

تھانیدار کو میں نے مہنگائی کی مار کے بارے میں بتایا اور حکومت کے اس بیان کا بھی ذکر کیا جس میں اس نے کہا تھا کہ مہنگائی میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میں نے کہا: میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ مہنگائی کا قصوروار کون ہے اور اسے ابھی تک پکڑا کیوں نہیں گیا ہے۔

سوال سن کر تھانیدار کے ماتھے پر فکر کی گہری لکیریں ابھر آئیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا ''آپ نے یہ نہیں بتایا کہ واردات کس جگہ ہوئی ہے؟''

یہ سوال سن کر میں چکرا گیا۔ تاہم تھانیدار نے میری ہمت بڑھائی۔ کہنے لگا، ''چکرایئے نہیں۔ یہ ایک تکنیکی اور اہم سوال ہے یہ جانے بغیر کہ واردات کس جگہ ہوئی ہے قانون آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اچھی طرح سوچ کر بتایئے کہ یہ مہنگائی ماذر... کس جگہ مارا ماری کر رہی ہے؟''

میں نے کہا۔'' ضرورت کی چیزیں کہاں مہنگی نہیں ہیں تھانیدار صاحب۔ مہنگائی کی مار ہر جگہ پڑ رہی ہے۔ پورے شہر میں، بلکہ شہر سے باہر بھی...''

''بس بس اتنا کافی ہے۔ اب آپ خاموش رہئے۔ یہ کیس میرے علاقے کا نہیں ہے۔'' تھانیدار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں۔

''مطلب یہ کہ میری حد صرف ریلوے پھاٹک سے لے کر

www.taemeernews.com

گندے نالے تک ہے۔اس کے آگے دوسرا تھانہ لگتا ہے۔ویسے آپ کی بتائی ہوئی واردات چوں کہ کئی علاقوں کی معلوم ہوتی ہے اس لئے میری رائے ہے کہ آپ اے سی پی یا ڈی سی پی صاحب سے شکائت کریں۔ان کے علاقے مجھ سے بڑے ہیں۔ اچھا،اس وقت ذرا میں جلدی میں ہوں،اور نالے کے پاس ایک بستی میں چاقو چلنے کی اطلاع ہے اس لئے مجھے فوراً جانا ہوگا،اس لئے نمسکار!''

یہ کہہ کر تھانیدار نے قمیص اتار دی اور اسے واپس کھونٹی پر ٹانگ کر دوبارہ اردلی کو مالش کے لئے بلا لیا۔

میں مایوس سے باہر آ گیا۔ مگر پھر میں نے خود ہی اپنی ہمت بڑھائی اور طے کر لیا کہ اب یہ راز جان کر ہی رہوں گا کہ اس کمر توڑ مہنگائی کے پیچھے آخر کس کا ہاتھ ہے؟

اصولاً مجھے پہلے اے سی پی سے ملنا چاہئے تھا مگر وقت بچانے کے لئے میں سیدھا ڈی سی پی کے یہاں جا پہونچا۔ڈی سی پی نے میری پوری بات سننے کے بعد کہا۔''ویسے تو مجھے اس معاملے میں بولنا نہیں چاہئے ،کیونکہ یہ کیس قابلِ دست اندازیِ پولس نہیں ہے۔لیکن مہنگائی کے پیچھے چونکہ کسی ممکنہ سازش کا پہلو بھی نکل سکتا ہے،اور آپ صورت سے بظاہر شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں اس لئے میں مشورہ دوں گا کہ اس سلسلے میں اعلیٰ سطح پر مشورہ کر لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ہاں اگر کسی نے کسی کو مارا پیٹا ہو اور علاقہ کی پولس نے غلطی سے مضروب کو پکڑ لیا ہو اور وہ یعنی مضروب آپ کا جاننے والا ہو تو میں اسے چھڑانے میں آف دی ریکارڈ آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔بس اتنا بتا دیجئے کہ مضروب سے آپ کا کیا رشتہ ہے تاکہ یہ بات پولس ریکارڈ میں آ جائے۔''

مایوس ہو کر میں نے ڈی سی پی سے بھی رخصت لی،اور پولس ہیڈ کوارٹر کا راستہ پکڑ لیا۔جیسے ہی میری پرچی اندر گئی پولس کمشنر نے فوراً مجھے اپنے چیمبر میں بلا لیا۔میں نے مختصر لفظوں میں اپنی شکائت بیان کر دی۔ساری بات سن کر پولس کمشنر بولے۔''آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔میری اطلاع کے مطابق تو موجودہ حکومت کے دور میں مہنگائی بڑھی نہیں گھٹ گئی ہے۔''

''وہ کیسے؟''میں کمشنر کے بیان پر حیران تھا۔

''دیکھئے، تین سال پہلے ہماری حکومت میں پیاز چالیس روپے کلو ل رہی تھی۔مگر ہماری لائق حکومت نے اسے بیس روپے فی کلو تک گرا دیا ہے۔آلو تیس چالیس کی بجائے دس پندرہ روپے کلو ملنے لگا ہے۔نمک ساٹھ ستر روپے کلو تک جا پہونچا تھا مگر اب دس روپے کلو ہے۔اور آپ کہتے ہیں مہنگائی بڑھ گئی ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''میں درد سے چیخ اٹھا۔''جناب عالی چالیس روپے سے پہلے پیاز چار پانچ روپے کلو ملتی تھی۔آلو بھی اسی بھاؤ دستیاب تھا۔اور نمک تو دو روپے کلو سے اوپر کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ذرا اس حساب سے دیکھئے۔پہلے آپ کی حکومت چیزوں کے دام پچاس روپے کلو بڑھواتی ہے پھر اس میں سے بیس پچیس روپے کم کرا دیتی ہے۔اور کہتی ہے کہ ہم نے مہنگائی گھٹا دی ایک مرتبہ آپ نے رسوئی گیس کے سلنڈر پر اسی روپے بڑھائے۔پھر جب لوگ چیخنے لگے تو اس میں سے تیس روپے کم کر کے کہہ دیا ہم غریبوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔یہ تو سراسر ظلم ہے زیادتی ہے۔آپ میری طرف سے وزیر اعظم کے خلاف ایف آئی آر درج کیجئے۔''

مگر میرے احتجاج کا پولس کمشنر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''معاف کیجئے ،آپ حکومت کے خلاف ایف آئی آر نہیں لکھوا سکتے۔''اس نے قطعیت کے ساتھ کہا۔

''کیوں نہیں لکھوا سکتا۔کیا میں اس ملک کا قانونی شہری نہیں۔ضابطۂ فوجداری کے تحت مجھے حق ہے کہ اگر کسی سے تکلیف پہونچی ہو تو میں اس کے خلاف قریبی تھانے جا کر شکائت درج کرا سکتا ہوں۔آئین مجھے اس حق کی ضمانت دیتا ہے۔''میں نے دلیل دی۔

''مگر قانون ہمیں بھی کچھ حق دیتا ہے۔''کمشنر نے آنکھیں

www.taemeernews.com

نکال کر کہا: ''تم نے ابھی ابھی میرے سامنے بیان دیا ہے کہ مہنگائی بڑھ رہی ہے جب کہ اشیائے صارفین کی قیمتوں اور افراطِ زر کے اشاریوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مہنگائی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ اس لئے مجھے اس بیان سے افواہ کی بو آرہی ہے۔ اور شائد تم نہیں جانتے کہ پنجاب سیکیورٹی ایکٹ کے تحت جو کہ دہلی میں بھی لاگو ہوتا ہے، افواہ پھیلانے والے کو گرفتار کر کے تین سال قید با مشقت کی سزا دی جاسکتی ہے...''

اس گفتگو کے چند گھنٹوں بعد میں آدھی کچی اور آدھی جلی ہوئی روٹی کے لقمے، پیاز، آلو، نمک اور تیل کے بغیر بنی ہوئی ترکاری میں ڈبو کر کھا رہا تھا۔ جو مجھے اس لئے اچھی نہیں لگ رہی تھی کہ میں اسے تہاڑ جیل میں نہیں بلکہ ایک سستے سے ڈھابے کی کھلی فضا میں بیٹھ کر کھا رہا تھا۔ تبھی میز کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے شخص نے جو غالباً ابھی ابھی جیل سے چھوٹ کر آیا تھا، غصے میں اپنی تھالی پٹخ دی اور چیخ کر بولا ''لعنت ہے! اس سے اچھا کھانا تو مجھے جیل میں مل رہا تھا۔''

کھانے کا سارا مزا کرکرا ہو گیا۔ شدت سے جی چاہا کہ اسی وقت نزدیکی تھانے کے سامنے جا کر کوئی افواہ پھیلا دوں اور جیل چلا جاؤں۔ یہ ایسا خیال تھا جس سے میرے منھ میں پانی آگیا۔

☆

یادداشت

یادداشت خراب ہونے کے کئی فائدے اور کئی نقصانات ہیں جن کا ذکر ہم پھر کسی مضمون میں کریں گے بشرطیکہ یاد رہا۔ فی الحال یہ سن لیجئے کہ ایک مرتبہ ہمیں صبح کے اخبار میں کچھ جانی پہچانی خبریں پڑھ کر شبہ ہوا کہ ہو نہ ہو ہم اونگھ چکے ہیں اور تھوڑی دیر پہلے پڑھی ہوئی خبروں کو بھول سے کل کی پڑھی ہوئی خبریں سمجھ رہے ہیں۔ مگر سامنے دیکھا تو دودھ کا گلاس بھرا ہوا رکھا تھا! آخر جب چھان بین کی تو پتہ چلا کہ وہ واقعی کل کی خبریں تھیں۔ بلکہ کچھ تو پرسوں کی بھی تھیں۔ مثلاً کئی کالونیوں میں بجلی نہیں تھی۔ راشن میں گھٹیا چاول پایا گیا۔ لوکل بس سے ٹکرانے پر سائیکل سوار ہلاک۔ فلاں پارٹی کے لیڈر نے اپنے بیان کی تردید کردی۔ اسمبلی میں ہنگامہ۔ پارلیمنٹ کی کارروائی ٹھپ۔

اس روز ہمیں اندازہ ہوا کہ اکیلے ہماری ہی یادداشت خراب نہیں۔ واقعات اور حالات کو بھی بھولنے کی بیماری ہے اور وہ اکثر بھول سے خود کو دوہراتے رہتے ہیں!

(بھولنے کی بیماری، نمی دانم)

کباڑی ذہنیت

کباڑی کے فلسفے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا کی ہر شئے کباڑ ہے۔ چنانچہ کباڑی دنیا کی ہر چیز اسی طرح بیچ دیتا ہے جس طرح حبیب پینٹر قوال نے اپنی قوالی کے ایک پرانے ریکارڈ میں بیچ دی تھیں۔ ہم نے زندگی میں آج تک کسی کو ساڑھے تین منٹ میں اتنی ساری چیزیں بیچتے نہیں سنا۔

دہلی کے مقبرۂ ہمایوں، مہرولی کی قطب مینار اور آگرے کے تاج محل کے حسن کی ماہرینِ فنِ تعمیر خواہ کتنی ہی تعریف کیوں نہ کریں لیکن کباڑی کی نظر سے دیکھیں تو وہ پرانے سنگِ سرخ اور سنگِ مرمر کے انبار سے زیادہ کچھ نہیں جن کا زیادہ بہتر مصرف یہ تھا کہ انہیں توڑ پھوڑ کر بجری یا ماربل بنا لیا جاتا۔ کم از کم گھروں کے فرش اور کچن کے سلیب بنانے میں تو کام آتے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر نے تاج محل کو اسی کباڑی نظر سے دیکھ کر اس کی نیلامی لگوادی تھی۔ وہ تو لندن کے ہاؤس آف لارڈز میں اس پر ہنگامہ مچ گیا، ورنہ آج پتہ نہیں کتنے لوگ تاج محل پر تلا ہوا بیف اسٹیک اُڑا رہے ہوتے اور نامعلوم کتنی لیڈیاں قطب مینار کے اوپر رقص کناں ہوتیں۔

(کباڑی بازار کی سیر، نمی سانم)

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

طلسمی انگوٹھی!

آپ نے طلسمی انگوٹھی کے بارے میں سنا ہوگا کہ اس کے پہننے سے دل کی ہر مراد پوری ہو جاتی ہے۔

اسی طرح سرمہ سلیمانی کے بارے میں بھی جانتے ہوں گے کہ اُسے آنکھ میں لگانے سے اندھے بھی پٹ پٹ دیکھنے لگتے ہیں اور زمین میں گڑے دفینے تک نظر آ جاتے ہیں۔

ایسے ہی طلسمی تعویز ہوتا ہے جو بے حد مفید چیز ہے اور جس کی مدد سے موکل اور محبوبہ قبضے میں کئے جاسکتے ہیں۔

یہ سب چیزیں آپ پرانی دہلی سے شائع والے کسی دینی یا فلمی رسالے کو خط لکھ کر بذریعہ وی پی منگوا سکتے ہیں (نوٹ: تینوں چیزیں ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ معاف کر دیا جاتا ہے)۔

مگر آپ جانتے ہیں کہ نقال ہر جگہ بھرے پڑے ہیں۔ اس لئے رسائل و جرائد کے ذریعے دستیاب ہونے والی ان طلسمی اشیا کی گارنٹی دینا اس مضمون میں مشکل ہے۔ اکثر دھوکا ہو جاتا ہے، جیسے خادم کے ساتھ ہو چکا ہے۔

ہوا یہ کہ میں ایک مرتبہ زندگی سے تنگ آ گیا۔ اب زندگی سے تو کبھی نہ کبھی سب ہی تنگ آ جاتے ہیں۔ عام طور سے دوسروں کی زندگی سے۔ کسی خاص شخص کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ ممبئی جائیے۔ وہاں لوگ ٹھاکرے حضرات سے تنگ ہیں۔ گجرات جائیے۔ وہاں ایک ہی آدمی (؟) ایسا ڈٹ کر بیٹھا ہوا ہے کہ پوری قوم کا ناک میں دم ہے۔

مگر میں اُس وقت خود اپنی ہی زندگی سے تنگ آ گیا تھا۔ ویسے سچ کہوں؟ اپنی زندگی سے میں آج بھی تنگ ہوں۔ بلکہ اب تو مجھے زندگی سے تنگ آجانے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ بہر حال تب میں زندگی سے نیا نیا تنگ آیا تھا اور مجھے پکا شبہ تھا کہ یہ سب میری اپنی حرکتوں کا نتیجہ نہیں بلکہ اوپری ہواؤں کا اثر ہے۔

اتفاق سے شہر میں کوئی جھاڑ پھونک والا حکیم بھی نہیں تھا جو اوپری ہواؤں سے لڑنا جانتا ہو۔ اور اگر کوئی تھا تو میں اسے نہیں جانتا تھا۔ قریب کے محلّے میں سفلی علاج والے ایک حکیم ریاض صاحب تھے بھی تو ان کی جھاڑ پھونک کا طریقہ بڑا ہی ہولناک اور خوف ناک تھا اور مشہور بھی وہ تھے سانپوں والے ڈاکٹر کے نام سے۔ مریض کو وہ سر پر پانی ڈال کر نیم کے پتوں کی ٹہنیوں سے اتنی بری طرح مارتے تھے کہ کبھی کبھی خود ان کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ اس پر ستم یہ کہ موصوف نزلہ زکام، کھانسی بخار، اور سر درد پیٹ درد کا علاج بھی اکثر اُسی طریقے سے کرانے پر زور دیتے تھے جو انہوں نے سانپ کے زہر کا اثر اتارنے کے لئے بذاتِ خود ایجاد کیا تھا اور جس کے جملہ حقوق قطعی محفوظ نہیں تھے، بلکہ خاصے مہلک تھے۔

بنگالی باباؤں کا بھی ان دنوں اتنا زور نہیں تھا جیسا آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔ پھر اُس زمانے کے بنگالی بابا نہ تو کچھ خاص پڑھے لکھے ہوتے تھے اور نہ ہی ان کے سفلی علم میں کوئی جان تھی۔ آج کل کے بنگالی بابا پھر بھی آٹھویں تک تو پڑھ ہی چکے ہوتے ہیں۔ اور ان کا علم بھی اتنا ترقی کر گیا ہے کہ اکثر پریشانیوں کا شرطیہ علاج ہو جاتا ہے۔ کئی بنگالی باباؤں کے اشتہارات میں آپ یہ لکھا ہوا پائیں گے کہ، روٹھی ہوئی محبوبہ ایک ہفتے کے اندر قدموں میں نہ آن گرے، قابض کرایہ دار دو ہفتوں

www.taemeernews.com

میں مکان یا دوکان خالی کر کے نہ بھاگ کھڑا ہو اور برسوں سے چلنے والے مقدمے کا فیصلہ دو پیشیوں میں نہ ہو جائے تو بابا کی فیس مع ہرجانہ واپس۔فوراً مندرجہ ذیل موبائل نمبر پر رابطہ کریں۔

تو جناب، اس قسم کے گارنٹی شدہ علاج کرنے والے باباؤں کی سہولت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں نے سوچا کیوں نہ اپنی جملہ پریشانیوں سے نجات پانے کے لئے ایک طلسمی انگوٹھی منگوا لوں۔نہ حکیموں کا چکر نہ جھاڑ پھونک کا جھنجھٹ۔یہ سوچتے ہی گھر میں باقاعدگی سے آنے والے ایک دینی رسالے میں دیئے گئے پتے پر خط لکھا اور رسالے کی طلسمی انگوٹھی منگوا کر انگلی میں پہن لی۔

مگر صاحب جس دن سے انگوٹھی پہنی اُسی دن سے میرے ساتھ عجیب وغریب واقعات پیش آنے لگے۔

طلسمی انگوٹھی میں نے اس لئے خریدی تھی کہ میرے کچھ رُکے ہوئے کام پورے ہو جائیں۔مثلاً ایک تو یہ کہ مٹی کے تیل کا ڈپو الاٹ ہو جائے جس کے لئے تین سال سے فوڈ اینڈ سول سپلائی ڈپارٹمنٹ کے افسر کی خوشامد کی جارہی تھی۔دوسرے رسوئی گیس کا کنکشن مل جائے جس کی درخواست دیئے ہوئے چار برس بیت چکے تھے۔اور تیسرا یہ کہ پڑوسی کا ریڈیو ٹھیک ہو جائے جسے وہ اُس کی کان لیوا کھڑ کھڑ کے باوجود بیچ کی دیوار پر رکھ کر عین اس وقت بجایا کرتا تھا جب میں ابن صفی یا اظہار اثر کا کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہا ہوتا۔

لیکن جیسے ہی میں نے انگوٹھی پہنی اس نے الٹا اثر دکھانا شروع کر دیا۔فوڈ آفیسر کی ترقی ہوگئی اور اس کا تبادلہ کسٹم آفس میں ہونے کی وجہ سے تیل کے ڈپو کی فائل ٹھنڈے بستے میں پہونچ گئی۔گیس کمپنی کے افسر کی پچاس لاکھ روپے کی لاٹری نکل آئی اور اس نے نوکری چھوڑ کر ڈپارٹمنٹل اسٹور کھول لیا۔رہا پڑوسی تو اس کا ریڈیو ٹھیک ہو گیا اور وہ اسے پہلے سے دوگنے والیوم پر بجانے لگا۔

پے در پے یہ صدمے جھیلنے کے بعد میں رسالہ ہذا کے دفتر پہنچا اور ایڈیٹر صاحب سے عرض کی کہ جناب آپ نے جو طلسمی انگوٹھی ہمیں بیچی ہے اس میں مینوفیکچرنگ ڈفیکٹ ہے کیونکہ یہ بجائے ہمارے دوسروں کے دل کی مرادیں پوری کر رہی ہے۔لہٰذا تاجرانہ اصولوں کے تحت یا تو اس کا ریپلیسمنٹ دیجئے یا پھر ہماری رقم واپس کیجئے!

ایڈیٹر صاحب نے بڑی نخوت کے ساتھ پہلے مجھے، پھر انگوٹھی کو دیکھا اور پھر موٹے لینسوں والی ایک عینک لگا کر مجھے اور زیادہ گھورتے ہوئے بولے:''دیکھئے صاحب ہمارا اصول ہے کہ ایک بار خریدا ہوا مال نہ تو واپس لیتے ہیں نہ تبدیل کرتے ہیں۔پھر بھی چونکہ آپ دیکھنے میں غریب غربا معلوم ہوتے ہیں اس لئے صرف اتنا ہو سکتا ہے اس کی مرمت کرا دی جائے۔جو مولوی صاحب ہماری انگوٹھیوں پر دعائیں پڑھ کر دم کیا کرتے ہیں وہ دو تین روز کے لئے اپنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔واپسی پر اُن سے دوبارہ دم کرا دیا جائے گا۔یہ منظور ہو تو انگوٹھی چھوڑ جایئے اور اگلے ہفتے آ کر لے لیجئے۔''

میں جو اُن کی عینک سے پہلے ہی سہما ہوا تھا،شکریئے کے ساتھ انگوٹھی وہیں چھوڑ آیا۔

اگلے روز میری حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا۔تین خبریں ایک ساتھ ملیں۔پہلی یہ کہ نئے فوڈ آفیسر نے میری درخواست منظور کر لی تھی۔دوسری یہ کہ گیس کا کنکشن آ گیا تھا۔اور تیسری یہ کہ پڑوسی کا ریڈیو گر کر ٹوٹ گیا تھا۔

یہ انگوٹھی پہننے کا کرشمہ تھا یا اسے اُتارنے کا نتیجہ۔ میں آج تک نہیں سمجھ پایا ہوں۔۔

☆

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

اردو کے ادبی معمے!

اردو زبان و ادب کی جتنی خدمت ادبی معموں نے کی ہے اتنی ہمارے خیال سے کسی نے بھی نہیں کی ہوگی۔ یہاں معموں سے ہماری مراد وہ چلتی پھرتی محترم شخصیتیں ہرگز نہیں ہیں جن کے نام کے ساتھ پروفیسر یا ڈاکٹر کا لاحقہ جڑا رہتا ہے اور جنہوں نے جدیدیت، مابعد جدیدیت اور ساختیات و پس ساختیات کے چکر میں ڈال کر خود اردو ادب کو ایک معمہ بنا ڈالا ہے (نوٹ: یہاں لفظ 'لاحقہ' کو 'کا' سے الگ رکھ کر پڑھیں ورنہ پتہ نہیں اس سے کیا مطلب نکل آئے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایسا لاحقہ کسی پروفیسر یا ڈاکٹر کی عرفیت یا چڑ ہو اور وہ خواہ مخواہ آپ سے ناراض ہو جائے۔)

ادبی معموں سے ہمارا اشارہ ان علامتی افسانوں اور جدید نثری نظموں کی طرف بھی قطعی نہیں جنہیں خواہ آپ اوپر سے نیچے کی طرف پڑھیں یا نیچے سے اوپر کی طرف، ان کے لطف و جاذبیت اور غیر معنویت میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا۔ بالکل ان آرٹ فلموں کی طرح جن کا کوئی بھی ریل غلطی سے شروع یا آخر میں پروجیکٹر پر چل جائے تب بھی فلم کی کہانی میں کوئی فرق نہیں آتا اور ناظرین فلم کے ہدایت کار کی اعلیٰ ذہانت اور موضوع پر اس کی گہری پکڑ سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ نثری نظم کے معاملے میں تو میاں عبدالقدوس ہمیں یہ عملی تجربہ کر کے بھی دکھا چکے ہیں کہ ایک نثری نظم کو انہوں نے متعلقہ ادبی رسالے سے پھاڑ کر الگ کیا، بیچ سے قینچی چلا کر نظم کے دو ٹکڑے کئے اور اس طرح ایک شاہکار نثری نظم سے یکلخت دو شاہکار نثری نظمیں تخلیق کر ڈالیں۔ اس روز ہمیں قلم کے مقابلے میں قینچی کی عظمت و افادیت کا بھرپور اندازہ ہوا اور ہم نے جانا کہ حجاموں کے اس مفید آلے سے صرف تنقیدی کتابیں ہی تصنیف نہیں کی جاتیں بلکہ تخلیقی ادب بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

نثری نظم سے میاں عبدالقدوس کو خدا واسطے کا بیر ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ شاعری کی یہ اعلیٰ صنف ان کی چڑ بن چکی ہے۔ تنقیدی سیمیناروں میں بھی صرف اس لئے شرکت نہیں کرتے کہ بعض اوقات انہیں نقادوں کی تقریروں پر نثری نظم کا شبہ ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں انہوں نے نثری نظمیں سن لیں تو رہا نہیں گیا۔ مشاعرہ ختم ہوتے ہی اسٹیج کے پیچھے گئے اور شاعر کو دبوچ لیا۔ پہلے تو ہاتھ ملا اور ہلا ہلا کر خوب اس کی نظموں کی تعریف کی، پھر بولے...

''معاف کیجئے آپ کی نظموں میں ذرا سا عیب ہے۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ ہوسکے تو نظم کہنے کے بعد کسی استاد سے اصلاح لے لیا کریں''۔ یہ سنتے ہی شاعر کا چہرہ فق ہو گیا۔

''کک کک کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آج آپ نے جو نثری نظمیں پڑھیں ان میں کئی مصرعے پوری طرح بحر اور وزن میں تھے۔ میرے خیال سے نثری شاعری میں عروض کی ایسی غلطیاں نہیں ہونی چاہئیں۔'' کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سن کر شاعر کا چہرہ اور بھی فق، بلکہ فق فق ہو گیا۔

سچ پوچھئے تو ان پراسرار اور قابل ناتشریح نظموں اور افسانوں کی بدولت ہی ہمارے ادب کی شان برقرار ہے۔ ادب کی تعریف بھی فی زمانہ یہی ہے کہ جو زیادہ سمجھ میں نہ آئے وہ ادب ہے اور جو بالکل سمجھ میں نہ آئے وہ اعلیٰ ادب۔ دراصل ہمارا مقصد اُن ادبی معموں کی خدمات پر روشنی ڈالنا ہے جنہیں حل کرنے پر خطیر رقم بطور انعام ملا کرتی تھی، اور جن کا گزشتہ صدی کے آخری برسوں تک اردو دنیا میں اچھا خاصا رواج تھا۔

بعض ناقدین کہتے ہیں کہ ادبی معمے لوگوں نے اردو کی نہیں بلکہ خود اپنی خدمت کے لئے جاری کئے تھے۔ ہوسکتا ہے یہ بات درست ہو۔ لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس سے بالواسطہ اور بادل

www.taemeernews.com

ناخواستہ طور پر ہی سہی اردو زبان اور اردو ادب کی بھی اچھی خاصی خدمت ہوگئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دہلی میں انصاری روڈ سے لے کر آصف علی روڈ تک پھیلے ہوئے معمہ سازوں نے ان معموں کی بدولت کئی کوٹھیاں اور کاریں کھڑی کرلیں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ معمہ بازوں نے جس جوش و خروش سے معموں کو حل کرنے میں دلچسپی لی اس سے یہ کاروبار ایک اچھی خاصی اردو صنعت میں تبدیل ہوگیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اردو کی صنعتیں استاد شاہ نصیر کے دیوان اور عروض کی کتابوں میں ہی ملا کرتی تھیں۔

اس کے علاوہ ہم سوچتے ہیں اور سوچ کر کافی دیر لرزتے ہیں کہ معمہ بازوں نے اپنا جو قیمتی وقت ان معموں کے اشاروں پر بحث کرنے اور ان کے خاکے بھرنے میں صرف کیا وہ خدانخواستہ ادب کی تخلیق میں لگ گیا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ پتہ نہیں کتنے نثری شاعر اور علامتی افسانہ نگار اور پیدا ہوگئے ہوتے۔ چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ لاٹری اور شیر بازار کے دور میں اگرچہ یہ صنعت ماضی کی داستان بن چکی ہے لیکن جو بھی خدمت اس نے انجام دی ہے اس کی تاریخ اردو کا مستقبل یقیناً تحریر کرے گا۔

ہمیں یاد ہے کہ ساٹھ ستر کے عشرے میں جب ادبی معموں کی صنعت شباب پر تھی تو ملک کے مختلف حصوں سے مشہور ادبی معموں کے اشاروں کی تفسیریں اور ان پر بحثیں لکھنے والے سینکڑوں اردو رسالے شائع ہوا کرتے تھے۔ معموں کے خاکے بھرنے اور انہیں آخری تاریخ سے پہلے جمع کرانے، پوسٹل آرڈر اور معموں کے ٹوکن خریدنے بیچنے یا بلیک کرنے کے کام میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگ لگے ہوئے تھے اور اردو بیچ بیچ لوگوں کی روزی روٹی سے جڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

اس صورت حال سے معمہ باز ہی نہیں ہم جیسے ادب سے بے بہرہ لوگ بھی فائدے میں تھے جنہیں معمہ تو کیا روزگار دفتر کا فارم بھی ان دنوں ٹھیک سے بھرنا نہیں آتا تھا۔ معمہ بازوں کا یہ تھا کہ ہر مہینے تنخواہ کا ایک معقول حصہ برباد کرنے کا موقع مفت میں ہاتھ آجاتا تھا اور ہمیں معموں کے ٹوکنوں کی بدولت چار پانچ روپے کی قیمت والے فلمی رسالے تین چار آنے میں مل جاتے تھے۔ اور خدا کے فضل سے اردو کے یہی فلمی رسالے تھے جنہوں نے آگے چل کر ہمارے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔

اصل میں ہوتا یہ تھا کہ معمہ کمپنی اپنے فلمی رسالے کی اشاعت بڑھانے کے لئے اس کے ہر شمارے میں چند ٹوکن چھاپ دیتی تھی اور معمے کے ہر ایک حل کے ساتھ ایک ٹوکن نتھی کرنا لازم ہوا کرتا تھا تاکہ معمے کے ساتھ رسالہ بھی چلتا رہے۔ لیکن معمے باز بھی بڑے کائیاں واقع ہوئے تھے۔ وہ پورا رسالہ خریدنے کے بجائے کم قیمت میں صرف ٹوکن خرید لیتے اور دکاندار باقی رسالہ الگ سے بیچ کر مزید منافع کما لیا کرتا۔ لیکن ظاہر ہے بازار اور منڈی کی اپنی ایک طاقت ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ انعام کی رقم کے ساتھ رسالے کے ٹوکن کی قیمت بھی یونی آئی کے شیئر کی طرح ہر مہینے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور ہمارے شہر کے معمہ بازوں کے سردار مانے جانے والے بھائی سعید جنرل اسٹور صاحب، راہ چلتے روک کر ہمیں بتادیا کرتے تھے کہ برخوردار اس مہینے رسالے کا سازہ یا نو نمبر صرف پچیس پیسے میں مل رہا ہے۔ سعید صاحب کے نام کے ساتھ جنرل اسٹور ہم نے اس لئے لکھا ہے کہ یہ لفظ کاروبار کی طرح ان کے نام کا بھی حصہ بن گیا تھا۔ اور جب تک کوئی ان کے نام میں جنرل اسٹور نہیں جوڑتا تھا تب تک پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کن سعید صاحب کا ذکر ہو رہا ہے۔ ویسے بھی علاقے میں کئی سعید صاحبان رہتے تھے جن میں سے کوئی جنرل اسٹور نہیں چلاتا تھا۔ اس لئے اندیشہ رہتا تھا کہ اگر جنرل اسٹور نام میں لگا کر نہ پکارا تو پتہ نہیں کس گھر سے کون سے سعید صاحب باہر نکل آئیں۔ بہرکیف قصہ یہ ہے کہ ٹوکن کی قیمت جتنی زیادہ بڑھ جاتی تھی اس کے بغیر رسالہ اتنا ہی سستا مل جاتا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک مرتبہ ٹوکن کی قیمت بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی کہ سعید جنرل اسٹور نے ہمیں بلایا اور ایک تازہ رسالہ تھما کر دو آنے ہمارے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ہم نے پوچھا یہ کیا، تو بولے کہ اس مرتبہ ٹوکن کی قیمت رسالے کی قیمت سے دو آنہ آگے نکل گئی ہے۔ ہم وہ دو آنے جیب میں رکھ کر سیدھے ہمالیہ بک ڈپو پہونچے اور خوشی کے مارے

www.taemeernews.com

ابن صفی اور کرشن چندر کے دو تازہ ناول کرائے پر لے آئے جو ان دنوں ایک آنہ روز میں پڑھنے کو ملتے تھے۔

افسوس آج کے جنرل اسٹوروں میں یہ کردار دیکھنے کو نہیں ملتا۔ آج آپ صابن بھی خریدنے جایئے تو جنرل اسٹور ہر ٹکیہ پر آٹھ آنے بڑھا کر ایک روپیہ زیادہ کاٹ لیتا ہے۔ اور حساب پوچھو تو کہتا ہے کہ پچھلے جمعے جو ٹکیہ آپ نے لی تھی وہ آٹھ آنے سستی تھی اس لئے ایک اٹھنی اس کی بھی کاٹ لی ہے۔ کہئے تو ایک اٹھنی اگلی ٹکیہ کی بھی کاٹ لوں جو آپ اگلے جمعے خریدنے آئیں گے۔

اس زمانے میں ادبی معمے اردو والوں کو اور بھی کئی خرافات سے دور رکھتے تھے۔ نہ انہیں اس کی فکر رہتی تھی کہ کس اردو اکادمی نے اس مرتبہ کس غیر مستحق ادیب کو ایوارڈ سے نوازا ہے اور نہ وہ اس بحث میں پڑتے تھے کہ مابعد جدیدیت اور ساختیات و پس ساختیات کی اولین دریافت کا سہرہ کس کے سر باندھا جائے۔ نیز یہ کہ جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت آئی ہے تو کیا اس اصول کے تحت مابعد جدیدیت کے بعد ما مابعد جدیدیت آئے گی؟ اور کیا سن ۲۱۵۵ تک آتے آتے اردو ادب میں ما ما ما ما ما مابعد جدیدیت پڑھی جا رہی ہوگی؟

اُن دنوں ہمارے شہروں وقصبوں کے ہوٹلوں اور چائے خانوں میں صرف یہ موضوع زیر بحث رہتے تھے کہ کتنے اشارے آؤٹ ہو چکے ہیں، کتنے اشاروں میں کمپائلر نے الجھانے کی کوشش کی ہے۔ فلاں اشارے میں نالہ بھرا جائے یا سالہ۔ فلاں اشارے میں مقدر کا سکندر ٹھیک رہے گا یا سکندر کا مقدر۔ یہ بحثیں دیر رات گئے تک جاری رہتیں اور اردو چائے خانے صبح کاذب تک آباد رہتے تھے۔

کہنے کو ہمارے چائے خانے اب بھی صبح کاذب تک آباد رہتے ہیں۔ مگر آج موضوع بحث ادبی معمہ نہیں ہوتا۔ آج کل لوگ اس بات پر لڑتے جھگڑتے اور منہ سے جھاگ نکالتے ہیں کہ مسجد کی جگہ مندر بھرا جائے یا کچھ اور۔

آج ہندستان کی تقریباً ہر دوسری ریاست میں ایک عدد اردو اکادمی موجود ہے۔ اور ان میں سے کئی نے تو یہ ضد پکڑ رکھی ہے کہ اردو کو ترقی دے کر ہی دم لیں گی۔ لوگ انہیں سمجھاتے ہیں کہ بس بھئی بہت ہوا۔ آزادی کے بعد سے اب تک ہم اردو کو ترقی ہی دیتے آرہے ہیں۔ اب اس سے زیادہ اور کیا ترقی دیں۔ علاوہ ازیں اردو بھی اپنی ترقی سے کافی تنگ آچکی ہے۔ خدا کیلئے اب تو باز آجائیں۔ مگر اکادمیاں مُصر ہیں کہ نہیں جی، ترقی تو ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اسے بھلا ہم کیسے چھوڑ دیں؟ اور پھر ابھی اردو کی اصلی ترقی ہوئی کہاں ہے۔ ابھی تو اس کے لئے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ سیمینار، مشاعرے، قوالیاں..... صرف ان سے کام نہیں چلنے کا! اسی طرح کے اور بہت سے کام کرنے ہوں گے۔ اگر آپ کے ذہن میں کچھ نئی قسم کے کام ہوں تو بتایئے تاکہ جلد از جلد اردو کو ترقی نصیب ہو سکے۔

ایسی اردو اکادمیوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ اب وہ ادبی معموں کے احیا کی طرف توجہ دیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہر اردو اکادمی اپنا ایک انعامی معمہ شروع کر دے۔ ذرا تصور کیجئے۔ ملک کی تمام اردو اکادمیوں نے انعامی معمے شروع کر رکھے ہیں۔ ہر شہر سے ان معموں کے اشاروں پر بحث چھاپنے والے رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ چائے خانوں، کافی ہاؤسوں، ہوٹلوں، بسوں اور ٹرینوں میں لوگ دائیں سے بائیں اور اوپر سے نیچے اشاروں کی بحث میں لگے ہوئے ہیں۔ اشارہ ہے:

...ل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بحث اس پر ہے کہ خالی جگہ میں کیا لفظ بھرنا چاہئے۔ عمل، خلل، ادل، بدل یا بی جے پی کا چناؤ نشان کمل یا پھر کچھ اور۔ ہر لفظ کی تائید میں طرح طرح کی دلیلیں اور تاویلیں دی جا رہی ہیں۔ تبھی ایک طرف سے فلک شگاف آواز آتی ہے۔

''مل گیا! مل گیا!''

لوگ بہ یک آواز پوچھتے ہیں۔ ''بھئی کیا مل گیا؟''

جواب آتا ہے۔ ''اشارے کا حل۔ ذرا غور سے سنئے...''

آنکھیں ابل آتی ہیں، کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

"صحیح لفظ ہے...حل!" محفل میں بھونچال آ جاتا ہے۔سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں۔ہر منہ سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔آواز کچھ کہتی سنائی دیتی ہے۔

"صاحبان،علامہ اقبال غلطی پر تھے۔حل ہی دراصل وہ عمل ہے جس سے آدمی کی زندگی جنت یا جہنم بن جایا کرتی ہے۔ذرا غور فرمائیے۔بے اولاد کو حمل کس قدر خوشی دیتا ہے اور کثیر الاولاد کے لئے کیسی زحمت بن جاتا ہے۔پھر دوسرے مصرعے میں ناری بھی ہے اور ناری ہندی میں عورت کو کہتے ہیں!" ظاہر ہے یہ آواز میاں عبدالقدوس کی یا انہی کی قبیل کے کسی معمہ باز کی ہوگی۔!

لیکن ضروری نہیں کہ اکادمیاں اپنے معموں میں اسی قسم کے اشارے شامل کریں جنھیں تھوڑی بہت محنت سے حل کیا جا سکتا ہو۔انہیں کچھ ایسے اشارے یا سوال معمے میں دینے ہوں گے جو لاکھ سر پٹخنے پر بھی حل ہونے میں نہ آئیں اور انعام کی رقم اکادمی والوں کے پاس ہی بچی رہے۔آخر ہمارا مقصد اردو کو ترقی دینا ہے۔انعام کی رقم یوں ہی چلی گئی تو اس سے تو اردو والوں کی ترقی ہو جائے گی جو ہرگز ہرگز ہمارا مقصد نہیں ہے۔

ہماری رائے میں معموں کے اشارے یا سوال نامے کچھ اس طرح کے ہونے چاہئیں...

اشارہ نمبر۱۔(دائیں سے بائیں) دلہن کے چلے جانے پر اُس کا.....بجھا بجھا سا رہنے لگا (دولہا/چولہا/حقہ)

اشارہ نمبر۲۔(بائیں سے دائیں) دادا ابا کی گھڑکی سے ان کے ہاتھوں کے.....اُڑ گئے (طوطے/توتے/پوتے)

اشارہ نمبر۳۔(اوپر سے نیچے) لوگ اسے.....کہتے تھے کیونکہ وہ بہرا بھی تھا اور کاہل بھی!(بے وقوف/ جاہل/ بہرا کاہل)

اشارہ نمبر۴۔(نیچے سے اوپر) اور پھر بڑے اداس لہجے میں اس نے یہ شعر پڑھا۔

کس کو فرصت ہے کہ کوئی داستانِ غم پڑھے
لاکھ تم اترا ہوا ..... لئے پھرتے رہو
(چہرا/سہرا/کرتا/کچھا)

اشارہ نمبر۵۔یہ شعر کس شاعر کا ہے؟ ذہن پر خوب زور دے کر بتائیے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے
(غالب/آتش/کسی کا نہیں)

اشارہ نمبر۶۔مندرجہ ذیل علامتی نظم میں شاعر کا روئے سخن کس کی طرف ہے؟

سفید چادر پہ بکھرے رنگوں کے درمیاں
وہ چمکتی آنکھیں
ستارے جیسے تلاش کرتے ہوں کہکشاں میں
شہاب ثاقب کی رہگذاریں
وہ اس کے انفاس کی حرارت
کہ جیسے بستر کی سلوٹوں میں لپیٹ لی ہو
کسی نے گزرے حسین لمحوں کی ہر شرارت
وہ اس کے ریشم سے بھی ملائم بدن کی خوشبو
کہ جیسے لوبان کا دھواں ہو
فضا میں قائم...
وہ آج کی شب پھر آ گئی ہے
خفیف قدموں سے میرے کمرے میں
حسب عادت!
(شاعر کی محبوبہ/شاعر کی پالتو بلی)

ہمیں امید ہے کہ اس نمونے کی طرز پر اور بھی بہت سے مفید ادبی معمے تیار کئے جا سکتے ہیں جنھیں جاری کر کے اردو اکادمیاں نہ صرف اردو زبان کو ترقی دے سکتی ہیں بلکہ اردو ادب کو بھی اس ادنیٰ مقام تک پہونچا سکتی ہیں جہاں وہ آج تک نہیں پہونچا ہے۔اس کے علاوہ یہ معمے چونکہ قریب قریب ناقابلِ حل ہوں گے اس لئے انعام کی رقم بھی بچی رہے گی جو اردو اکادمی اور اس کے ممبروں کے کام آئے گی۔لہٰذا اردو زبان و ادب کسی مقام تک نہ بھی پہونچے تو کیا مضائقہ ہے!

☆.....☆.....☆

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

قصہ پانچ درویش!

قارئین باتمکین! (واضح ہو ہم نے پورے نقطوں کے ساتھ تمکین لکھا ہے۔ کوئی صاحب نمکین نہ پڑھ لیں)

دراصل ہم لکھنا تو چاہتے تھے قصہ چار درویش، بلکہ چہار درویش، کیونکہ روایت اور دستور یہی ہے۔ لیکن جب لکھنے بیٹھے اور سارے درویشوں کی گنتی کی تو وہ پورے پانچ نکلے۔ پیدائشی مسلمان ہونے کی وجہ سے دوبارہ گنتی کی کہ شاید حساب میں غلطی ہوگئی ہو۔ ایک ایک درویش کو الگ الگ شمار کیا۔ مگر ہر دفعہ حاصل جمع پانچ آیا۔

پھر سوچا کہ دو درویشوں کے قصوں کو آپس میں ملا کر پانچ درویشوں کا قصہ چہار درویش لکھ دیں بلکہ اس ترکیب سے قصہ تین درویش لکھنے کا خیال بھی آیا، جو سننے میں اور زیادہ مختصر لگتا۔ مگر ہر دو صورت میں قصوں اور درویشوں کے باہم خلط ملط ہوجانے کا اندیشہ لاحق تھا۔ اس لئے مجبوراً 'قصہ پانچ درویش' ہی ہدیۂ ناظرین ہے۔

ایک بات اور۔ جن پانچ درویشوں کا یہ قصہ ہے، ان کی زندگیوں کے اکثر حالات ہمارے ملک کے پانچ سابق اور بزرگ وزیر اعظموں کے حالات سے کافی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ اس میں نہ ہمارے درویشوں کا کچھ قصور ہے نہ مصنف کا۔ غلطی ہے تو ان وزیر اعظموں کی کہ انہوں نے خود اپنی ذاتی زندگی کے حالات کیوں نہیں گزارے۔ ان کے کیوں گزارے جو ہمارے افسانوی درویشوں کی زندگی کے حالات واقعات، کردار اور مقامات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ کاش کتابوں کی طرح حالات زندگی کا بھی کاپی رائٹ ہوا کرتا۔ چنانچہ اس مطابقت کی تمام تر قانونی ذمہ داری ان بزرگوں کی ہے اور لائق مصنف کا (یعنی ہمارا) اس سے کوئی سروکار نہیں!

لیجئے اب قصہ ملاحظہ کیجئے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی جگہ ایک درویش رہتا تھا۔ یوں تو اس جگہ چار درویش اور بھی رہتے تھے مگر وہ ان سب سے الگ رہنے کا عادی تھا۔ اس لئے اس کا نام پانچواں درویش پڑ گیا۔ (حالانکہ ازروئے سینیارٹی اس کا نام پہلا درویش ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ ازروئے ترتیب اسے تیسرا درویش کہا جانا چاہئے تھا کیونکہ ...مگر خیر وہ دوسرا قصہ ہے اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔)

وہ اس قدر درویش صفت تھا کہ ہر وقت درویشی کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ دراصل وہ بچپن سے ہی درویش تھا۔ کہتے ہیں اسے تیرہ زبانیں بولنا، پندرہ لکھنا اور سترہ پڑھنا آتی تھیں۔ اکثر وہ ایک بات ایک زبان میں کہتا اور دوسری بات دوسری زبان میں کہہ جاتا۔ لوگ اس سے سوال کرتے ایک زبان میں اور وہ جواب دے دیتا کسی اور ہی زبان میں۔ کئی بار وہ ایک ساتھ اتنی زبانیں بول جاتا کہ لوگوں کو پتہ ہی نہ چلتا کہ کس زبان میں کیا کہہ گیا ہے بلکہ کئی مرتبہ تو وہ خود بھول جاتا کہ کس زبان میں کس سے کیا بات کہہ دی ہے۔ اپنی ان حرکتوں کی وجہ سے وہ بہت جلد انٹلیکچوئل مشہور ہوگیا۔ یہ شہرت اتنی بڑھی کہ جب بھی وہ کہیں سے گزرتا لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگتے۔ وہ دیکھو انٹلیکچوئل جارہا ہے اور بھگدڑ مچ جاتی۔ بعض لوگ ہڑبڑاہٹ میں اسے انٹل کیچوئل کہہ جاتے۔

ان دنوں، جیسا کہ عام دستور ہے، ملک میں ایک بادشاہ بھی

www.taemeernews.com

تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ بادشاہ تھی۔ کیونکہ اصل میں وہ ایک خاتون تھا! مگر یہ خاتون اس قدر مردانہ وار حکومت کرتی تھی کہ اس زمانے کے سارے مرد اس سے ڈرتے تھے۔ چنانچہ ہم اسے مذکر ہی لکھیں گے۔ ویسے بھی پرانے تذکروں میں حکومت عموماً مذکروں کی ہی ہوتی ہے۔

ایک بات اور۔ حالانکہ وہ آئینی طور پر ملک کی وزیر اعظم اور قانوناً بادشاہ کی ماتحت تھی مگر عملاً حکومت کی باگ ڈور کیا بلکہ مانجھا، پتنگ اور چرخی تک اس کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اس لئے اکثر مؤرخ سہواً اسے بادشاہ سمجھ لیتے ہیں اور ہمارے خیال سے صحیح بھی یہی ہے کیونکہ اس وزیر اعظم کا مزاج بڑا ہی شاہانہ تھا۔

بہر حال پھر یوں ہوا کہ اتفاق سے شہ مزاج وزیر اعظم نے زبان داں درویش کو ایک دن زبان دانی کرتے دیکھ لیا۔ وہ اس سے ایسا متاثر ہوا کہ جھٹ اسے اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا ، جو اس زمانے میں وزیر کابینہ کا رتبہ رکھتے تھے۔ وزیر بنتے ہی درویش نے پہلی عقل مندی یہ کی کہ فوراً زبان دانی بند کر کے ایک چائے دانی خرید لایا اور اس میں سرکاری نمک بھر کر اپنے آقا کا نمک خوار بن گیا۔

وزیر اعظم اس کی نمک خواری سے اتنا خوش ہوا کہ جب بھی الیکشن میں کامیاب ہوتا، اسے کابینہ کا درجہ دے کر مصاحب ضرور بناتا (واضح ہو، وزیر اعظم شاہی مزاج رکھنے کے ساتھ جمہوری مزاج بھی رکھتا تھا اور اکثر الیکشن کراتا رہتا تھا۔ حق مغفرت کرے۔ عجیب مزاج پایا تھا بندۂ خدا نے!)

درویش نے اپنی ساری زبانیں بند کر کے خود کو اتنا بے زبان بنا دیا تھا کہ وزیر اعظم اوروں سے چاہے جتنا محتاط رہے مگر اس کی طرف سے پورا مطمئن رہتا تھا۔ چنانچہ جب وزیر اعظم شاہ مزاج کے بعد اس کا بیٹا تخت نشیں ہوا تو اس نے بھی اسے منصب مصاحبی درجہ ٔوزیر کابینہ دے دیا (مزید واضح ہو اس ملک میں وزیر اعظم بھی تخت پر بیٹھا کرتا تھا اور وزیر اعظم کے بعد عموماً اس کا بیٹا وزیر اعظم بن جاتا تھا۔ حق مغفرت کرے۔ عجب آزاد ملک تھا!)

اس دوران یعنی دریں اثنا، پانچواں درویش پہلے سے زیادہ انٹلیکچوئل اور گنجا ہو چلا تھا۔ اس نے وزیروں کے ساتھ زبان دانی شروع کر دی۔ مختلف زبانوں میں بات کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیروں میں اختلاف پیدا ہو گئے۔ بلکہ ایک وزیر استعفیٰ باز (جو بعد کو درویش بن گیا اور جس کا ذکر بعد میں آنے گا) نے تو نئے وزیر اعظم کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا اور اس پر الزام لگایا کہ وہ ناجائز آمدنی اور نذرانوں کا شوقین ہے اور کئی بار اسے توپ خانہ کے توپچی کے ساتھ سنیما کی ٹکٹیں بلیک کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر توپوں کی خریداری میں نذرانے وصول کرنے کا بھی الزام لگا دیا۔

وزیر اعظم نے پہلے تو صفائی دی کہ اس نے کبھی ٹکٹوں کی بلیک تو کیا، وہائٹ بھی کبھی نہیں کی ہے۔ نیز یہ کہ نذرانے کیا، ابھی تو توپ بھی اس تک نہیں پہنچی ہے۔ مگر جب وزیر استعفیٰ باز اچھل کود کرتا ہی رہا تو اس نے غصہ میں آ کر بغاوت کا ڈنڈا چھین لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر کے ہاتھ میں صرف جھنڈا رہ گیا۔ یہ دیکھتے ہی وزیر استعفیٰ باز نے فوراً استعفیٰ دے دیا!

اس کے بعد:

''رکھا جانا سنگ بنیاد ایک جھگڑے کا۔ ہار جانا وزیر اعظم کی پارٹی کا بیچ الیکشن کے، مل جانا موقع تخت نشینی کا وزیر استعفیٰ باز کو، مستعفی ہو جانا اس کا بعد چند ماہ کے، ہونا الیکشن کا دوبارہ، لڑنا پھر الیکشن وزیر استعفیٰ باز کا، جس کے...''

معاف کیجئے ہم غلطی سے غلط درویش کا قصہ لے بیٹھے۔ لہٰذا فوراً اپنے پرانے، یعنی پانچویں درویش کی طرف واپس آتے ہیں اور اس کے قصہ مختصر کو یوں طول دیتے ہیں کہ:

بن جانا چند سال بعد وزیر اعظم اچانک پانچویں درویش کا عین اس وقت جب بعد آپریشن دل کے کہ اچاٹ تھا اس دنیا سے، کرنا حکومت اس کا الیکشن اگلے تک اور پھر چھن جانا سب راج کاج اس کے کا!

www.taemeernews.com

اس کے بعد پانچویں درویش کی ایک روز آنکھ کھلی تو اس نے اپنے تئیں ایک اندھے غار میں پایا جس کی دیوار پر جلی حروف میں تحریر تھا: غارِ گمنامی!

درویش نے یہ دیکھ کر سخت عبرت پکڑی اور رقت کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ اب اس نے نابینا غار، معاف کیجئے اندھے غار سے نکلنے کی سوچی اور دیوانہ وار ادھر ادھر گھومنے لگا۔ مگر غار سے نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا جو کہیں نظر نہ آتا تھا۔ راستے کی تلاش میں ایک بار وہ ایک گہرے کھڈ میں جا گرا۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو وہاں "قعرِ مذلت" لکھا پایا۔ یہ دیکھ کر درویش نے اپنا سر پیٹ لیا اور اس پر پہلے سے بھی زیادہ رقت طاری ہوگئی۔

اس غارِ گمنامی میں درویش کو ایک ایک کرکے اپنی سبھی غلطیاں یاد آنے لگیں۔ خاص طور سے وہ غلطی جس نے اس کی ساری دانشوری خاک میں ملا دی تھی اور اس کا طعنہ دیتے ہوئے اکثر لوگ اس کے منہ پر پنجابی شاعر کا وہ شعر پڑھنے لگتے تھے جس میں عاشق اپنے معشوق کو مسجد توڑنے مگر دل نہ توڑنے کا سبق دیا کرتا ہے۔ کچھ اور چھوٹی موٹی غلطیاں بھی یاد آئیں۔ مثلاً مٹھائیوں کے وہ ڈبے جو اس نے ایک مرتبہ بعض درباریوں کو اپنے حق میں ہاتھ اٹھوانے کے لئے بھجوائے تھے۔

غرض اس طرح پانچواں درویش اپنی غلطیوں کو یاد کرکے سر پٹکتا اور پچھاڑیں کرتا رہا۔ اس کا جی چاہا کہ کف افسوس بھی ملے مگر غار میں اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ پھر بھوک بھی زور کی لگی تھی۔ چنانچہ وہ پچھاڑوں کے ساتھ غش بھی کھانے لگا۔ ابھی اس نے ساتواں یا آٹھواں غش ہی کھایا تھا کہ اچانک ایک غیبی صدا آئی جو غالباً غیب سے آئی تھی۔

غیبی صدا نے چلا کر کہا۔ "بول اے نامعقول! کیا چاہتا ہے؟"

تس پر درویش بولا۔ "اے غیبی صدا کے مالک، ہو سکے تو اس غار سے نکلنے کی ترکیب بتا!"

جواب آیا۔ "آہ، اے مردِ نابکار! تو نے وہ سوال کر دیا جسے پورا کرنا میرے بس میں بھی نہیں۔

"میں خود عرصہ سے اس نامعقول غارِ ناہنجار میں قید ہوں۔ بہرحال چونکہ تیری آہ و بکا سے نیند میری بار بار ڈسٹرب ہو رہی ہے، اس لئے ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ غور سے سن اور گرہ باندھ لے۔ باندھ لی! اچھا اب سن۔ یہاں سے کالے کوس دور ایک دوسرا غار ہے۔ اس سے چند سفید کوس آگے تجھے ایک مولانا بے ریش سائیکل پر گھومتے ملیں گے۔ تجھے دیکھتے ہی وہ کنی کاٹ جائیں گے مگر تو کاٹنے مت دیجیو! فوراً انہیں پکڑ کر غار سے نکلنے کی ترکیب پوچھ لی جیو۔ وہ تجھے بتائیں گے کہ... مگر نہیں۔ میں کیوں بتاؤں کہ وہ کیا بتائیں گے۔ ان ہی سے پوچھیو اور اب تو فوراً یہاں سے چپ چاپ نکل جا کہ میں ایک اور لمبی نیند لینا چاہتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر میں درویش کو خوفناک خراٹے سنائی دینے لگے۔ ان خوفناک غیبی خراٹوں سے گھبرا کر وہ کالے کوس چل پڑا!

کافی دور چلنے کے بعد جب کالے کوس ختم ہو گئے تو وہ رک گیا۔ یہاں سے سفید کوس شروع ہوتے تھے۔ کچھ دیر آرام کے بعد درویش نے یہ بھی طے کر لئے اور پھر جیسا کہ غیبی آواز نے بتایا تھا، وہاں ایک مولانا بے ریش کو ایک سائیکل پر گھومتے پایا، جو ایک دائرے میں اس طرح گھوم رہے تھے جیسے کسی سے سات دن سات رات لگاتار سائیکل چلانے کی شرط بد رکھی ہو!

مولانا نے اسے دیکھتے ہی کنی کاٹنے کی کوشش کی مگر پانچواں درویش اس کے لئے پہلے ہی تیار تھا۔ وہ اچک کر مولانا کے کیریئر پر (یعنی ان کی سائیکل پر) بیٹھ گیا اور اپنا جوتا پچھلے پہیے میں (سائیکل کے پچھلے پہیے میں) پھنسا دیا۔ سائیکل فوراً رک گئی اور درویش مولانا سمیت زمین پر گر پڑا۔ مولانا نے گرتے ہی درویش کو خوب سخت سست سنائی۔ اس کے بعد ست سخت سنانے لگے۔ آخر جب تھک کر محض ست ست پر آگئے تو درویش نے موقع غنیمت جانا اور اپنا مدعا بیان کر دیا۔

مولانا کو پھر غصہ آگیا۔ بولے۔ "او مردِ ناہنجار۔ میں خود اس

www.taemeernews.com

گمنامی کے غار میں عرصہ سے بھٹک رہا ہوں۔ خود نہیں نکل پایا تو تجھے کیا راستہ بتاؤں گا۔ البتہ اگر تو چار درویشوں کا ٹھکانہ ڈھونڈ لے تو ہوسکتا ہے تیرے ساتھ میرا بھی کام بن جائے۔ کیونکہ سنا ہے اس غار سے نکلنے کا نقشہ ان ہی کے پاس ہے۔''

درویش نے کہا۔''یا پیر بے طریقت، وہ چار درویش کہاں اور کیوں کر ملیں گے؟'' مولانا نے فرمایا۔

''اے مرید بے حقیقت و بدعقیدت یہاں سے سیدھا شمال کی سمت چلا جا۔ ٹھیک ایک دن ایک رات کی مسافت کے بعد جب وہاں پہنچے تو مشرق کی طرف مڑ جائیو۔ پھر اتنا ہی سفر طے کرنے کے بعد جنوب کا رخ کی جیو۔ جہاں سے پھر اتنی ہی دور مغرب کی سمت چلنے کے بعد تجھے ایک عالم فاضل انسان ملیں گے۔ بس ان کی قدم بوسی کر کے ساتھ ہو لی جیو۔ وہ تجھے مخلہ چار درویش پہنچادیں گے جو یہاں سے جنوب کی طرف سائیکل سے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے!''

''یہاں سے!؟'' درویش چونک گیا۔

مولانا بھی چونک کر جھٹ سے بولے۔''نہیں۔ یہاں سے نہیں وہاں سے، جہاں تو چار دن چار رات سفر کرنے کے بعد پہنچے گا!''

مگر درویش کہنہ واقعی مرد عیار بلکہ پورا خوبہ مرد عیار تھا۔ فوراً تاڑ گیا کہ مولانا اسے بنا رہے ہیں۔ اس نے جیب سے ایک کاغذ اور قلم نکالا اور مولانا کے بتائے ہوئے راستے کا نقشہ کاغذ پر کھینچ کر بغور دیکھنے کے بعد ان کے قدموں میں گر گیا۔

مولانا گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے اور چیخے۔''ابے یہ کرتا ہے! ہٹ ہٹ۔ دور ہو۔''

درویش بولا۔''یا شیخ، میں سمجھ گیا۔ وہ عالم فاضل انسان آپ ہی ہیں!''

مولانا نے حیران ہو کر پوچھا۔''اے کائیاں انسان! یہ تو نے کیوں کر جانا؟''

درویش نے کہا۔''میں نے مدرسہ میں جیومیٹری پڑھی تھی۔ الحمدللہ کہ وہ آج کام آئی اور میں فوراً سمجھ گیا کہ جو راستہ آپ نے بتایا اس پر چل کر آدمی وہیں پہنچ جائے گا جہاں سے چلا تھا۔ اس لئے اب سیدھے سیدھے یہ بتائیے کہ جب آپ کو خود ہی یہ معلوم ہے کہ چار درویش کہاں پائے جاتے ہیں تو اب تک ان کے پاس کیوں نہیں گئے۔''

درویش کی بات سنتے ہی مولانا آب دیدہ ہوگئے اور کھلکھلا کر رونے لگے۔ کہا۔''آہ اے بزرگ باراں دیدہ۔ یہ قصہ بڑا دردناک، عبرت انگیز و سبق آموز ہے۔ اس لئے پورا سن اور بیچ میں مت ٹوکیو۔ ہوا یہ کہ ایک دن میں سائیکل پر سبزی خرید نے کے لئے منڈی جا رہا تھا کہ ایک نامعقول گدھا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ آواز دی۔ جیب سے رکشہ والا ہارن نکال کر پوں پوں بجایا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ غصہ میں آ کر میں نے سائیکل سے اسے ٹکر مار دی۔ حالانکہ ٹس سے مس تو وہ تب بھی نہ ہوا مگر مس سے تھوڑا ٹس ہوگیا۔ تس پر گدھے نے ہانک لگا کر مجھے اور میری سائیکل کو بددعا دی اور کہا خدا کرے تو زندگی بھریوں ہی گھومتا رہے۔ بس آج کا دن ہے اور وہ دن۔ میری سائیکل میرے قابو میں نہ رہی۔ اس پر سوار ہو کر جاتا کہیں اور مگر یہ پہنچا دیتی کسی اور جگہ۔ چلتا شمال کی طرف اور پہنچ جاتا مغرب کی طرف۔ وہاں سے جنوب کا رخ کرتا تو یہ مشرق میں لے جاتی۔ پہلے یہ بڑے بڑے دائرے میں گھومتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ دائرہ مختصر ہونے لگا اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ جب بھی اس پر سوار ہوتا ہوں یہ تھوڑی دیر میں گھوم کر وہیں واپس لے آتی ہے۔ اس نابکار، نانجار اور نافرمان سائیکل کی وجہ سے میں بد بخت اس کمبخت غار میں آ پھنسا ہوں۔''

یہ دردناک کہانی سننے کے بعد درویش سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے سائیکل کا بغور معائنہ کیا اور پھر خوشی سے بولا''اگر میں آپ کی سائیکل کو بددعا سے نجات دلادوں تو کیا دیں گے؟''

یہ سنتے ہی مولانا کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگے۔''اگر اس آوارہ، اوباش سائیکل کو راہ راست پر لے آئے تو میں تجھے اس

www.taemeernews.com

درگاہ نوگزہ پیر میں داخل ہونے کا اجازت نامہ دے دوں گا جہاں چاروں درویش آئندہ جمعرات کو پہلی بار آپس میں ملاقات کرنے والے ہیں!''

درویش نے خوش ہوکر کہا۔ ''بس تو اے مولانا! اندھا کیا چاہے۔ دوکان! میں اس سائیکل کو ایسا درست کردوں گا کہ آئندہ کبھی غلط راہ نہیں چلے گی۔''

پانچویں درویش نے سائیکل کو سیدھا کھڑا کیا۔ اس کا اگلا پہیہ دونوں ٹانگوں کے بیچ لیا اور دونوں ہاتھوں سے ہینڈل کو گھما کر سیدھا کردیا، جو غالباً گدھے کی ٹکر سے تھوڑا سا ٹیڑھا ہو کر ایک طرف گھوم گیا تھا۔ اس کے بعد سائیکل کا چال چلن ہمیشہ کے لئے درست ہوگیا۔

لے جانا مولانا سائیکل سوار کا درویش کو محلّہ چار درویش تک سائیکل پر اپنی،

کرنا انتظار اگلی جمعرات کا چھ دن تک، پہنچنا درگاہ مذکور میں پاس دکھا کر

ملنا وہاں چار درویشوں کا آپس میں وقت مقررہ پر اور
سننا چھپ کر باتیں ان کی پانچویں درویش کا!

نوگزہ پیر کی درگاہ میں بیٹھے چاروں درویشوں کی شکلیں پانچویں درویش کو جانی پہچانی محسوس ہوئیں۔ لیکن اس کی عادت چونکہ سب سے الگ رہنے کی تھی اور وہ وعدے اور چہرے اکثر بھول جاتا تھا اس لئے ٹھیک سے یاد نہ کرسکا کہ کون سی شکل کس کی تھی اور کس کی شکل کون سی!

ادھر چاروں درویشوں نے گرم جوشی سے مصافحے کئے اور اس میں ایسی گرم جوشی دکھائی کہ ایک درویش کی تو چیخ ہی نکل گئی۔ دوسرے درویش نے گھبرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

پھر یہ بھی ہوا کہ بعض درویش غلطی سے دو دو بار ہاتھ ملا بیٹھے۔ اس کے بعد بغل گیری شروع ہوئی۔ اس میں بھی ویسی ہی غلطیاں ہونے لگیں۔ کئی درویش غلط بغل گیر ہوگئے۔

''اف میری پسلیاں۔'' ایک آواز آئی۔

''معاف کیجئے آپ پہلے بھی گلے مل چکے ہیں۔'' دوسری آواز آئی۔

''بھئی میری اب تک صرف دو بغل گیریاں ہوئی ہیں۔ لگتا ہے کہ کوئی صاحب غلطی سے چھوٹ گئے ہیں۔'' تیسری آواز آئی۔

یہ دیکھ کر پانچواں درویش غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ آخر ایک درویش نے باقی درویشوں کو پکڑ پکڑ کر صحیح بغل گیر کرایا تب جا کر پانچویں درویش نے پیچ و تاب کھانا بند کیا۔ اس کے بعد چاروں درویش ایک ایک گاؤ تکیہ لے کر بڑے سے غالیچے پر آمنے سامنے بیٹھ گئے اور اپنا اپنا حقہ پینے لگے۔

کافی دھواں اڑانے اور حقوں سے شور مچانے کے بعد ایک درویش جس کا نام پہلا درویش تھا، یوں گویا ہوا۔ ''صاحبو! چونکہ رات بڑی ہے اور بات چھوٹی اس لئے میری تجویز ہے کہ...''

''مجھے اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے!'' بڑے سر والے فارغ البال یعنی گنجے درویش نے چھوٹتے ہی کہا۔

''مگر قبلہ ابھی تو میں نے تجویز بیان بھی نہیں کی۔'' پہلے درویش نے اپنی خرگوش کے بالوں والی ٹوپی سنبھال کر کہا۔ اس پر چگی داڑھی والے درویش نے سمجھایا۔ ''کوئی بات نہیں۔ یہ ان کا تکیہ کلام ہے۔''

''اتنا لمبا تکیہ کلام؟ یہ تو گاؤ تکیہ کلام معلوم ہوتا ہے۔'' ٹوپی والے درویش نے حیرت سے کہا۔

''کچھ بھی ہو۔ آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔'' داڑھی والے درویش نے کہا۔

ٹوپی والے درویش نے پھر اپنی ٹوپی ٹھیک سے جمائی اور بولا۔ ''میری تجویز یہ ہے یارو کہ اس غار سے نکلنے کی حکمت عملی طے کرنے سے پہلے کیوں نہ ہم اپنی اپنی داستان دوہرالیں۔ اس طرح رات بھی کٹ جائے گی اور ایک دوسرے کے تجربوں کی روشنی میں ہم کوئی متفقہ رائے بھی قائم کرسکیں گے۔''

''ٹھیک ہے!'' ایک درویش نے جو کہ دراصل دوسرا درویش

www.taemeernews.com

تھا کہا۔"چونکہ آپ ہم سب میں سینئر ہیں اس لئے پہلے آپ ہی اپنا قصہ شروع کریں۔"

قصہ پہلے درویش کا

ٹوپی والے درویش نے کہ شکل اور ٹوپی جس کی پانچویں درویش کو وزیر استعفیٰ باز سے ملتی جلتی معلوم ہوتی تھی، اپنی داستان شروع کرنے سے پہلے جیب سے ایک کاغذ نکالا، اسے کھول کر دیکھا، سونگھا، چوما اور پھر واپس جیب میں رکھ لیا۔

"بھائی صاحب نقل کرنے کی نہیں چلے گی۔ منہ زبانی سنائیے!" بڑے سر والے گنجے درویش نے ٹوکا۔

"صبر اے برادر صبر! منہ زبانی ہی سناؤں گا۔" ٹوپی والے درویش نے کہا۔" دوستو آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ اس کاغذ میں کیا ہے؟"

"ضرور کوئی تازہ غزل ہوگی۔" چکی داڑھی والے نے کہ نام جس کا چوتھا درویش تھا، لقمہ دیا۔ اُسے بیچ میں لقمہ دینے کی بہت عادت تھی۔

پہلے درویش نے پھر اپنی ٹوپی کو درست کیا اور آہ سرد بھر کر بولا۔" کاش ایسا ہوتا۔ مگر نثری شاعری نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ جب سے یہ شروع کی، غزل نے منہ موڑ لیا۔ قطعہ آنکھیں دکھاتا ہے۔ رباعی منہ چڑاتی ہے۔ مثنوی خاموش ہے۔ قصیدہ طعنہ زن ہے۔ مرثیہ منہ پھیر کر ہنستا ہے۔ عرصہ ہوا کوئی مقطع کہے ہوئے۔ خیر اے میرے عزیزو! میں خود بتائے دیتا ہوں۔ یہ کاغذ دراصل ایک کورا کاغذ ہے جو میں احتیاطاً ہر وقت اس لئے جیب میں لئے پھرتا ہوں کہ کیا پتہ کب کس عہدے سے استعفیٰ دینا پڑ جائے۔"

پانچویں درویش کو یہ سنتے ہی جھٹ یاد آ گیا۔ یہ یقیناً وہی وزیر استعفیٰ باز تھا جس سے اس کا کبھی واسطہ پڑا تھا اور جو ذرا ذرا سی بات پر استعفیٰ دے دیا کرتا تھا۔ پوری طرح پہچان میں وہ دراصل اس لئے نہیں آیا تھا کہ پہلے اس کی مونچھیں ہوا کرتی تھیں جو ہمیشہ چارج کر چالیس منٹ بجاتی رہتی تھیں۔ لیکن اب وہ صفا چٹ یعنی کلین شیو ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس کے چہرے پر کچھ بھی نہیں بچ رہا تھا۔ اس کا بیان جاری تھا۔

"آپ پوچھیں گے کہ استعفیٰ کیوں؟ تو عزیزو یہ ایک دردناک کہانی ہے جسے سن کر آسمان کا کلیجہ شق، زمین کا سینہ چھلنی اور سمندر کا معدہ پانی پانی ہو جائے۔ اس لئے وہ نہیں سناؤں گا!"

"نہیں نہیں ضرور سنائیے۔ میں نے ابھی تک آسمان تو دیکھا ہے مگر اس کا کلیجہ نہیں۔ شاید اس کا گُردہ بھی ہوتا ہو۔" بڑے سر والا درویش بولا۔

"ہاں ہاں ضرور سنائیے!" دوسرے درویش نے کہ پہچان اس کی ایک ہفتہ سے بڑھی ہوئی داڑھی تھی کہا۔ کمال یہ تھا کہ اس کی داڑھی ہر ہفتے ایک ہفتہ پرانی معلوم ہوتی تھی۔ پتہ نہیں وہ کیسے استرے سے شیونگ کراتا تھا کہ داڑھی کٹتی ہی نہیں تھی۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ یا تو اس کے استرے میں کچھ نقص ہے یا داڑھی میں۔ بہرحال، باقی درویش بھی پہلے درویش کے پیچھے پڑ گئے اور کہنے لگے کہ سناؤ، فوراً وہ کہانی سناؤ۔

پہلے درویش نے کہا۔" ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ جب میں چھوٹا سا بچہ تھا تو۔۔"

"صرف بچہ کہنا کافی ہے۔ چھوٹا سا حشو وزوائد میں شمار ہے۔۔" چوتھے درویش نے حسب عادت لقمہ دیا۔

"بھئی آپ لقمے بہت دیتے ہیں۔" دوسرے درویش نے فہمائش کی۔

پہلے درویش نے اپنا قصہ جاری رکھا۔

"خیر۔ جب میں بچہ تھا، تو مجھے کرسی پر بیٹھنے کی بہت عادت تھی۔ جب بھی موقع ملتا کسی کرسی پر جا بیٹھتا۔ ایک مرتبہ کرسی پر چڑھتے ہوئے اتنے زور سے گرا کہ ٹانگ ٹوٹنے سے بچ گئی۔ غصہ میں آ کر میں نے کرسی کو زمین پر پٹخ دیا۔ اس سے کرسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ درد سے چلانے لگی۔ لنگڑی کرسی نے مجھے بد دعا دی کہ اے بدبخت اب جب بھی تو کسی اونچی کرسی پر بیٹھے گا تجھے

www.taemeernews.com

بلائیں گھیر لیں گی۔ راتوں کو خرانے آئیں گے اور طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہو جائے گا! میں نے گھر والوں کو یہ واقعہ سنایا تو وہ گھبرا گئے اور بد دعا کا اثر اتروانے کے لئے مجھے ایک ملنگ کے پاس لے گئے جو یک بڑے سے پلنگ پر بیٹھا تھا۔ پورا قصہ سن کر ملنگ پلنگ نشیں نے کہا کہ تمہارا بچہ واقعی سخت عذاب میں پھنس گیا ہے۔ جس سے بچنے کی صرف ایک ترکیب ہے۔ اسے استعفیٰ لکھنا سکھادو۔ بس تبھی سے مجھے استعفیٰ پڑھایا جانے لگا۔ چنانچہ جب مجھے پہلی بار اسکول میں مانیٹر بنایا گیا تو میں نے چند روز بعد ہی مانیٹری سے استعفیٰ دے دیا جس سے کلاس کے لڑکے بے حد خوش ہوئے۔ بس اس کے بعد تو مجھے استعفیٰ دینے کا چسکا پڑ گیا۔ جس کلاس میں جاتا، پہلے تو سفارش کروا کر اس کا مانیٹر بن جاتا اس کے بعد کلاس ٹیچر کو استعفیٰ دے کر حیران کر دیتا۔ بچوں کے ساتھ کھیل میں بادشاہ بنتا مگر جہاں کوئی فیصلے کا وقت آتا، تخت سے دست بردار ہو جاتا۔ غرض اس طرح مجھے بچپن سے ہی استعفیٰ دینے کی عادت پڑ گئی۔ بقول شخصے: مرا مزاج لڑکپن سے مستعفیانہ تھا! میں ہر وقت مستعفی رہنے لگا۔ بڑا ہوا تو طلبا کی تنظیموں سے استعفیٰ دینا شروع کر دیا۔ راجاؤں کے خاندان میں پیدا ہوا تھا مگر راج کاج سے بھی مستعفی ہو گیا یہاں تک کہ مجھے ریاست کا وزیر اعلیٰ بنادیا گیا تو ایک دن میں اس سے بھی استعفیٰ دے کر بھاگ گیا۔ بعد میں پتہ نہیں لوگ مجھے کہاں سے پکڑ لائے اور اس دفعہ باندھ بوندھ کر پورے ملک کا وزیر فوج بنادیا۔ میرے بزرگوں نے کہا کہ خبردار جو، اب استعفیٰ دیا ہے تو! مگر میں کہاں باز آنے والا تھا۔ ایک دن ایک فوجی نے پاؤں پٹخ کر مجھے اس زور کی سلامی دی کہ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور گرتے گرتے بچا۔ بس اگلے ہی دن میں نے بادشاہ کو استعفیٰ دے دیا...''

''اوفوہ! بھئی ابھی اور کتنے استعفے باقی ہیں۔'' چوتھا درویش جماہی لیتے ہوئے بولا۔

''حد ہوگئی! آپ نے پھر لقمہ دیا۔'' دوسرے درویش نے ڈانٹا۔

''معاف کیجئے۔ یہ لقمہ نہیں نوالہ تھا۔'' اس نے صفائی دی۔

پہلا درویش بولا۔'' آخر بادشاہ نے پھر بزرگوں کو بلایا۔ بزرگوں نے مجھے بری طرح سرزنش کی یہاں تک کہ زدوکوب کرنے کی دھمکی دی اور اس مرتبہ مجھے محکمہ خزانہ کا داروغہ بنا کر کہا کہ خبردار اگر اس مرتبہ استعفیٰ دیا تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ اس دفعہ میں نے بھی سوچا کہ چلو یار بہت ہوا۔ اس بار استعفیٰ نہیں دینا ہے۔ مگر آہ! فلک ناہنجار کو کچھ اور ہی نامنظور تھا۔ حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ حاکم وقت، شوق جسے فلمیں دیکھنے کا بے حد تھا، ایک دن توپ خانہ کے توپچی کے ساتھ سنیما دیکھتا ہوا پکڑا گیا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ کسی نے کہا وہ بلا ٹکٹ سنیما دیکھ رہا تھا۔ کسی نے اڑادی کہ دونوں نئی فلموں کی ٹکٹیں بلیک کرتے تھے۔ کسی نے مشہور کردیا کہ دونوں کو یہ ٹکٹ میں سپلائی کرتا تھا۔ غرض جتنی باتیں اتنے منہ۔ مگر حقیقت سے صرف میں واقف تھا۔ اصل میں توپ خانہ کے لئے جس کارخانہ سے توپیں خریدی جاتی تھیں اس سے توپچی کی ساز باز تھی اور توپچی حاکم وقت سے ساز باز رکھتا تھا۔ چنانچہ توپ کی ہر خریداری پر کارخانہ والوں کی طرف سے دونوں کے پاس نئی فلموں کے ٹکٹ تحفے اور نذرانے پہنچ جاتے تھے۔ ادھر میں بھی بہت پریشان تھا۔ کرسی کاٹنے کو دوڑتی تھی، کیونکہ بہت دنوں سے کوئی استعفیٰ نہیں دیا تھا۔ چنانچہ حاکم وقت کو پریشانی میں دیکھ کر میں نے موقع غنیمت جانا اور جھٹ مستعفی ہو گیا۔ اس کے بعد کرنا خدا کا کیا ہوا کہ حاکم ملک کی پارٹی الیکشن ہار گئی۔ چنانچہ کسی اور کو ملک کا حاکم بنانے کی ضرورت پیش آگئی۔ کئی لوگ حاکم وقت بننا چاہتے تھے۔ سخت جھگڑا ہوا کہ کسے حاکم بنایا جائے۔ میں نے کہا کہ پرچی ڈال لو۔ سب نے منظور کرلیا۔ ایک بزرگ کو کہ نام جس کا بزرگ کلاں تھا پرچی نکالنے کا کام سونپا گیا۔ اب شومئی قسمت دیکھئے۔ وہی ہوا جس کا ڈر نہیں تھا۔ قرعہ فال میرے نام نکل آیا...''

''غلط بالکل غلط۔'' اس بار لقمہ دینے والا کوئی اور نہیں بلکہ خود

www.taemeernews.com

دوسرا درویش تھا جس کی ریش یک ہفتہ کے بال غصہ سے کھڑے ہوگئے تھے۔ "تم نے پرچیوں میں ہیرا پھیری کی تھی۔ ان پر میرا نام بھی لکھا جانا تھا مگر تم نے عیاری کی اور بزرگ کلاں سے ساز باز کرکے سب پرچیوں پر اپنا نام لکھوایا۔ یہ سب تمہاری چالبازی تھی۔"

"بھئی یہ کیسا شور ہے!؟" بڑے سر والے گنجے درویش نے کہ نام اس کا تیسرا درویش تھا اور اب تک اونگھ رہا تھا، چونک کر کہا۔

"میرا خیال ہے۔ آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔" چوتھے درویش نے کہا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے لقمہ نہیں دیا تھا۔

پہلے درویش نے بیان جاری رکھا۔ "اس کے بعد میں نہ چاہتے ہوئے بھی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس دفعہ طے کرلیا کہ استعفیٰ ہرگز ہرگز نہیں دوں گا۔ مگر فیصلہ کیا ہی تھا کہ حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ کچھ ایسی آندھیاں آئیں کہ جلتے چراغ بجھ گئے اور بجھتے چراغ جلنے لگے۔ نوجوانوں میں شوقِ خودسوزی ایسا بیدار ہوا کہ پروانہ وار شمع ہستی پر گر گر خاک ہونے لگے۔ اس پر منشی عبدالغفور سہارنپوری کا شعر یاد آگیا:

خاکستر پروانہ کو آغوش میں لے کر
روئے گی کبھی شمع بھی رقص کرے گی!

بس صاحبو! پھر یوں ہوا کہ تنگ آکر میں نے حکمرانی سے بھی استعفیٰ دے دیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" تیسرا درویش پھر اونگھنے لگا تھا۔

"پھر کیا ہونا تھا۔ وہی ہوا جو ہو رہا ہے۔ ہر وقت یہ کورا کاغذ جیب میں لئے پھرتا ہوں کہ کاش پھر کوئی استعفیٰ دینے کا موقع ہاتھ آجائے مگر افسوس اب کوئی عہدہ ہی نہیں دیتا۔ اسی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک دن اس غارِ گمنامی میں آن پھنسا۔ بس یارو یہ ہے میرا قصہ اور یہ ہے میرا استعفیٰ!" پہلے درویش نے جیب سے کاغذ نکال کر سب کے سامنے رکھ دیا اور کورے کاغذ پر ہی دستخط کردیئے۔

پانچویں درویش کو یہ دیکھ کر سخت عبرت ہوئی۔

قصہ دوسرے درویش کا

اب دوسرے درویش کی باری تھی۔

دوسرے درویش نے اپنی ریش یک ہفتہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، حسب عادت کن انکھیوں سے باقی درویشوں کی طرف دیکھا۔ دراصل وہ سب کو اسی طرح دیکھتا تھا۔ پتہ نہیں اس کی آنکھوں میں کچھ نقص تھا یا کیا بات تھی کہ کسی کو سیدھے منہ دیکھتا ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ پھری ہوئی نظروں سے دیکھ کر بات کیا کرتا تھا۔ رہ گئی داڑھی تو اس کا ذکر ہم کرہی چکے ہیں کہ یا تو اس کا استرا ناقص تھا، یا وہ کسی پراسرار ڈھنگ سے شیو بناتا تھا۔ یا پھر اسے کسی بزرگ کی بددعا لگی ہوئی تھی کہ حجامت کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے ایک ہفتہ سے حجامت نہیں کی ہے۔ بس اسی سے اس کی داڑھی ریش یک ہفتہ کہلانے لگی اور وہ بابائے یک ہفتہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔

بہرحال اس نے مشکوک ترچھی نظروں سے سب کو دیکھا اور یوں ہی اپنی داستان شروع کی۔

"دوستو۔ داستانوں میں دستور ہے کہ جو بھی اپنا قصہ سنائے وہ پہلے ایک شعر ضرور پڑھتا ہے۔ خواہ اس کا اصل داستان سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ شعر عرض کیا ہے کہ:

اسیر ، پنجہ ، عہد ، شباب کرکے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کرکے مجھے

رفیقو! یہ ناچیز زمانہ قدیم میں ایک ایسی جماعت میں شامل تھا جس کی سربراہ ایک خاتون ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں سبھی نوجوان دل سے اس خاتون کی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ میں بھی کرتا تھا۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ اس کی زبان اور تھی اور میری زبان کچھ اور۔ لہٰذا ہمارے درمیان جدید شاعروں کی طرح ترسیل کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی اور میری بات کو وہ سمجھنے سے انکار کردیتی۔ اکثر یہ مصرع میری زبان پر آجاتا:

www.taemeernews.com

زبان یارمن ترکی و من ترکی نمی دانم!

ایک مرتبہ بھرے جلسہ میں تقریر کرتے وقت بھی میرے منہ سے یہ مصرع نکل گیا۔ اخباروں نے اگلے دن سرخیوں میں شعر چھاپ دیا۔ اس سے لوگ مجھے ترکی بہ ترکی کہنے لگے۔ بلکہ کچھ نے تو مجھے جوان ترک بھی کہہ دیا جو مجھے اچھا لگا کیونکہ کمال اتاترک کے بعد میں پہلا سیاسی شخص تھا جسے ترک کہا گیا تھا۔ لیکن جب خاتون تک یہ شعر پہنچا اور اسے معلوم ہوا کہ شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا تو وہ بہت بھنائی۔ میں نے غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی، مگر اس سے غلط فہمی اور بڑھ گئی اور آخر ایک روز اس نے مجھے جماعت سے نکلوادیا۔ اس کی پوری جماعت باجماعت میرے پیچھے پڑ گئی اور تب سے میرے برے دن شروع ہوگئے۔

غرض اس فارسی مصرعے نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔ بیوی بچے ناراض ہوگئے۔ سیاسی جماعتوں نے مجھے منہ لگانا بند کردیا۔ میں یوں ہی در در کی خاک چھانتا پھر رہا تھا کہ ایک بزرگ زندہ بادی سے میری ملاقات ہوگئی جو وجد میں آنے پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد نعرہ لگاتے: 'انقلاب مکمل زندہ باد'۔ کبھی کبھی 'انقلاب نامکمل مردہ باد' بھی کہہ دیتے۔ میں نے پوچھا، یا حضرت یہ کون سا انقلاب ہے۔ سرخ، سبز، یا سفید۔ کہنے لگے ابھی ہم نے اس کا رنگ طے نہیں کیا ہے۔ لہٰذا فی الحال تو، اسے انقلاب بے رنگ سمجھ اور زیادہ سوال جواب مت کیا کر!

پتہ چلا کہ وہ بزرگ بھی خاتون مذکور سے خفا رہتے تھے۔ کیونکہ کسی زمانے میں اس نے ان کے حقے کی چلم اور نے توڑ دی تھی۔ یہ جان کر میں نے اپنے تئیں سوچا کہ خاتون مذکور سے بدلہ لینے کا یہ اچھا موقع ہے۔ چنانچہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جھٹ بزرگ زندہ بادی کا مرید ہوگیا۔ ادھر خاتون نے جو کہ اس دوران حکمرانِ مطلق العنان بن بیٹھی تھی، اپنے مخالفوں کی مخالفت بڑھادی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفوں نے بھی اس کی مخالفت میں اضافہ کردیا جس سے دونوں طرف مخالفت بڑھ گئی۔ اس مخالفت در مخالفت سے سب کچھ ایسا گڈ مڈ ہوا کہ مخالفت کی وجہ بھی کسی کو یاد نہ رہی۔ لوگ اکثر ایک دوسرے سے پوچھتے۔ کیوں بھئی یہ کیا مخالفت ہو رہی ہے۔ کئی لوگ تو مخالفت کو خلافت اور ہم سب کو خلیفہ کہنے لگے۔ آخر ایک دن خاتون نے سبھی مخالفوں کو داخل زنداں کردیا۔ اسیری کے یہ دن ہم نے خوب تاش اور چوسر کھیل کر مزے میں گزار دئے اور جب رہا ہوئے تو پتہ چلا کہ باہر عجیب ہوا چلی ہوئی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ ہم بھی ہوا کے رخ پر ہولئے۔ خاتون نے مردانہ وار ہوا کا مقابلہ کیا مگر تخت اس کا کہ جس پر وہ تخت نشیں تھی، تختِ رواں نکلا اور اسے لے اڑا۔

ادھر ہمیں یہ ہوا، اڑا کر اس جگہ لے آئی جہاں اس کا تخت تھا۔ بس ہم نے فوراً وہاں اپنا تخت بچھادیا۔ یہ سب اسی طرح ہوا جیسے جناب ہومی واڈیا کی فلموں میں ہوتا تھا۔ آپ نے ان کی فلم 'قصہ حاتم طائی باتصویر' تو دیکھی ہوگی۔ بس اسی طرح ہمارا تخت پایۂ تخت پر جا پہنچا اور ہماری جماعت کو حکمرانی مل گئی اور وہ بھی سات سوال پورے کئے گئے بغیر! مگر شہزادہ منیر شامی کبابی کوئی اور بن بیٹھا۔ پتہ نہیں لوگوں نے کیا کیا سازش کی کہ میرے حقیر دوست اور فقیر ساتھی تو وزیر اور حاکم بن گئے مگر مجھے کسی نے نہ پوچھا۔ میں نے کہا یارو مجھے کوئی اچھی سی کرسی دے دو۔ مگر انہوں نے ایک موڑھا آگے کردیا اور ایک حقہ دے کر کہا کہ اس پر یعنی موڑھے پر بیٹھ کر جماعت کی صدارت کرتے اور حقہ پیتے رہو۔ نیز اس پر بھی نظر رکھو کہ کوئی کسی سے لڑ تو نہیں رہا ہے۔ یہ مجھے محل سے باہر رکھنے کی ترکیب تھی۔ اس پر مجھے بڑا تاؤ آیا۔ مگر خود پر قابو رکھا اور پھر موڑھے پر بیٹھ کر کچھ ایسی صدارت کی کہ کچھ ہی عرصہ میں سب میں پھوٹ پڑ گئی۔ سب ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور گلا کاٹنے لگے۔ آخر ان کی حکومت جاتی رہی اور میں نے خوب حقے کے کش اڑائے!

لیکن ادھر خاتون مذکور ابھی تاک میں تھی۔ اس نے فوراً حالات کا فائدہ اٹھایا اور تختِ رواں پر بیٹھ کر پھر حکمراں بن گئی۔ اس مرتبہ اس نے ایک نئی ترکیب نکالی اور وہ ترکیب یہ تھی کہ اپنے

www.taemeernews.com

مخالفوں کی مخالفت بند کردی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سارے مخالف چت ہوگئے اور دشمن ٹھکانے جالگے۔ ہر طرف اسی کا ڈنکا بجنے لگا۔ میں بہت پچھتایا۔ اس بیچ بزرگ زندہ بادی بھی کوچ فرما چکے تھے۔ چنانچہ میں تنہا رہ گیا۔ سب کام دھندا چھوٹ گیا۔ بے روزگاری نے آن گھیرا۔ نوبت فاقہ کشی کی آگئی۔ میں نے سوچا کیوں نہ فاقہ کشی کا فائدہ اٹھایا جائے اور فقر و فاقہ کو پیشہ بنالیا جائے کہ یہی وہ واحد پیشہ ہے جس میں پیسہ نہیں لگانا پڑتا۔ بس میں نے پاؤں میں ایک پھٹی پرانی چپل ڈالی اور پورے ملک کا پیدل دورہ کرنے نکل پڑا۔ شہر شہر، قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں جاکر لوگوں سے ملنے لگا۔ جہاں بھی جاتا لوگ مرعوب ہوجاتے اور طرح طرح کے تحفے اور نذرانے لئے چلے آتے۔ رفتہ رفتہ میرے پاس خوب دولت جمع ہوگئی۔ مگر ابھی بہت سا ملک باقی پڑا تھا اور اس کا دورہ کرنا ضروری تھا۔ اس لئے باقی دورے میں تھکن سے بچنے کے لئے میں نے یہ ترکیب نکالی کہ دن بھر بھوکی پیاسی شکل لئے گاؤں دیہات میں پیدل گھومتا، پھر شام کو ایک موڑ پر اچانک غائب ہوکر پہلے سے چھپا کر رکھی گئی موٹر پر سوار ہوتا اور شہر جاکر آرام سے کسی عالی شان ہوٹل میں رات گزار دیتا۔ اگلی صبح موٹر نکال کر پھر کسی گاؤں کی طرف جاتا اور موٹر کو جھاڑیوں میں چھپا کر پھر پیدل گھومنے لگتا۔ لوگ سمجھتے میں ملک کی محبت میں گاؤں گاؤں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ ایک گاؤں میں لوگ میری دیش بھگتی سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے مجھے اپنا پورا ہرا بھرا گاؤں تحفہ میں دے دیا اور خود جنگل میں جاکر رہنے لگے۔ میں نے اس خالی گاؤں کی چار دیواری بنواکر اس کے اندر آرام دہ ایئر کنڈیشنڈ جھونپڑیاں بنوائیں، خود کار بیل گاڑیاں چلوائیں اور اڑن کھٹولوں کے لئے ہیلی پیڈ بنوادیے۔

بڑے سر والے تیسرے درویش نے جو بظاہر اونگھ رہا تھا، اچانک پوچھا۔ ''اس گاؤں کا نام کیا ہے!''

دوسرے درویش نے حسب عادت اسے مشکوک اور ترچھی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''معاف کیجئے۔ وہ نام ذرا بھونڈا سا ہے اس لئے اس کا نام نہیں لوں گا۔''

پانچویں درویش کو جو بڑے صبر سے یہ قصے چپ چاپ سن رہا تھا جھٹ یاد آگیا۔ واقعی اس جگہ کی عرفیت بڑی بھونڈی سی تھی!

''پھر کیا ہوا؟'' باقی درویشوں نے پوچھا۔

دوسرا درویش بولا۔ ''بس اس کے بعد میں اس گاؤں میں بنائی گئی اپنی فائیو اسٹار خانقاہ میں گزر بسر کرنے لگا۔ تبھی ایک روز سیر کرتے کرتے میری ملاقات ایک لمبے تڑنگے بزرگ حقہ نوش سے ہوئی جنہیں لوگ احتراماً بزرگ کلاں کہتے تھے۔ یہ بابا کے اکھڑ مزاج بزرگ تھے اور ذرا ذرا سی بات پر تاؤ کھا جاتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایک نام تاؤ جی بھی تھا۔ تاہم وہ تھے بڑے کام کے آدمی۔ چنانچہ میں روز ان کی چلم بھرنے لگا۔ آخر بزرگ میری خدمت سے خوش ہوگئے اور ایک دن بولے۔ بول کیا مانگتا ہے۔ میں نے کہا حضور میری صرف دو خواہشیں ہیں۔ انہوں نے کہا دوسری خواہش پہلے بتا کیونکہ پہلی تو میں خوب جانتا ہوں کہ تو حاکم وقت بننا چاہتا ہے۔ یہ سنتے ہی میں ان کے قدموں میں گر گیا اور عرض کیا کہ پیر و مرشد آپ تو عالم الغیب اور کامل العیب ہیں۔ عیب و غیب کی باتیں بخوبی جانتے ہیں۔ پس جان لیجئے کہ میری دوسری خواہش بھی یہی ہے کہ مجھے حاکم اعلیٰ بنوا دیجئے۔ میں بار بار حاکم اعلیٰ بننا چاہتا ہوں۔

جس پر بزرگ کلاں نے فوراً قدم واپس کھینچ لئے اور بولے۔ اے بے وقوف تو واقعی احمق نکلا۔ اگر عقل مند ہوتا تو ایک کام کے لئے دو خواہشیں نہ کرتا۔ خدانخواستہ تیری جگہ اگر میرا فرزند بزرگ خورد ہوتا تو وہ یوں کرتا کہ پہلی خواہش حاکم وقت بننے کی بیان کرتا اور دوسری خواہش پوچھنے پر کہتا کہ پہلی خواہش پوری ہونے پر بتاؤں گا۔ پھر جب پہلی خواہش پوری ہوجاتی تو دوسری کے بدلے دو اور خواہشیں مانگ لیتا اور عمر بھر اس کی خواہشوں کا سلسلہ بند نہ ہوتا۔ بہرحال تیری بے وقوفی نے مجھے بچالیا چنانچہ اب اگلے الیکشن تک انتظار کر اور خاطر جمع رکھ۔ تیری

www.taemeernews.com

دونوں خواہشات یک آرزو بیک وقت پوری ہو جائیں گی۔

پس اے دوستو! میں بہت خوش ہوا اور انتظار کرنے لگا۔ لیکن آہ! قسمت نے میرے ساتھ دغا کی۔ الیکشن کے بعد حکمراں چننے کا وقت آیا تو بزرگ کلاں نے دن دہاڑے نیند کی گولی کھا کر اور ہی گل کھلا دیا۔ پہلے تو درباریوں سے قول لے لیا کہ جس کا نام میں لوں گا سب اسے حکمراں مانیں گے، اس کے بعد انگلی اٹھائی میری طرف اور نام لے لیا وزیر استعفیٰ باز کا! پتہ چلا کہ وہ بھی خفیہ طور پر بزرگ کلاں کی چلم بھرا کرتا تھا۔ لیکن میں بھی ہار ماننے والا نہ تھا۔ اتفاق دیکھئے کہ چند ماہ بعد ہی بزرگ کلاں وزیر استعفیٰ باز کی کسی بات سے تاؤ کھا گئے۔ اس سے اہل دربار میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایسی افراتفری مچی کہ جس کے جدھر سینگ سمائے ادھر نکل بھاگا۔ ایک درباری تیل کا پیپا اپنی گھوڑا گاڑی میں رکھ کر پورے ملک میں گھومنے لگا اور ملک کے کونے کونے میں جا کر جلتی پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔ آخر وزیر استعفیٰ باز حکمرانی سے مستعفی ہو گیا اور مجھے حکمرانی کا موقع مل گیا۔ مگر افسوس یہ حکمرانی صرف چھ ماہ چلی اور اگلے الیکشن میں ایک بالکل ہی نیا بزرگ جو در اصل بزرگ باراں دیدہ تھا، حکمراں بن بیٹھا!''

پانچویں درویش کو اس پھبتی پر سخت غصہ آیا کیونکہ دوسرے درویش کا اشارہ صریحاً اس کی طرف تھا۔

''اس کے بعد۔'' دوسرے درویش نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''میرا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا اور میں یہاں وہاں گھومنے لگا۔ اسی دوران ایک مرتبہ اپنے تئیں ایک منحوس غار کے سامنے کھڑا پایا۔ شوق تجسس مجھے اس غار کے اندر لے گیا اور میں بھی آپ بزرگوں کی طرح اس غار گمنامی میں بھٹک کر راستہ بھول گیا۔ بس یہاں میرا قصہ تمام ہوتا ہے!''

''اوفوہ!'' چگی داڑھی والا چوتھا درویش جھرجھری لے کر بولا۔ ''بڑا ہی طویل قصہ تھا!''

قصہ تیسرے درویش کا!

سب لوگ بڑے اور گنجے سر والے تیسرے درویش کی طرف دیکھنے لگے جو اونگھنے کے علاوہ اب خراٹے بھی لینے لگا تھا۔ آخر اسے جگا کر کہا گیا کہ میاں اب تمہاری باری ہے۔

تیسرے درویش نے اپنے وسیع و عریض فارغ البال سر پر ہاتھ پھیرا اور کسی بڑے عالم و فاضل کے انداز میں اپنا نچلا ہونٹ ٹیڑھا کر کے بولا۔

''میرا قصہ بڑا فلسفیانہ، معنی آفریں، پُر مغز اور اتنا طویل ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں۔''

''آپ اسے آخر سے شروع کریں اور وہیں ختم کر دیں۔'' چوتھے درویش نے پھر لقمہ دیا۔ تیسرے درویش نے خفگی سے کہا۔

''آپ اسی طرح لقمہ دیتے رہے تو میں احتجاجاً اپنا قصہ واپس لے لوں گا۔''

''نہیں بھئی ایسا نہیں کرتے۔'' سب درویش اسے سمجھانے لگے۔ آخر تیسرا درویش کسی طرح قصہ سنانے پر راضی ہو گیا۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور وہاں آسمان کی بجائے غار کی چھت پا کر گلوگیر آواز میں یہ شعر پڑھا:

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے

پھر یوں اپنا قصہ شروع کیا۔

''دوستو! میرا قصہ یہ ہے کہ یوں تو میں کسی شاہی خاندان میں پیدا ہونا چاہتا تھا مگر قدرت نے مجھے ایک کسان خاندان میں پیدا کر دیا۔ جہاں دن رات ہل بیل بیج کھاد اور موسم وغیرہ کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ جلد ہی میں ان باتوں سے اکتا گیا۔ جیسے ہی یہ باتیں شروع ہوتیں مجھے نیند آ جاتی۔ اس سے آہستہ آہستہ مجھے نیند کی ایسی عادت پڑ گئی کہ ہر بات پر سو جاتا۔ میرے رشتہ داروں میں جھگڑا ہوتا اور میں سو جاتا۔ نتیجہ یہ کہ وہ صلح کر لیتے۔ گھر میں کوئی پریشانی آتی اور میں اونگھنے لگتا۔ چنانچہ پریشانی فوراً دور

www.taemeernews.com

ہوجاتی۔ اسکول میں بھی میرا یہی حال رہا۔ کلاس ہو یا امتحان گاہ۔ مجھے کھٹ نیند آجاتی۔ مجھے دیکھ کر لیکچرار اور ممتحن جماہیاں لینے لگتے اور مجھے تیسرے درجے میں پاس کرنے پر مجبور ہوجاتے۔ ایک روز میں ایک سیاسی جلسے میں سوگیا۔ لوگوں نے مجھے اٹھا کر جلسہ کا صدر بنادیا۔ اسی طرح ایک چناؤ جلسہ میں مجھے نیند آئی تو پارٹی نے مجھے چناؤ میں کھڑا کردیا۔ چناؤ جیت کر جب میں اسمبلی پہنچا تو وہاں بھی میں نے سونا شروع کردیا۔ کیونکہ اب تک میں جان گیا تھا کہ مجھ جیسی ادنیٰ صلاحیتوں والے آدمی کی ترقی کا واحد طریقہ یہ ہے کہ بس سوتے رہو۔ اکثر میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر رات کے پچھلے پہر سڑکوں پر آجاتا اور سوتے رہو کی صدا لگانے لگتا۔ خیر، ایک مرتبہ اسمبلی میں بڑا جھگڑا ہوا۔ بس میں نے جھٹ لمبی تانی اور سوگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے وزیر اعلیٰ بنادیا گیا اور پھر وہ روز سعید بھی آیا کہ وزیر اعلیٰ کی کرسی پر سوتے سوتے میں پارلیمنٹ پہنچ گیا جہاں اسمبلی سے بھی بڑے جھگڑے ہوتے تھے۔ چنانچہ وہاں میں اور زیادہ سونے لگا۔ ایک مرتبہ حکمرانی کی رسہ کشی کے دوران میں نے کچھ ایسی اونگھ بھری کہ آنکھ کھلی تو خود کو تخت حکومت پر بیٹھا پایا۔ مگر دوستو، آخر ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ ایک دن یہی نیند مجھے لے بیٹھی۔ کسی نے نیند میں میرے تخت سے پایہ تخت نکال لیا اور مجھے اس غار میں پہنچا دیا کہ لے، اب جی بھر کر سوتا رہ! بس دوستو یہ ہے میرا قصہ اور اب اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں تھوڑا سولوں!"

یہ کہتے ہی تیسرے درویش نے گردن ڈال دی اور گہری نیند سوگیا!

اب سب کی نگاہیں چوتھے درویش کی طرف تھیں!

قصہ چوتھے درویش کا

چوتھے درویش نے اپنا قصہ سنانے سے پہلے زور کی چھینک ماری۔

چھینک کیا تھی گویا بم کا گولہ تھی۔ جس کے دھماکے سے باقی سبھی درویش اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دور جا پڑے۔ یہاں تک کہ پانچواں درویش بھی جو اُن کی باتیں چھپ کر سن رہا تھا، اچھل گیا۔

"یار آدمی تو تم دبلے پتلے ہو مگر چھینک بڑے زور کی مارتے ہو۔" پہلے درویش نے اپنی خرگوش کی بالوں والی ٹوپی سنبھال کر کہا۔

"میرے حقے کی تو لگتا ہے چلم ہی بجھ گئی ہے۔" دوسرا درویش غصہ سے چلایا۔

"چھینک مارنے سے تو اچھا تھا کوئی شعر مار دیتے۔" تیسرا درویش جھرجھری لے کر گنجے سر کو سہلاتے ہوئے بولا۔ چوتھا درویش جو خود بھی اپنی چھینک کے زور سے کافی آگے نکل آیا تھا، واپس اپنی نشست پر آیا اور اپنی عینک اور چگی داڑھی کو ٹھیک سے جما کر بولا۔

"معاف کرنا دوستو۔ عرض کیا ہے:

جھانک کر جب اس نے چلمن ڈال دی
دیکھنے والے نے گردن ڈال دی"

شعر اتنا زوردار تھا کہ درویش پھڑک گئے۔ داد و تحسین کا شور بلند ہوگیا۔ خود پانچواں درویش بھی داد دینا چاہتا تھا کہ معاً اسے یاد آگیا کہ وہ تو چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہے۔ اس شور سے فارغ البال درویش کی آنکھ بھی کھل گئی جو اس دوران پھر خراٹے لینے لگا تھا۔ پہلے تو وہ گھبرایا کہ نہ جانے کیا مصیبت آپڑی ہے۔ مگر جب اسے بتایا گیا کہ یہ سارا شور ایک شعر کے لئے ہے تو بضد ہوگیا کہ مجھے بھی سناؤ۔ آخر چوتھے درویش نے مکرر ارشاد کیا۔ گنجے درویش نے پہلے تو فلسفیانہ انداز میں ہونٹ ٹیڑھا کر کے اور ماتھے پر بل ڈال کر شعر پر غور کیا پھر برا سا منھ بنا کر بولا۔ "بھلا یہ بھی کوئی شعر ہے۔"

چوتھے درویش نے دوبارہ اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔

"معاف کرنا یارو لگتا ہے مجھے ایک اور شعر سے قصہ سنانا پڑے گا، جس کا میری زندگی سے بھی تعلق ہے۔ عرض ہے:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

www.taemeernews.com

صاحبو! ناچیز کو خادم اردو کہتے ہیں اگرچہ کم ترین نہ کسی اردو اکادمی کا ممبر ہے نہ شاعر، نہ افسانہ نگار، نہ صحافی۔ پھر بھی فقیر بچپن سے ہی اس زبان کے عشق میں مبتلا ہے۔

عزیز و آپ کی ہی طرح احقر کو بھی کوچہ سیاست میں جاروب کشی اور گدائی کرتے کرتے مسند حکومت پر متمکن وجلوہ افروز ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن غلام نے اس عجوبہ روزگار زبان صدق لسان سے روگشی نہ کی۔ فدوی نے شب و روز خود کو اس کی خدمت میں متصرف رکھا۔ جب بھی عاجز پر افتاد پڑی اس زبان سے کی گئی محبت حقیر کے کام آئی اور خاکسار کو اس سے...''

''یار یہ تم کن لوگوں کا قصہ سنا رہے ہو؟'' بڑے سر والے درویش نے جو ذرا کم اردو فہم تھا چوتھے درویش کو ٹوکا۔

''یہ میرا ہی قصہ ہے عزیزم!'' چوتھے درویش نے صفائی دی۔

''تمہارا قصہ ہے تو یہ ناچیز، خادم، کم ترین، فقیر حقیر، غلام فدوی، عاجز، خاکسار...کون ہیں یہ سب حضرات۔'' تیسرے درویش نے پوچھا۔

''آہ میرے معصوم دوست! اتنا بھی نہ سمجھے۔ ان سب سے مراد بھی ہیچ مداں ہے!'' چوتھے درویش نے کہا۔

''ایں!؟ یہ ایک اور آ گیا۔ ہیچ مداں کون؟'' تیسرے درویش نے پھر پوچھا۔

''ہیچ مداں یعنی، بندہ، عاصی، خاطی، گنہگار...''

''یار تم سیدھی طرح قصہ کیوں نہیں سناتے۔ یہ ادھر اُدھر کی کیا ہانک رہے ہو؟'' پہلے درویش نے ڈانٹا۔ چوتھے درویش نے اپنی عینک اتار کر جیب میں رکھی اور دوسری جیب سے دوسری عینک نکال کر آنکھوں پر لگانے کے بعد بولا:

''دراصل دوستو، قصہ یہ ہے کہ میرا کوئی قصہ ہی نہیں ہے۔ ساری زندگی بغیر کسی قصے کے گزر گئی ہے۔ اگر کچھ قصہ ہے تو بس یہ کہ بچپن میں پیدا ہوا۔ جوانی میں بڑا ہو گیا۔ بڑا ہوتے ہی سیاست کا شوق چرایا اور اس شوق نے باقی کام بھی پورے کر دیے۔ کبھی وزیر بنا کبھی سفیر اور کبھی سفیر سے پھر وزیر۔ یہاں تک کہ حاکم اعلیٰ بھی بن گیا۔ سب شوق پورے ہوئے، کوئی ارمان باقی نہ رہا اور اب آپ لوگوں کے ساتھ اس غار گمنامی میں پڑا ہوں۔''

اتنا کہہ کر چوتھا درویش خاموش ہو گیا۔

''اور وہ اردو کا کیا قصہ تھا؟'' پہلے درویش نے پوچھا۔

''وہ دراصل یہ ہوا کہ خاتون مردانہ وار کی حکومت نے اردو زبان کو ترقی دینے کے لئے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ مجھے یہ زبان بہت راس آچکی تھی اس لئے کوشش کر کے میں اس کمیٹی کا صدر بن گیا۔ جلد ہی میں نے کمیٹی کی رپورٹ تیار کر لی جو میرے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور ہو گئی اور یوں میری شہرت ساتویں آسمان پر جا پہنچی۔ جب بھی اردو کی ترقی کی بات چلتی، سیمنار ہوتا، جلسہ کیا جاتا، کانفرنس منعقد کی جاتی، اس کمیٹی کا اور میرا ذکر بیچ میں ضرور آتا۔''

''پھر تو خوب ترقی ہوئی ہوگی۔'' گنجے درویش نے جو کہ اردو کیا ہندی سے بھی نابلد تھا، پوچھا۔

''ہاں بہت ترقی ہوئی۔ سفیر سے وزیر بنا اور وزیر سے حکمراں۔ یہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔''

''اُفوہ! بھئی میں تمہاری نہیں، زبان کی ترقی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ حاکم اعلیٰ بن کر تو تم نے اس کے لئے خوب کام کیا ہوگا۔'' تیسرے درویش نے جھنجلا کر پوچھا۔

''نہیں خیر، اس وقت تو مصروفیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ کوئی کام ہی نہ ہو پاتا تھا۔ البتہ اردو کا خیال مجھے روز رہتا تھا۔ روزانہ صبح کو دو منٹ اور رات میں تین منٹ اس کا خیال ضرور کر لیتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس سے کچھ ترقی ہو گئی ہو۔ بہر حال مجھے اس کا علم نہیں۔''

یہ لوگ اسی طرح کی باتیں کر رہے تھے اور ادھر پانچواں درویش پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ جب سب کے قصے پورے ہو گئے تو یہ لوگ اصلی بات کی طرف کیوں نہیں آتے۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور چھپنے کی جگہ سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔

www.taemeernews.com

اسے دیکھتے ہی کئی درویشوں کی چیخ نکل گئی۔ ایک درویش کی تو خوف سے گھگھی بندھ گئی۔

''یہ کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ؟ غار سے نکلنے کی ترکیب کیوں نہیں سوچتے؟ مولانا سائیکل سوار نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں سے نکلنے کا فارمولا آپ چاروں کے پاس ہے۔'' پانچویں درویش نے کہا۔

یہ سنتے ہی چاروں درویشوں کا خوف کسی قدر کم ہوا۔ ایک نے کہا۔''یا اخی آپ کی شکل جانی پہچانی لگتی ہے۔ کہیں آپ وہی بزرگ تو نہیں جو تیرہ زبانیں بولنا اور سترہ لکھنا جانتے ہیں!''

''بے شک میں وہی ہوں اور آپ جو دوسرے درویش ہیں، آپ کے بعد میں نے ہی پانچ سال تک حکمرانی کی تھی۔ جب کہ آپ میں سے کوئی ایک سال سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس حساب سے میں آپ سب سے زیادہ سابق حکمراں ہوں۔ لہٰذا اصولاً مجھے پہلا درویش ہونا چاہئے تھا۔ مگر خیر کوئی بات نہیں۔'' پانچواں درویش یہ کہہ کر چپ ہوگیا۔ پہلے درویش نے اپنے تینوں ساتھیوں سے مخاطب ہوکر کہا۔

''دوستو راز کھل گیا۔ اب ہمیں آپس میں انجان نہ رہنا چاہئے۔ آیئے اپنی اپنی جیبوں سے کاغذ کا وہ چوتھائی پرزہ نکال لیں جو اس چلتے پرزے، مولانا سائیکل سوار نے راستے میں دیا تھا۔''

اتنا کہہ کر پہلے درویش نے پانچویں درویش کی طرف رخ کیا اور یوں ہم کلام ہوا۔

''قبلہ آپ حیران نہ ہوں۔ دراصل جب میں اس غار میں اکیلا بھٹک رہا تھا تو مولانا سائیکل سوار مجھے راستے میں ملے۔ میں نے ان سے کچھ دیر کے لئے سائیکل مستعار لینا چاہی مگر انہوں نے اعتبار نہ کیا۔ کہا تو لے کر بھاگ جائے گا۔ میں نے کہا مولانا زیادہ ہوشیاری مت دکھایئے یا تو سائیکل دیجئے۔ ورنہ غار سے نکلنے کا راستہ بتایئے۔ تس پر انہوں نے اپنی قبا سے کاغذ کا ٹکڑا نکال کر مجھے دیا اور کہا کہ ایسے تین ٹکڑے باقی تین درویشوں کے پاس ہیں جو فلاں تاریخ کو درگاہ نوگزہ پیر پر جمع ہوں گے۔ بس وہاں جا کر چاروں ٹکڑے ملا لینا۔ تمہیں غار سے نکلنے کا نقشہ مل جائے گا۔''

''کمال ہے مجھ سے بھی مولانا نے یہی کہا تھا۔'' تیسرے درویش نے کہا۔ باقی درویشوں نے بتایا کہ ان سے بھی مولانا کا یہی کلام ہوا۔

اس کے بعد چاروں درویشوں نے اپنی جیبوں سے کاغذ کے ٹکڑے نکال کر جوڑ لئے اور نقشہ مکمل ہوگیا۔ نقشے میں کئی آڑی ترچھی لکیریں، دائرے اور تیر کے نشان بنے ہوئے تھے۔ ان کے بیچ میں جگہ جگہ عجیب الفاظ لکھے تھے۔ مثلاً گندی بستیاں، انہدام، مظاہرہ، اقلیتوں کے مسائل، اخباری بیان، فوٹو، ٹی وی کیمرہ...

نقشہ دیکھ کر چاروں درویش خوشی سے بغل گیر ہوگئے اور اس مرتبہ کسی نے غلطی نہیں کی۔ سب کے سب صحیح بغل گیر ہوئے۔ ٹوپی والے پہلے درویش نے نقشہ ہاتھوں میں لے لیا اور اسے آگے کی طرف پھیلا کر سب سے آگے چلنے لگا۔ تینوں درویش اس کے پیچھے ہولئے اور غار گمنامی سے نکلنے کے راستے کی تلاش میں چل پڑے۔ مگر پانچویں درویش کو ساتھ لے کر چلنے پر وہ راضی نہ ہوئے۔

اس پر پانچویں درویش نے آہ سرد بھر کر صبر کیا اور محفوظ فاصلے سے چاروں درویشوں کو نظر میں رکھ کر ان کے پیچھے چلنے لگا!

الحمدللہ! کہ قصہ پانچ درویش اس جگہ آکر خیریت سے تمام ہوا اور قارئین نے بالآخر اس سے نجات پائی۔ البتہ وہ قارئین جواب بھی یہ سوچ رہے ہیں کہ پانچویں درویش کا قصہ کہاں گیا، انہیں چاہئے کہ دوبارہ غور سے قصے کی قرأت فرمائیں! اتمت بالخیر۔

(جون2000)

☆......☆......☆

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

ویرپّن کا صوتی روزنامچہ

ویرپّن کا یہ روزنامچہ خادم کمترین و بے تمکین کو کسی طرح حاصل ہوا اس کا قصہ خاصا سبق آموز ہے، لہٰذا پہلے یہ سبق سن لیجئے۔ ہوا یہ کہ ناچیز حسبِ معمول، لال قلعہ کے پیچھے ہر اتوار کو لگنے والے کباڑی بازار کی سیر کررہا تھا کہ ایک کباڑی کے کباڑ میں ہاتھی دانت کی ایک پرانی ڈبیہ پرنظر پڑ گئی۔۔

آپ تو جانتے ہیں، پرانی چیزوں کا خادم کو کیسا خبط ہے۔ خواتین کو چھوڑ کر، دنیا کی ہر پرانی شئے اتنی حسین معلوم ہوتی ہے کہ جی چاہتے دیکھتے ہی اسے فوراً گھر لے جاؤں۔نئی خواتین کو دیکھ کر بھی بالعموم یہی خواہش ہوتی ہے مگر گھر میں ایک پرانی خاتون پہلے سے موجود ہیں،لہٰذا دل مسوس کررہ جانا پڑتا ہے۔بہر حال میں نے فوراً کباڑی سے ڈبیہ کے دام پوچھے تو کہنے لگا کہ اس ڈبیہ کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ میں نے پوچھا کیا؟ جواب میں میرا کان اپنے منہ کے قریب لاکر دھیرے سے بولا، جناب یہ جس ہاتھی کے دانت کی بنی ہوئی ہے اسے ویرپّن نے خاص اپنی بندوق سے ڈھیر کیا تھا۔

ویرپّن کا نام سنتے ہی میں گھبرا گیا اور مطلوبہ دام کسی حیل وجحت کے بغیر کباڑی کے ہاتھ پر رکھ کر ڈبیہ اٹھالی۔ تس پر کباڑی نے خوش ہوکر اپنے کباڑ میں سے ایک آڈیو کیسیٹ اٹھائی اور ایک آنکھ دبا کر بولا'' یہ ڈبیہ کے ساتھ مفت ہے۔ میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لیجئے۔''

میں نے سوچا کوئی پرانے فلمی گانوں کی کیسیٹ ہوگی۔مگر گھر جاکر اسے کیسیٹ پلیئر پر چلایا تو گانوں کی بجائے پلیئر سے عجیب طرح کی آواز آنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی شخص ٹین کے کنستر میں چھوٹے چھوٹے پتھر بھرکر زور سے ہلا رہا ہے۔ جب یہ آواز رکتی تھی تو پس منظر میں کتے، بلی، لومڑی اور گیدڑ وغیرہ کے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔

اتفاق سے اسی وقت عالم فاضل ہمارے بزرگ دوست ایم قمرالدین ادھر آنکلے جو اردو کے عالم شاعر اور سپریم کورٹ کے فاضل وکیل ہیں۔ اور باوجود اس کے کہ مدراس کے رہنے والے بہاری ہیں مگر اردو اس درجہ خوبصورت،نفیس اور نستعلیق لہجے میں بولتے ہیں کہ لکھنؤ والے بھی ان کی اور اپنی بغلیں جھانکنے لگیں کہ کہیں وہاں چھپ کر کوئی اور تو پلے بیک نہیں دے رہا اور یہ کہ وہ صرف ہونٹ ہلارہے ہوں۔

میں نے انہیں کیسٹ میں بھری ہوئی کھڑبڑ سنائی تو کسی قدر ناراض ہوکر بولے۔ میاں یہ کنستر میں ڈھیلے بھرے ہوئے نہیں ہیں۔کوئی شخص جنوبی ہند کی زبان بول رہا ہے۔ میں نے پوچھا یہ شخص کون ہے اور کس زبان میں کیا بول رہا ہے تو وہ غور سے سننے لگے۔

جیسے جیسے وہ سنتے گئے ان کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔ پھر اچانک سہمی ہوئی آواز میں بولے۔''حضرت یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ قبلہ ویرپّن صاحب مدظلہٗ العالی بہ نفسِ نفیس اپنے کلام معجز نظام سے مستفیض ومحظوظ فرمارہے ہیں۔'' میں نے کہا کہ ذرا ترجمہ کرکے اردو میں فرمایئے کیا کررہے ہیں؟ فرمایا۔'' بول رہے ہیں۔'' میں نے پوچھا کیا بول رہے ہیں تو بولے۔'' یہ ان کا صوتی روزنامچہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ 'ہاررز آف ڈراکیولا' مصنفہ برام اسٹوکر کے کردار ڈاکٹر جانسن کی طرح یہ بھی رات کو

www.taemeernews.com

اپنی روزمرہ کی روداد ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کرنے کے عادی ہیں۔ لہٰذا خدا آپ کو حفظ و امان میں رکھے مجھے اجازت دیجئے۔''

میں نے کسی طرح منت سماجت کر کے انہیں روکا اور کیسٹ میں بھری گئی باتوں کے اردو ترجمہ کے لئے بھی راضی کر لیا جس پر وہ اس شرط کے ساتھ آمادہ ہوئے کہ مترجم کے طور پر ان کا نام کہیں نہیں آئے گا کیونکہ ایسی باتوں کا ترجمہ کرنا بھی تعزیرات ہند کی دفعہ فلاں کی ذیلی دفعہ فلاں شق فلاں کے تحت قابل دست اندازیٔ پولیس جرم ہے۔

چنانچہ قارئین، خادم اس کا ذکر نہیں کر رہا ہے کہ اس روزنامچے کا ترجمہ کس نے کیا ہے اور آپ بھی کسی سے نہ کہئے گا کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ تعزیرات ہند کی دفعہ فلاں شق فلاں...مطلب یہ کہ آپ سمجھ گئے نا!

ایک بات اور۔ مترجم صاحب چونکہ وکیل ہونے کے علاوہ ایک شاعر بھی ہیں اس لئے انہوں نے خالص ادبی انداز میں خود اپنے مذاق اور لہجے کے مطابق ترجمہ تحریر کیا ہے۔ خیر۔ بہت تمہید ہوگئی۔ اب ویرپن کے صوتی روزنامچے کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

تین اگست سن دو ہزار: آج بڑی بوریت ہوئی۔ یہ منی کاتم نہ جانے کیسی کیسی فلموں کے ویڈیو کیسٹ لے آتا ہے۔ آج ایک ہندی فلم دیکھی۔ جو ہو بہو ایک تمل فلم کا چربہ تھی۔ جو اس جاپانی فلم سے کیا گیا تھا جس کا پلاٹ ہالی ووڈ کی ایک مشہور فلم سے اڑایا گیا تھا، جو ایک جرمن فلم سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی جس کو ایک روسی فلم کی طرز پر...... خیر۔ لاحول ولا قوۃ۔ مجھے اس سے کیا۔ (واضح ہو، لاحول اور اس قبیل کے دیگر الفاظ مترجم نے ترجمہ میں اپنی طرف سے شامل کر دیئے۔ امید ہے ویرپن صاحب برا نہیں مانیں گے)

اب تو میں فلمی گیتوں کی کیسٹس سن سن کر بھی بور ہو گیا ہوں۔ نئی فلموں کے گیت سن کر اور زیادہ کوفت ہوتی ہے۔ راج کمار صاحب بھی میرے خیال سے متفق ہیں (جنوبی ہند کے مشہور فلمی اداکار سیاست داں ان دنوں ویرپن کی قید میں تھے، اور اس پر پورے ملک میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔) اور ہاں آج وہ ٹیپ ریکارڈر بھی کمبخت خراب ہو گیا۔ لتا منگیشکر کا گانا بجاؤ تو ایس ڈی برمن کی آواز میں سنائی دیتا ہے (یہاں بھی مترجم نے اپنی پسند کے نام ڈال دیئے ہیں۔ اصل متن میں کچھ اور گویوں کے نام تھے) ادھر وی سی آر میں بھی کچھ گڑبڑ چل رہی ہے۔ یہ آج کل کے مکینک بالکل نکمے ہیں۔ اور منی کاتم جس مکینک کو پکڑ کر لایا تھا وہ تو بہت ہی نکما ہے۔ کوئی کام ٹھیک سے نہیں کرتا۔ جب کہ اسے منہ مانگی رقم دیتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے یہ شخص امپورٹڈ پرزے چوری کر کے لوکل پرزے ڈال دیتا ہے۔ جبھی یہ چیزیں آئے دن بگڑتی رہتی ہیں۔ میرا خیال ہے کسی اچھے تجربہ کار انیئر ایک انجینئر کو بنگلور سے اٹھوانا پڑے گا۔ آخر وہ ہندوستان کی سائبر کیپٹل ہے۔

پانچ اگست سن دو ہزار: راج کمار صاحب کے بارے میں آج ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ سوچ رہا تھا کہ ویڈیو کیمرے پر ایک نیا پیغام کروناندھی اور کرشنا (تمل ناڈو اور کرناٹک کے وزرائے اعلیٰ) کے نام ریکارڈ کراؤں اور دو چار نئے مطالبے اس میں شامل کر دوں۔ مگر پتہ چلا بیٹری ڈسچارج ہو چکی ہے۔ استغفراللہ (مترجم) اس قدر غصہ آیا کہ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ فوراً بندوق اٹھا کر ایک بکرا ڈھیر کر دیا۔ جب بھی غصہ آتا ہے یہی کرتا ہوں۔ پھر شام کو سب مل کر لکھنوی شامی کباب (مترجم کی پسند) کھاتے ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہوئی ہے کہ جیسے ہی میں نے بکرے پر گولی چلائی، بکرے سے پہلے راج کمار صاحب ڈھیر ہو گئے۔ میں بھی گھبرا گیا کہ گولی مغرب سے مشرق کی طرف کیسے مڑ گئی اور یہ تو میرا سارا کھیل ہی خراب ہو گیا۔ اب کیسے حکومت سے اپنے مطالبات منواؤں گا۔ تاہم یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کچھ ہی دیر میں راج کمار اٹھ بیٹھے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ گولی کہاں لگی ہے، ہڑبڑا کر اپنا جسم ٹٹولنے لگے۔ سب کو ہنسی آ گئی۔

میں نے ان سے کہا حضور، فلموں میں تو آپ درجنوں لوگوں کی فائرنگ سے بھی نہیں ڈرتے۔ سب کو اکیلے ہی ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ مگر یہاں... میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا

www.taemeernews.com

چھوڑ دیا۔ کہنے لگے۔ میاں فلموں میں گولیاں نقلی ہوتی ہیں۔ جب کہ یہاں لوکیشن بھی اصلی ہے اور گولیاں بھی۔ اس کے علاوہ فلموں میں اداکاری کرتے کرتے گولی کے دھماکے پر فوراً گر جانے کی عادت پڑ گئی ہے۔

خیر میں نے آٹھویں بار ان سے وہ سوال کیا جو میں آج کل روزانہ دس بیس مرتبہ ضرور پوچھ لیتا ہوں کہ یہاں جنگل میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ جواب میں گال پر (اپنے) بیٹھے ہوئے ایک مچھر کو مارتے ہوئے بولے۔ کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ یہاں تو میں بہت ہی مزے میں ہوں۔ بلکہ میری تو خواہش ہے کہ جتنا زیادہ وقت آپ کی رفاقت میں گزر جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ یہاں ہر طرف خاموشی، چین اور سکون ہے۔ جبکہ وہاں شہر میں ہر وقت مارا ماری، سیاست، فریب، دغا بازی، بے ایمانی، طرح طرح کی سازشیں، ہنگامے ہیں۔ سچ۔ یہاں آپ کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھنے کو مل رہا ہے۔

یہ باتیں انہوں نے کچھ ایسی معصومیت سے کہیں کہ مجھے ان پر یقین آ گیا۔ واقعی بیچارے ایک اچھے اور شریف انسان ہیں اور شریف آدمی ہی شرافت کی قدر جانتا ہے۔ بقول شخصے (مترجم):

ہما کو چغد کب پہچانتا ہے
قدر الو کی الو جانتا ہے

بس ان حضرت میں ایک ہی کمی ہے۔ مونچھیں نہیں رکھتے۔ اگر رکھتے تو لاجواب انسان ہوتے۔ ورنہ میں انہیں اور پہلے اغوا کر لیتا۔ میرا خیال ہے انہیں جنگل میں ابھی کافی دن رہنا پڑے گا۔ کیا ہی اچھا ہو جو وہ اس دوران مونچھیں بڑھالیں۔ بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ جنگل سے باہر نکلیں گے تو ان کی شرافت اور مسلّم ہو جائے گی۔ کل ان سے اس بارے میں بات کروں گا!

سات اگست سن دو ہزار: آج کا دن کافی مصروفیت میں گزرا۔ ٹیپ ریکارڈر پر کئی پیغام ریکارڈ کرائے۔ ڈھیروں آڈیو ڈاک اکٹھی ہو گئی تھی (جنگل سے باہر کی دنیا میں ویرپّن اپنے ضروری پیغام ہمیشہ آڈیو یا ویڈیو کیسیٹ میں ریکارڈ کر کے بھجواتا تھا اور اس کی کیسیٹیں میڈیا میں کافی مشہور تھیں) سب کا جواب دے دیا۔

ایک کیسٹ ضلع مجسٹریٹ کی آئی تھی۔ کئی روز سے کہہ رہا تھا فاریسٹ افسروں کا تبادلہ کئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ اوپر سے فوراً تبادلوں کا حکم آیا ہوا ہے۔ چنانچہ افسروں کی ایک فہرست اس سلسلے میں بنائی ہے ذرا ایک نظر اسے دیکھ لیجئے اور کس کا تبادلہ کہاں کرنا ہے بتا دیجئے۔ آخر آج اس کی فہرست کو ضروری اصلاح اور ترامیم کے بعد کیسیٹ کی شکل میں بھیج دیا۔

ایک اور کیسیٹ میں فاریسٹ افسروں کا میمورنڈم آیا پڑا تھا۔ یہ لوگ اپنے بھتے بڑھوانا چاہتے ہیں۔ سوچا آج اس کام کو بھی نپٹا دیتے ہیں۔ چنانچہ مختلف متعلقہ افسروں کو علیحدہ کیسیٹوں پر ضروری ہدایات و مشورے روزانہ کر دیئے۔ اور ایک کیسیٹ فاریسٹ افسروں کی تنظیم کے صدر اور سکریٹری کو بھی بھیج دی کہ گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کچھ کیسیٹیں میرے مداحوں کی بھی تھیں۔ آج کل میری فین میل (Fan Mail) کافی بڑھ گئی ہے۔ میرے زیادہ تر فین مجھے آڈیو ٹیپ پر ہی پیغام بھیجنا پسند کرتے ہیں۔ تاہم کچھ لوگ ویڈیو ٹیپ بھی بھیج دیتے ہیں۔ انہیں اخلاقاً ان ہی کی پسند کے مطابق ویڈیو کیسٹ پر جواب بھیجنا پڑتا ہے۔ اس طرح کل ملا کر آڈیو اور ویڈیو ٹیپ وغیرہ کا بجٹ ان دنوں کافی بڑھ گیا ہے۔ اگر یہ صوتی اور عکسی خط و کتابت اسی طرح بڑھتی رہی تو یہاں جنگل میں مجھے ایک ریکارڈنگ اور شوٹنگ اسٹوڈیو کھولنا پڑ جائے گا۔ یا پھر کسی ٹی وی چینل کی اوبی وین ہائی جیک کرانی پڑے گی۔

متی کا تم کو اسٹوڈیو والا آئیڈیا پسند آیا۔ کہنے لگا۔ اسٹوڈیو کھول کر خود اپنی فلمیں بنائیں گے۔ اتنے بڑے فلم ایکٹر راج کمار صاحب ہمارے پاس ہیں۔ ضرورت پڑی تو دو چار ہیروئنیں بھی اٹھوا لیں گے۔

میں نے کہا ہیرو کہاں سے آئے گا؟ تو کہنے لگا آپ کے ہوتے ہوئے کسی اور کی کیا ضرورت ہے۔

www.taemeernews.com

کبھی کبھی منی کا تم بڑی اچھی بات کہہ جاتا ہے۔ سن کر دیر تک طبیعت مسرور رہی۔

نو اگست سن دو ہزار: آج کل اخبار والے نہ جانے کیا اناپ شناپ چھاپ رہے ہیں۔ کچھ نے تو میرے جعلی انٹرویو تک چھاپ دیے ہیں۔ جبکہ سب جانتے ہیں کہ میں صرف نکھیرن کے گوپال کو انٹرویو دینا پسند کرتا ہوں۔ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ اس کی مونچھوں کا ڈیزائن مجھے پسند ہے۔ اگرچہ ہے تو میری نقل ہی، پھر بھی کچھ انفرادیت اس میں ضرور ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مونچھوں کے علاوہ مرد کی شخصیت میں کچھ بھی جاذب نظر نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو مجھے عورت ذات میں بھی اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ کئی بار یہاں جنگل میں آنے والی فلمی میگزینوں میں ہیروئنوں کی تصویروں پر میں نے قلمی مونچھیں بنا کر دیکھا اور پایا کہ مونچھ لگتے ہی بیشتر ہیروئنوں کا حسن دوبالا ہوگیا۔ یہاں تک کہ منی کا تم بھی انہیں دیکھ کر پھڑک گیا۔ اگرچہ اس میں ذرا سی بھی جمالیاتی حس نہیں ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مونچھیں ہیں تو سب کچھ ہے۔ مگر ادب میں مونچھوں پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس لئے میں ادب کم ہی پڑھتا ہوں۔ حد یہ ہے کہ شاعر بھی مونچھوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ میں نے آج تک کوئی عشقیہ گیت ایسا نہیں سنا جس میں ہیروئن نے اپنے محبوب کی مونچھوں کی تعریف کی ہو۔ ایک پرانا فلمی گانا ہے:

میرے محبوب میں کیا نہیں
بھولی صورت ادا ناز نیں

اس میں دو عدد خواتین اپنے محبوب کی مختلف صفات بیان کرتی ہیں، اور اس میں اپنے ہی جیسا نسوانی حسن ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ آنکھ، منہ، گال، بال سب کا ذکر کرتی ہیں۔ مگر مونچھوں کا کوئی حوالہ نہیں۔ منی کا تم نے بعد میں یاد دلایا۔ فلم کا محبوب مونچھ منڈا تھا۔ بہر حال، آج طبیعت کچھ حاضر تھی، مونچھوں پر چند شعر موزوں ہوگئے۔ عرض ہے:

تو میری مونچھ دیکھ کر مرا انتظار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

ایک اور شعر تھا:

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری مونچھیں جس کے چہرے پر پریشاں ہوگئیں

لیکن ایک تو منی کا تم نے کہا کہ یہ سنا ہوا لگتا ہے۔ دوسرے اس کے مصرع ثانی میں لفظ پریشاں سے پہلے ایک اور پر آ جانے سے پر پر کی تکرار قبیح پیدا ہوگئی ہے جسے عروض داں معیوب خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ اسے رد کر دیا۔

ایک مصرعہ تھا:

تیری مونچھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟

منی کا تم پھڑک گیا۔ پھر کچھ مشہور گیتوں کی اصلاح بھی کی۔ مثلاً، چولی کے پیچھے والا گیت بڑا ہی فحش تھا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ مونچھوں کے پیچھے کیا ہے؟ تو بات بھی شائستہ ہو جاتی اور سنسر کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اس طرح کچھ اور مکھڑے بھی سوجھے۔ مثلاً

تیری مونچھوں کی دیکھی جھلک جب سے
سیّاں لاگی نہ میری پلک تب سے

اور...

تیری مونچھ کی کیا تعریف کروں کچھ کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
کہیں بھول سے تو نہ سمجھ بیٹھے کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں

اور...

مونچھیں نہ مروڑو بلما نہ کرو موسے را آ آ آ آر...

یا...

مونچھوں ہی مونچھوں میں اشارا ہوگیا
بیٹھے بیٹھے جینے کا سہارا ہو گیا

وغیرہ وغیرہ۔

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ شاید گوپال کی بات چل رہی تھی۔ مجھے اس آدمی پر رشک ہونے لگا ہے۔ اخبار میں آیا ہے کہ میں نے

www.taemeernews.com

اس کے ہاتھ جو ویڈیو کیسیٹ کرشنا اور کرونا ندھی کے نام بھیجی تھی اس کی نقلیں تیار کر کے اس نے لاکھوں روپے میں بے لنکا کے ٹی وی چینل کو بیچ دی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ اس کی مونچھیں نقلی تو نہیں۔ کئی بار جی چاہا کہ کھینچ کر دیکھوں۔ مگر اخلاقاً گریز کیا۔ میں نے منی کاتم سے کہہ دیا ہے۔ سن ٹی وی والوں سے تحقیق کرے۔ اگر اخبار نے سچ لکھا ہے تو ٹی وی والوں سے رائلٹی وصول کرنی چاہئے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے آئندہ جب بھی کوئی ویڈیو کیسیٹ بھیجی جائے تو اس پر لکھ دیا جائے کہ کاپی رائٹ محفوظ ہے اور اگر کسی نے بلا اجازت اس کا کوئی حصہ اخبار یا ٹی وی میں استعمال کیا تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

پندرہ اگست: آج یوم آزادی تھا۔ اٹل جی کی تقریر ٹی وی پر دیکھی۔ کچھ مزا نہیں آیا۔ وہی گھسی پٹی باتیں وہی گھسا پٹا انداز۔ ایک دفعہ سر کو بائیں جھٹک دیا ایک دفعہ دائیں۔ جب جی چاہا کسی لفظ پر رک گئے۔ اب آپ بیٹھے رہیے اگلے لفظ کے انتظار میں۔ منی کاتم کہتا ہے۔ اس بیچ میں ٹی وی والے ایک بریک لے لیا کریں تو اچھا رہے۔ میرا تو خیال ہے ایک دو اشتہار اس درمیان دکھائے جا سکتے ہیں۔ پھر یہ حضرت مونچھیں بھی نہیں رکھتے۔ لگا تار ایک گھنٹہ کسی مونچھ منڈے کو دیکھتے رہنا سچ مچ ایک صبر آزما کام ہے۔ مجھے خلجان ہونے لگتا ہے۔ ان سے اچھی تقریر تو میں لال قلعہ پر چڑھ کر کر سکتا ہوں۔ کوئی موقع دے کر دیکھے۔

اس پر منی کاتم نے کہا۔ صاحب یہ راج کمار صاحب کے اغوا کی سیاست کامیاب ہوگئی تو آپ ایک کامیاب پولیٹیشین بن جائیں گے۔ اس کے بعد کیا پتہ لال قلعہ کا بھی موقع آ جائے۔

واقعی مجھ سے یہ سخت غلطی سرزد ہوئی کہ سیاست سے اب تک پرہیز کرتا رہا۔ تمل ناگروں کی حمایت اور آدی واسیوں کے حقوق وغیرہ کا خیال پہلے نہیں سوجھا۔ راج کمار صاحب جیسے صرف ایک شخص کو اغوا کر کے ہم نے دو صوبائی سرکاروں کو جھکا دیا۔ ایٹم بم بنانے والی حکومت کی ایسی سٹی پٹی گم کر دی کہ مغربی بنگال کے لئے تو لا اینڈ آرڈر کا رونا رو رہے ہیں مگر کرناٹک اور تمل ناڈو کے بارے میں اس کا کوئی وزیر کچھ نہیں بولتا۔ یہاں تک کہ جارج فرنانڈیز بھی جو کہ ہر معاملہ میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض جانتا ہے، چپ سادھے بیٹھا ہے۔ ہم نے صرف ایک آدمی کو قید کر کے سیکڑوں ٹاڈا قیدیوں کی رہائی کی بات منوالی۔ کاش چار پانچ سال پہلے یہ سلسلہ شروع کر دیا ہوتا تو آج میں پارلیمنٹ میں ہوتا۔ اور کون جانتا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے سے کینہ رکھنے والی یہ چھوٹی چھوٹی پارٹیاں مجھے ہی اپنی گٹھ بندھن سرکار کا پردھان منتری چن لیتیں۔

خیر، اب بھی کچھ دیر نہیں ہوئی۔ میں نے منی کاتم سے کہہ دیا ہے۔ بیٹا فکر نہ کر۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ تو بھی لال قلعہ پر چڑھے گا۔ حیرت اور خوشی سے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ کہنے لگا، میں؟ میں نے کہا، ہاں۔ ورنہ لال قلعہ کی فصیل پر میرے لئے چھتری پکڑ کر کون کھڑا ہوگا؟ اس کا چہرہ کچھ لٹک گیا۔ میں کافی محظوظ ہوا۔ میں جانتا ہوں، وہ کچھ اور سمجھا تھا!

اکیس اگست دوہزار: آج منی کاتم ایک بری خبر لایا۔ سپریم کورٹ نے عبدالکریم کی درخواست پر ٹاڈا قیدیوں کی رہائی روک دی ہے۔ خبر سن کر مجھے غصہ آیا چاہتا تھا کہ منی کاتم نے ٹوک دیا۔ کہنے لگا۔ ذرا سوچ کر اپنے ردعمل کا اظہار کریں۔ کہیں توہین عدالت نہ ہو جائے۔ میں سچ مچ ڈر گیا۔

دراصل اس ملک میں کسی سے مجھے ڈر لگتا ہے تو وہ سپریم کورٹ ہے۔ کیونکہ وہی ہے جو آج تک میرے کیا، کسی کے بھی قابو میں نہیں آیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اپنے ملک میں حق اور انصاف صرف سپریم کورٹ کی وجہ سے زندہ ہے۔ ورنہ پارلیمنٹ، پریس، پولیس سب کے سب اس کام میں فیل ہو چکے ہیں۔

اس لئے بڑی الجھن میں ہوں کہ اب کیا کیا جائے۔ بہت برے برے خیال آ رہے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ کیا کسی جج کو بھی اٹھوالوں؟ مگر یہ تو بہت بڑی توہین عدالت ہو جائے گی! اگر عدالت نے جنگل میں فوج بھجوادی تو؟

(ستمبر 2000)

☆......☆......☆

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

الوداع اے ماہِ رمضاں...

برسوں پہلے کے وہ شب و روز آج بھی یادوں میں محفوظ ہیں جب رمضان کا آخری ہفتہ آتے آتے روزہ داروں کے چہروں پر چمکنے والی پرنور نقاہت میں افسردگی کی بھی ایک لکیر نمایاں ہونے لگتی تھی۔ یہ احساس کہ بس اب چندروز میں سحر و افطار کا یہ سلسلہ منقطع ہوجائے گا لوگوں کو اکثر اداس کر دیا کرتا تھا۔ رمضان کی آخری سحری کی راتوں میں ہمارے پڑوسی ناظم علی خاں مرحوم کی میلاد پارٹی جب سہارنپور کی سڑکوں پر وداع نامہ گاتے ہوئے گزرتی تھی تو دل پر ایک عجیب ہی اثر ہوتا تھا۔

گہری سیاہ رات... آگے آگے کوئی بڑا سا پیٹرومیکس لیمپ کاندھے پر اٹھائے چل رہا ہے، اس کی روشنی میں ناظم خاں اور ان کے ایک خوش الحان دوست... غالباً راؤ مسرور خاں... میلاد کے نعتیہ کلام کا بڑا سا رجسٹر اٹھائے نعتیں پڑھتے ہوئے آہستہ قدموں سے آرہے ہیں اور ان کے پیچھے بیس تیس لوگوں کی ایک ٹولی لے سے لے ملا کر نعتوں کے مصرعے اٹھاتی ہوئی سڑک سے گزر رہی ہے... "یا نبی سلام علیک۔ یا حبیب سلام علیک۔ یا رسول سلام علیک۔ صلوات اللہ علیک..." سحری میں آنکھ کھلنے پر رات کی خاموشی میں دور سے آتی ہوئی ناظم خاں اور ان کے ساتھیوں کی سوز میں ڈوبی ہوئی آواز... "الوداع اے ماہِ رمضاں الوداع..."

سن کر دل جیسے غم سے بھر جاتا تھا۔

اور پھر آخری افطار کا منظر... بڑی سی سفید چادر پر افطاری سے سجا ہوا پُر بہار دسترخوان... روزہ کھولنے کے وقت کا اعلان کرنے والے گولے کے دغنے کا انتظار... اور اس انتظار پر غالب آجانے والا یہ احساس کہ کل سے یہ دسترخوان یوں نہیں سجے گا... سب ایک ساتھ بیٹھ کر افطار کے وقت کا انتظار نہیں کریں گے... عید کے چاند کی خوشی بھی کچھ کم سی ہو جاتی تھی... یہ باتیں تب کی ہیں جب کوئی مہمان آتا تھا تو دل خوش ہوتے تھے اور جاتا تھا تو آنسوؤں سے رخصت کیا جاتا تھا۔ آج اس سب کی فرصت کہاں۔ اور ہو بھی تو خیال کسے آتا ہے۔

ان دنوں کی بات ہی اور تھی۔ محمد رفیع کی آواز "... کرتا ہے ایک راوی دل سوز یہ بیاں... رمضان کے مہینے کی مشہور داستاں... ملک یمن میں لڑکا تھا اک آٹھ سال کا..."

مذہبی کتابچوں اور مسجد کے مولوی صاحب کی نصیحتوں سے کہیں زیادہ دل کو چھو لینے والے اس گراموفون ریکارڈ نے چھ سات سال کی عمر میں روزہ رکھوا دیا تھا... امی واقعی پریشان ہو اٹھی تھیں... "روزہ نہیں ہے فرض ابھی تجھ پہ میرے لال"...

لیکن بابو جی خوش تھے... دوپہر بعد تو پوری گلی میں خبر پھیل گئی... بابو عزیز کے لڑکے نے پہلا روزہ رکھ لیا ہے... ارے اتنی گرمی. اور اتنا دبلا پتلا سوکھا سا تو ہے... دلہن اسے گھر کے اندر ہی رکھو۔ باہر مت نکلنے دینا۔ اچھا... سو رہا ہے، چلو سونے دو بچا نامت...

مگر روزہ دار بچہ آنکھ میچے نہ صرف جاگ رہا ہے بلکہ اندر ہی اندر خود کو ڈانٹ بھی رہا ہے کہ بے وقوف، کیا ضرورت تھی شیخی بگھارنے کی! اب بھگت... گولا چھوٹنے میں پورے پانچ گھنٹے باقی ہیں۔ پانی تو خیر سحری میں خوب پیا تھا۔ عام دنوں سے دگنا، کہ رفیع صاحب بار بار یاد دلا رہے تھے... پانی بغیر پیاس سے خشک ہو گیا گلا ...کم سن تھا نازنین تھا چکرا کے گر پڑا...

اس لئے پیاس تو اتنی نہیں لگ رہی تھی۔ لیکن بھوک؟... سحری کے پراٹھے اور کھجلا پھینی، بند آنکھوں میں گھومنے لگتے تو خالی پیٹ جیسے درد کا آسمان بن جاتا تھا... بھوک کا درد... دنیا کا سب سے بڑا درد... بلکہ تمام دردوں کا مغلِ اعظم، جس کا علاج ہمدرد دواخانہ وقف کے پاس بھی نہیں۔ اور ایک گھنٹے بعد تو درد باقاعدہ آنسوؤں میں ڈھلنے لگا۔ دائیں ہاتھ کی آستین گیلی ہونے لگی... لیکن اس پدی سے بچے کی ہوشیاری ملاحظہ فرمایئے۔ جہاں کوئی کمرے میں داخل

www.taemeernews.com

ہوا جھٹ کروٹ بدل لی اور ایسے بن گئے جیسے کمبھ کرن کے بھی باپ ہوں...

آخر ''دوپہر ڈھل کے عصر کا جب وقت آ گیا''...

ملنے والے آنے لگے۔ جسے دیکھئے ہاتھ میں افطاری کا سامان لئے چلا آرہا ہے۔ عورتیں اندر کمرے میں آ آ کر روزہ دار بچے کی زیارت کرنے لگیں۔ اور زیارت ہی نہیں ہاتھ سے چھوتی بھی جاتیں۔ سر پر ہاتھ پھیرتیں... ہے ہے دیکھو تو کیسا مزے سے سو رہا ہے... ماشا اللہ... بڑا جی دار بچہ ہے تمہارا آپا امینہ... اب نور جہاں خاتون کو یہ کون بتاتا کہ جی دار بچہ دراصل مارے شرم کے دبکا پڑا ہے، ورنہ اس کا بس چلے تو کیسا روزہ کیسے رمضان اور کہاں کے محمد رفیع... سیدھا دوڑ کر باورچی خانے میں گھس جائے اور دو گھنٹے تک خود کو وہیں اندر سے بند کئے رکھے...

اوہو، تو اس والے نے روزہ رکھا ہے۔ میں تو اسے یوں ہی باؤلا سمجھتی تھی۔ یہ تو بڑا اللہ والا نکلا... وہ تو ٹھیک ہے مگر عصر کا وقت ہو چلا، اب اسے نماز کے لئے اٹھا دینا چاہئے... تم بھی کیا بات کرتی ہو رقیہ... ابھی سات آٹھ سال کا ہی تو ہے... ہاں بھئی بچوں پر نماز کہاں فرض ہے۔ ان کی نماز پڑھنا تو فرشتوں کے ذمے ہے... مگر یہ تو دیکھو، گرمیوں کا روزہ ہے۔ بی بی میں تو کہتی ہوں بچے کو درود شریف پڑھ کے شربت پلوا دو... بے چارا ننھی سی جان۔ اب تک تو اس کا روزہ قبول بھی ہو چکا ہوگا...

ننھی سی جان کو جان میں جان آتی سی محسوس ہوئی... آنکھوں میں بند آسمان سے شربتِ روح افزا کی برسات ہونے لگی...

نہیں بھئی، ایسا نہیں کرتے۔ ہمت والا بچہ ہے۔ بس ڈیڑھ دو گھنٹے کی ہی تو بات ہے... ہاں بھئی ہاں رقیہ باجی ٹھیک کہہ رہی ہیں... کہیں روزہ تڑوانے کا عذاب نہ گلے پڑ جائے...

ہمت والے بچے کے جی میں آیا کہ ابھی چھت پر سے کوئی ڈنڈا لاکر خالہ رقیہ کی کمر پر دے مارے... مگر جی مسوس کر رہ گیا۔

گھر میں آہستہ آہستہ اتنے لوگ آچکے تھے کہ کسی سے چھپ کر کچھ کھالینے کا بھی موقع نہیں تھا۔ بابو جی سہارا سا دے کر صحن میں لائے تو ہر طرف چارپائیاں بچھی تھیں جن پر سفید چادروں کے اوپر طرح طرح کی پلیٹیں، تھالیاں، سینیاں، رکابیاں اور ڈونگے ڈھکے ہوئے رکھے تھے... یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر پتہ نہیں کہاں سے پانی کے سوتے جاگ اٹھے اور خشک گلا کچھ ایسا تر ہوا کہ کھانسی کا پھندہ لگ گیا...

پھر ان تھالیوں اور ڈونگوں کا سامان ایک بہت بڑے دسترخوان پر سجایا جانے لگا تو جیسے آسمان چاند ستاروں سمیت زمین پر بچھ گیا۔ کیا ہے جو نہیں تھا... پھلکیاں، پکوریاں، پالک کے پکوڑے، آلو کی پکوڑیاں، شکر پارے، برفی، امرتی، جلیبیاں، نمک پارے، تلے ہوئے چنے، بھنا ہوا قیمہ، آم، امرود، خربوزہ، زردہ، پلاؤ، قورمہ، نان، کوفتے... کہاں تک یاد کیجئے... کچھ اپنے گھر کا، باقی سب دوسرے گھروں کا... روزے دار بچے نے اپنی ضد میں امی اور بابو جی کو پہلے سے کچھ تیاری، اور اول روزہ کشائی پر لوگوں کی باقاعدہ دعوت کرنے کا موقع ہی کہاں دیا تھا... لیکن لمبی سی گلی کے پڑوس نے اس کی ضرورت ہی ختم کردی... وہ گلی جس کی ناک خود اس کی لمبائی سے بھی اتنی زیادہ لمبی تھی کہ ہر گھر کے اندر کونے کھدرے میں چھپی خوشی یا غم کو بھی دور سے سونگھ لیتی تھی...

اس شام کب گولا چھوٹا، کیسے روزہ کشائی ہوئی، منھ اور معدے میں ذائقوں کی کیسی آتش بازیاں چھوٹیں... کچھ یاد نہیں... بس وہ گلی اور اس کا دسترخوان حافظے میں روشن ہے۔ روزہ دار بچہ آج دہلی شہر کے ایک عالیشان علاقے میں دوسری منزل کے فلیٹ نمبر 37 میں رہتا ہے جہاں اسے یہ نہیں معلوم کہ 36 نمبر میں کون مقیم ہے اور 38 نمبر میں کس کی رہائش ہے؟ ہر دروازے سے روزانہ کچھ چہرے باہر نکلتے ہیں، پھر پتہ نہیں کب ان ہی دروازوں کے پیچھے جاکر گم ہوجاتے ہیں۔ خیر...

اچھا تو میاں قبلہ محترم رمضان شریف صاحب، بہت سمع خراشی ہوئی۔ اب آپ خیر سے جائیے۔ آپ نے ہمیں خوش رکھا، خدا آپ کو خوش رکھے۔ زندگی رہی تو اگلے سال پھر ملاقات ہوگی۔ بس اتنی سی گزارش ہے کہ اس بار تشریف لائیں تو اللہ میاں سے کسی ایسی منزل یا فلیٹ کا پتہ ضرور لیتے آئیں جہاں چہرے اجنبی، دروازے نا آشنا اور کھڑکیاں گونگی بہری نہ ہوں... جہاں 36، 37 اور 38 سب ایک دوسرے کو جانتے ہوں... سب کے پاس ایک دوسرے کو جاننے کا وقت ہو... خدا حافظ... الوداع! الوداع!۔☆......☆

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

شادیاں، ناشادیاں...

شادیوں کے دعوت نامے آتے ہی مجھ پر گھبراہٹ طاری ہوجاتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ میں خود شادی شدہ ہوں، اور انہیں دیکھتے ہی مجھے خود اپنی شادی یاد آجاتی ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ شادیوں سے مجھے لگاتار بڑھتی ہوئی آبادی میں مزید اضافے کا خیال آجاتا ہے اور میں نتیجتاً عام زندگی کے اور مہنگا ہو جانے کے خیال سے گھبراجاتا ہوں۔ جی نہیں خدا کا فضل ہے میں کوئی سماجی دانشور وغیرہ نہیں ہوں جو ایسی فضول باتوں میں وقت ضائع کرتا پھروں۔ گھبراہٹ دراصل مجھے اس بھیڑ بھاڑ کے خیال سے ہوتی ہے جو شادی کی تقریباً ہر تقریب میں ملتی ہے اور جس کی وجہ سے اکثر شادی کی دعوتوں میں یہ ہوتا ہے کہ جب تک میرا نمبر آتا ہے تب تک سیخ کباب کی تمام پلیٹیں خالی ہو چکی ہوتی ہیں۔ ایسی شادیاں دولہا دولہن کے لیے خواہ کچھ بھی ثابت ہوں میرے لیے ناشادیاں بن جاتی ہیں۔

البتہ شادی کا دعوت نامہ لڑکی والوں کی طرف سے ہو اور دعوت رات کی ہو تو بات اور ہے۔ ایسی تقریبات میں بارات کے آنے سے پہلے اس کے طویل انتظار میں اور کھانا پینا نمٹنے کے بعد چائے اور کولڈ ڈرنکس کے ساتھ مختلف میزوں پر جو گفتگوئیں سننے میں آتی ہیں ان سے جی خوش ہو جاتا ہے۔

ابھی بارات کے آنے میں دیر ہے۔ گول اور چوکور میزوں کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھے ہوئے سنجیدہ اور صابر حضرات اپنے اپنے منہ لٹکائے مختلف موضوعات پر باتیں کرکے ایک دوسرے کی نامعلومات میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ایک جج صاحب اپنے دانش مندانہ فیصلوں کے قصے سنا رہے ہیں۔ ''آج کل مجرم بڑے شاطر اور بدمعاش ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر ہم بھی کچھ کم نہیں ہیں... ایک مرتبہ پولیس ایک ایسے شخص کا مقدمہ لائی جس نے کالے ہرن کا شکار کیا تھا اور مقتول ہرن جب ملزم کے گھر سے برامد ہوا تو اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا...''

''کیسے؟'' کسی نے پوچھا۔

''ملزم کو۔ اس کے ہاتھ ہرن کے خون میں رنگے تھے۔ اب یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہرن خواہ کسی بھی رنگ کا ہو اس کا شکار کرنا قانوناً جرم ہے میں نے ملزم سے پوچھا کہ کیا اسے جرم قبول ہے؟ اس نے کہا، جی ہاں۔ مجھے اس کی یہ بات اچھی لگی۔ پولیس کے سامنے اس نے جو اقبالیہ بیان دیا وہ بھی متاثر کرنے والا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں ایک غریب بے روزگار آدمی ہوں، بیوی بچے کئی روز کے فاقے سے تھے، تبھی غیبی مدد کی صورت میں ایک کالا ہرن گھر میں داخل ہوا اور میری بیوی کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ ہم اسے حیرانی سے دیکھنے لگے۔ تبھی وہ باورچی خانے میں داخل ہوا اور وہاں سے ایک چھری منہ میں دبا کر لے آیا۔ ہم میاں بیوی اس کی بات سمجھ گئے اور اسے ذبح کرکے ہرن کے کباب، ہرن کے کوفتے اور ہرن کے پسندے بنانے میں مصروف تھے کہ پولیس آگئی۔ پولیس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ ملزم کا یہ پہلا جرم ہے اور اس سے پہلے اس کے خلاف کوئی شکایت درج نہیں ہوئی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اسے باعزت بری کرنے کی ٹھان لی۔ پھر بھی فیصلہ سنانے سے پہلے اسے اپنے چیمبر میں بلایا اور پوچھا، یہ بتاؤ ذائقے میں کالے ہرن کا گوشت کیسا ہوتا ہے۔ اس نے جواب دیا، سفید ہرن کے مقابلے میں تھوڑا سا نمکین اور پیلے ہرن کے گوشت سے قدرے بہتر...''

''آپ نے درست فرمایا۔ آج کل کے مجرم پکے بدمعاش

www.taemeernews.com

ہوگئے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔" "ایک بزرگ کی رگ یادداشت پھڑکی۔" "کیا شریف مجرم ہوا کرتے تھے۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں سے شفقت، اور اکثر نماز روزے کے پابند۔ ایک مجرم تو ایسا دیکھا کہ تہجد باقاعدہ مسجد میں جا کر پڑھتا تھا۔ بعد میں مسجد کی گھڑی اور حجرے کے سامان کی چوری میں پکڑا گیا۔ آہ، کیا زمانہ تھا..."

"سچ کہتے ہیں۔" کسی نے ہاں میں ہاں ملائی۔" سیاست نے پورا سسٹم خراب کر دیا ہے۔ پچھلے ہفتے عدالت میں سیاسی بدعنوانی کے ایک مقدمے کی جرح سننے کا اتفاق ہوا۔ وکیلِ استغاثہ نے گواہ سے کہا، کیا یہ سچ نہیں کہ مقدمے کو بگاڑنے کے لیے آپ نے پچاس ہزار روپے لیے ہیں۔ گواہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ وکیل نے سوال دوہرایا، کیا یہ سچ نہیں کہ پچاس ہزار روپے لے کر آپ مقدمے کو کمزور کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ گواہ تب بھی باہر دیکھتا رہا۔ آخر جج نے اسے ٹوکا، جناب آپ سے کچھ پوچھا جا رہا ہے۔ اس بار گواہ متوجہ ہوا اور اس نے کہا، معاف کیجیے جج صاحب، میں سمجھا تھا یہ سوال آپ سے کیے گئے ہیں..."

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔" کسی نے پوچھا۔ جج صاحب کے کان کھڑے ہوگئے۔" لائف سینٹنس کا ترجمہ اردو میں عمر قید کیوں کیا جاتا ہے؟ ترجمہ ہونا چاہیے سزائے زندگی۔ یا پھر زندگی کی سزا۔ اس میں قید کہاں سے آگئی۔ اس حساب سے دیکھیں تو ہم میں سے جتنے لوگ بقیدِ حیات ہیں وہ سب کے سب عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں اور دنیا کا ہر شخص ایک لائفر lifer یعنی وہ مجرم ہے جسے تا زندگی قید کی سزا ہو چکی ہے..."

"واہ، کیا شاعرانہ خیال ہے۔ بلکہ فلسفیانہ، صوفیانہ اور حکیمانہ و احمقانہ وغیرہ بھی..." ایک صاحب نے رائے دی۔ جج صاحب خود بھی کھڑے ہوگئے۔ کسی نے ججوں کی ایمانداری کے قصے چھیڑ دیے۔ جج صاحب پھر بیٹھ گئے۔

"ایک نئے نئے وکیل کو بہت ہی مال دار موکل مل گیا۔" پہلا قصہ شروع ہوا" لیکن مقدمہ پیچیدہ تھا اور ثبوت بھی موکل کے خلاف تھے۔ وکیل کو یقین تھا کہ مقدمہ ہار جائے گا۔ اس نے موکل سے کہا کہ میں نے سنا ہے مقدمے کا جج آموں کا بڑا شوقین ہے تو کیوں نہ اسے اعلیٰ قسم کے سہارنپوری آموں کی پیٹی تحفتاً بھیج دی جائے۔ یہ سنتے ہی موکل نے سختی سے کہا، خبردار یہ حرکت بالکل نہ کرنا۔ جج صاحب بہت ایماندار واقع ہوئے ہیں۔ فوراً ہمارے خلاف فیصلہ دے دیں گے۔ کچھ عرصے بعد جج نے موکل کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ موکل نے خوش ہو کر وکیل سے کہا، دیکھا! تم آم بھیجتے تو مقدمہ ہار جاتے۔ وکیل نے کہا جناب میں نے آم بھیج کر ہی مقدمہ جیتا ہے۔ بس اتنی احتیاط رکھی کہ پیٹی پر آپ کی بجائے مخالف فریق کا بزنس کارڈ چپکا دیا تھا۔"

جج صاحب پھر اٹھنے لگے مگر لوگوں نے یہ کہہ کر بٹھا لیا کہ بارات آنے میں ابھی اور وقت لگے گا۔

"ایک جج صاحب نے تو ایمانداری کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔" کسی نے کہا اور کہہ کر چپ ہوگیا۔ لوگوں نے اصرار کیا، منت سماجت کی، یہاں تک کہ ایک دو نے تو باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر بھی درخواست کی کہ خدا کے لیے قصہ سنا دو مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور خاموش بیٹھا رہا۔ آخر ایک بزرگ باراں دیدہ و مردم گزیدہ نے کسی کے ہاتھوں کولڈ ڈرنک منگا کر اسے پیش کی تب اس نے لب کھولے اور یوں گویا ہوا۔" ایک مقدمے کی سماعت کے دوران جج نے دونوں فریقوں کے وکیل کو اپنے پرائیویٹ چیمبر میں بلایا اور کہا کہ دیکھو بھائی مقصود علی ایڈووکیٹ! تم نے اپنے حق میں فیصلے کے لیے مجھے پچیس ہزار روپے کی رشوت دی ہے۔ اور محمود علی ایڈووکیٹ صاحب آپ نے اپنے حق میں بیس ہزار روپے بھیجے ہیں۔ یہ کہہ کر جج صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا... اور میرا خیال ہے بارات آگئی ہے..."

میز پر شور مچ گیا۔ نہیں بھئی نہیں، یہ تو باہر کوئی لاؤڈ اسپیکر بجاتا گزرا ہے، آپ آگے سنائیے، جج نے جیب میں ہاتھ ڈالا، اس کے بعد کیا ہوا... جیب سے کیا نکلا... بتائیے بتائیے..."

"جج صاحب نے جیب سے پانچ ہزار روپے نکالے اور کہا۔ نہیں بھئی یہ لاؤڈ اسپیکر نہیں بارات ہے... آئیے چل کر دیکھتے ہیں..."

میز پر پھر شور مچ گیا۔ اُف وہ۔ حد ہوگئی۔ توبہ۔ لعنت۔

www.taemeernews.com

استغفراللہ۔ ہماری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔ لاحول ولا۔ بارات دیکھنے کا اتنا اتاولا پن تو خواتین میں بھی نہیں ہوتا۔جج صاحب نے جیب سے پانچ ہزار روپے نکالے ،اس کے بعد کہا۔خدا کے لیے جلد بتاؤ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں۔ ہاں ہاں، جلدی بتاؤ...

''جج صاحب نے پانچ ہزار روپے مقصود علی ایڈووکیٹ کے ہاتھ پر رکھے اور کہا کہ صاحبان اب دونوں طرف کی رقم برابر ہوگئی ہے لہٰذا میں...بھئی آپ کچھ بھی کہیں یہ بارات ہی ہے...لہٰذا مجھے...''

کسرتی بدن کے ایک صاحب اچانک اپنی کرسی سے اچھلے اور قصہ سنانے والے کو پیچھے سے دبوچ کر بولے،''قسم خدا کی، چاہے بارات آئے یا واپس جائے ، پہلے تمھیں بات پوری کرنی ہوگی۔ جلدی بتاؤ، آگے کیا ہوا...''

''ارے ارے میرا گلا تو چھوڑیے...اس کے آگے کچھ نہیں ہوا۔ جج صاحب نے صرف اتنا کہا کہ اب چونکہ دونوں طرف کی رقم برابر ہوگئی ہے،لہٰذا وہ مقدمے کا فیصلہ پوری ایمان داری سے کریں گے...''

اس مرتبہ جج صاحب واقعی اٹھ کر چلے گئے،اور کسی کے روکے نہیں رکے۔۔

ایک اور میز پر حالات حاضرہ کا ذکر ہو رہا ہے۔

''صاحب میں تو حالاتِ حاضرہ سے بالکل مایوس ہو چکا ہوں۔پرانے وقتوں کے حالاتِ حاضرہ پھر بھی غنیمت تھے۔ان پر تبصرہ کرنے میں مزہ آتا تھا۔خود میں بھی ریڈیو پر روز رات سوا نو بجے کی اردو خبریں چاہے قضا ہو جائیں لیکن نو پچیس پر خبریں ختم ہونے کے بعد جب اناؤنسر اعلان کرتا تھا کہ، اب آپ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ سنیے، تو پوری طرح ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔روزانہ تقریباً ایک سے حالات ہوتے تھے چنانچہ ایک سا ہی ان پر تبصرہ ہوتا تھا جس میں اکثر کسی سنہرے مستقبل کا ذکر کیا جاتا تھا۔مگر افسوس اس سنہرے مستقبل کے حالاتِ حاضرہ ابھی تک نہیں آئے۔ ویسے کوئی مجھے بتائے گا یہ مستقبل سنہرا ہی کیوں ہوتا ہے۔ نیلا پیلا لال یا ہرا کیوں نہیں ہوتا؟''ایک صاحب نے اپنی سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

''ہوتا کیوں نہیں۔رنگین مستقبل کا ذکر ضرور سنا ہوگا آپ نے۔ اس کے علاوہ بھی کئی شیڈز کے مستقبل ہوتے ہیں۔ روشن مستقبل، چمک دار مستقبل، تابناک مستقبل، اور ان کے مقابلے میں تاریک مستقبل، سیاہ مستقبل،خوف ناک مستقبل ۔ ماشاءاللہ سبھی طرح کے مستقبل ہیں اپنے یہاں۔اور یہ جو آج کل کے حالات حاضرہ ہیں، یہ بھی گزرے ہوئے کل کا مستقبل ہی تھے اور آنے والے کل کا ماضی ہو جائیں گے۔لہٰذا میرا نیک مشورہ یہ ہے کہ ہمیں آج کل کے موجودہ حالاتِ حاضرہ پر صبر کر لینا چاہیے!''دوسرے صاحب نے جو کسی اخبار میں کام کرتے تھے بنا سگریٹ بجھائے رائے دی۔

''بھئی آج کل کی تو بات ہی مت کیجیے۔آج کل جدھر دیکھیے ہر طرف بس مہنگائی، مظاہرے، کرپشن،مارا ماری،ٹریفک جام، سڑک حادثے، فحش اشتہار، فیشن ٹی وی... پتہ نہیں دنیا کدھر جا رہی ہے۔''تیسرے صاحب نے کولڈ ڈرنک ختم کر کے اظہارِ تشویش کیا۔

''جی ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کل رات ڈسکوری discovery پر دکھا رہے تھے کہ ہماری کائنات لگاتار کئی لاکھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے پھیل رہی ہے اور ہمارا نظام شمسی اپنی کہکشاں سمیت نہ جانے کس طرف دوڑا جا رہا ہے۔''

''اچھا!!...کس رفتار سے؟''

''تقریباً سات ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے۔یعنی ایک منٹ میں سوا چار لاکھ کلومیٹر۔یعنی یہ سمجھ لیجیے کہ اس رفتار سے اڑ کر آپ دو منٹ میں کم از کم چار بار چاند پر جا کر واپس آسکتے ہیں۔ یعنی...''

''اور بارات ابھی تک نہیں آئی ہے...''

''اف، خدا کی پناہ!''ایک صاحب نے سامنے رکھے خالی گلاس اور جگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور مضبوطی سے جکڑ کر بیٹھ گئے۔

''کیا ہوا، کیا ہوا؟''کسی نے پوچھا۔

www.taemeernews.com

''سنا نہیں آپ نے۔ کائنات پھیل رہی ہے۔ کہکشاں بھاگی جارہی ہے۔ نظامِ شمسی اُڑا جارہا ہے۔ زمین گھوم رہی ہے۔ اور وہ بھی ہزاروں لاکھوں میل فی گھنٹہ کی رفتار ہے۔ کہیں یہ کراکری نہ گر کر ٹوٹ جائے...''

''لوبھئی آخر بارات آہی گئی۔'' سامنے والے صاحب نے مطلع کیا۔ ''اب یہ لوگ وہاں نکاح کے لیے بنائے گئے اسٹیج پر بیٹھیں گے۔ مہر وغیرہ پر صلاح مشورہ ہوگا۔ قاضی صاحب کا انتظار کیا جائے گا۔ تب جاکر کہیں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں چھوہاروں کی نوبت آئے گی، اور ڈنر شروع ہوگا...''

''قاضی تو بارات والے اپنے ساتھ ہی لے کر آئے ہیں۔ وہ جو داڑھی والے صاحب ہیں، وہی قاضی ہیں...'' کسی نے بتایا۔

''میاں کیا غضب کرتے ہو۔ وہ دولہا ہے۔''

''ہائیں..تو کیا یہ اپنا نکاح خود پڑھائے گا..''

''اوفوہ میں نے کہا نا، یہ دولہا ہے۔ قاضی وہ رہا کرتے پاجامے میں جو بغل میں رجسٹر دبائے ہوئے ہے...''

''ارے... اتنا کم عمر قاضی۔ خود تو شادی شدہ ہے نا!''

''چہرہ نہیں دیکھا کیسی بے زاری ٹپک رہی ہے! صاف ظاہر ہے کہ شادی ہو چکی ہے۔ ارے صاحب میرے ممیرے بھائی کی خلیری بہن کا نکاح انہی حضرت نے پڑھایا تھا۔ تب انہیں خود ان ہی کے نکاح کی تقریب سے منت سماجت کر کے لایا گیا تھا..''

''واہ، انھوں نے تو اپنا نکاح خود ہی پڑھ لیا ہوگا!''

''جی ہاں، اور کیا! میں نے سنا ہے اپنے سسر صاحب سے اس مد میں اچھی خاصی رقم بھی وصول کر لی تھی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو جب میرے ممیرے بھائی کی خلیری بہن کے نکاح کے لیے لوگ انھیں بلانے گئے تو ان کا اپنے سسر سے نکاح پڑھانے کے نذرانے پر ہی جھگڑا چل رہا تھا۔''

''یہ ممیرے بھائی کی خلیری بہن آپ کی رشتے میں کیا ہوئیں؟''

''یہ تو شاید میں بھی ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ میری چچیری بہن کا پھپھیرا بھائی اُسے باجی کہتا ہے اور تایا زاد بھائی کے بہنوئی کے خسر رشتے میں اس کے ماموں ہوتے ہیں اس حساب سے وہ میری بیوی کے بھائی کی خلیری بہن کے پھوپھا کی ...''

''بس بس بس... سمجھ میں آگیا، سب کے سب بھائی بہن ہیں۔ یہ ڈنر نہ جانے کب شروع ہوگا۔ اب تو نیند سی آنے لگی ہے...''

''ارے ارے سویئے گا نہیں... سنا ہے کھانا بنانے والا خاص پرانی دلّی سے بلایا ہے جو استاد رحمت علی طباخ کا خلف الرشید بھی ہے...''

''کون... وہ ستار پہلوان؟''

''جی ہاں وہی...''

''ارے صاحب اس کی مت پوچھیے۔ بڑا ہی عجیب خانساماں ہے۔ کہتے ہیں ڈیڑھ سو قسم کی تو کھچڑی بنالیتا ہے۔ اس کے علاوہ طرح طرح کی بریانی، قورمے، نہاری، پلاؤ اور پسندے ایسے پکاتا ہے کہ کھانے والا دیکھتا رہ جائے۔ دماغ ایسا اختراعی پایا ہے اور ایسے عجیب عجیب کھانے ایجاد کر رکھے ہیں کہ آدمی نام سنتے ہی پھڑک اٹھے۔ لوکی کے کوفتے، دم آلو، بھیجا فرائی اور کلیجی گردہ تو آپ نے بارہا سنے اور کھائے ہوں گے، مگر ذرا اس کے کھانے ملاحظہ کیجیے۔ سہارنپوری طرز کے ایک پلاؤ کا نام رکھا ہے، عش عش پلاؤ۔ اسی طرح مٹن برڈ جیسی ایک ڈش کا نام ہے، ید طولیٰ گوسفند۔ جو بکرے کے اگلے پائے کو بھون کر بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ شوربہ حیات آفریں ہے جو بادام اور اخروٹ ڈال کر پکائے گئے ایک سوپ کا نام ہے۔ اسی طرح قیمہ لسان الصدق اور گوشہ رخسار جوش ہیں جو زبان اور کلّے کے گوشت سے بنتے ہیں۔''

''خوب۔ کہیں یہ حضرت ایران سے تو تعلق نہیں رکھتے؟'' سامنے والے صاحب نے پوچھا۔

''جی نہیں۔ دراصل انھوں نے طب یونانی کا ایک امتحان دیا تھا۔ امتحان میں تو خیر مریضانِ ملّت کی خوش قسمتی سے فیل ہو گئے،

www.taemeernews.com

اردو اخبار

قارئینِ کرام! اطلاعاً عرض ہے کہ اس وقت میں بڑے جوش میں ہوں۔ جی چاہ رہا ہے کسی سے لڑ بیٹھوں۔ اور اگر کوئی لڑنے کو تیار نہ ہو تو کسی کو پکڑ کر اس کی پر زور مخالفت اور مذمت کر دوں۔ یا پھر اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کسی مسئلے پر کوئی متنازعہ بیان ہی دے ڈالوں!

جی ہاں ! آپ نے درست اندازہ لگایا۔ دراصل میں ابھی ابھی ایک اردو اخبار پڑھ کر بیٹھا ہوں۔ اور اسی سے میری یہ حالت ہوئی ہے۔ ہمارے ملک میں اردو اخبار پڑھ کر مجھ جیسے کمزور دل قاریوں کا تقریباً یہی حال ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، رگوں میں خون تیزی سے سنسنانے لگتا ہے، کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگتی ہیں، آنکھوں میں ترمرے سے ناچنے لگتے ہیں، پھیپھڑے لوہار کی دھونکنی بن جاتے ہیں، اور وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اردو کے اکثر قارئین آپ کو بلڈ پریشر کی بیماری میں مبتلا ملیں گے۔ اردو کا اخبار پڑھتے ہی ہندوستانی قاری کے خون کا دباؤ اوپر نیچے ہونے لگتا ہے۔ جن کا 'لو' ہے ان کا 'ہائی' ہو جاتا ہے اور جن کا ہائی ہے وہ بالآخر قوم کے رہنما بن جاتے ہیں۔

سنا ہے عام طور پر لوگ خبریں پڑھنے کے لئے اخبار پڑھتے ہیں۔ لیکن اردو اخبارات کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ خبروں کے لئے اردو کا قاری بالعموم انگریزی یا ہندی کے اخباروں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اردو اخبار کی ضرورت اسے تب پیش آتی ہے جب اس کا علم ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ غیر زبانوں کے اخبار پڑھنے کے بعد باخبری کے بوجھ سے دبا، ہانپتا کانپتا قاری تھک کر اردو اخبار کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ جہاں بے خبری کے لطیف جھونکے اس میں توانائی کی ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں اور وہ سر سے علم کا سارا بوجھ اتار کر ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔

(ایک اخباری بیان ہو جائے، نمی دانم)

بلکہ فیل ہونے والوں میں بھی سرفہرست رہے۔ مگر طبی اصطلاحات اور ادویات کے نام ایسے دماغ سے چپکے کہ انھیں کھانوں سے بھی جوڑ دیا۔ مثلاً لہسن اور سرخ مرچ کی چٹنی کو ذرا سا تیل میں بھون کر اس کا نام رکھ دیا، حماد فلفل برشتہ۔ اسی طرح ایک کھٹا میٹھا شربت ایجاد کیا ہے جسے خواتین پسند کرتی ہیں، چنانچہ اس کا نام رکھا ہے عرق النسا۔ اس کے علاوہ کئی ایسی جدید اور مابعد الجدید ڈشیں ہیں کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مثلاً، بینگن کے لڈو۔ کریلے کی آئس کریم۔ لہسن کا حلوا۔ مٹن کی فیرنی۔ چکن کا مربہ۔ بس یوں سمجھئے کہ طباخی میں تجریدی یا abstract آرٹ اور جدید نثری نظم کا ذائقہ لینا ہو تو ستار پہلوان سے رجوع کیجئے۔''

''واقعی صاحب، کھانا بنانا بھی ایک زبردست آرٹ ہے۔ مجھے تو یہ آرٹ بہت ہی پسند ہے۔ اکثر دوسروں کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھاتا رہتا ہوں۔ اور جناب بہت اچھا کھانا تو مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے۔''

''تو کیا آپ خود کچھ بھی پکانا نہیں جانتے؟''

''نہیں خیر ایسا بھی نہیں ہے۔ انڈا ابال لیتا ہوں۔ نہانے کے لیے پانی گرم کر لیتا ہوں۔ ایک مرتبہ چاول بھی ابال کر دیکھے تھے جس کا بڑا خوش نتیجہ برآمد ہوا... یہاں تک کہ پڑوس میں بھی چاولوں کی خوشبو سے کھلبلی مچ گئی۔ اس دن پہلی بار معلوم ہوا کہ چاول اپنے کی خوشبو کو چراند کہتے ہیں، جو اکثر لوگوں کے دماغ پر چڑھ جاتی ہے ـــ وہ اول فول بولنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی پتہ چلا کہ چاول زیادہ اچھی طرح ابالے جائیں تو رنگ بدل لیتے ہیں۔''

''یعنی کالے پڑ جاتے ہیں...''

''کالے تو نہیں بس ذرا گہرے ارغوانی رنگ کے سیاہی مائل ہو جاتے ہیں... ارے ہاں، وہ لیجیے نکاح ہو بھی گیا۔ دعا چل رہی ہے۔''

''جی ہاں... اور اُدھر لوگ دعا ختم ہونے سے پہلے ہی کھانے کی طرف چل پڑے ہیں...''

''میرا خیال ہے ہمیں بھی اٹھنا چاہئے۔ ورنہ سیخ کباب ہاتھ نہیں آئیں گے...'' ■■

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

اُف یہ سفر نامے!

اردو میں رواج ہے کہ جب کوئی ادیب سفر کرتا ہے تو وہ ایک سفر نامہ ضرور لکھتا ہے۔اس طرح ادیب خود تو اردو میں سفر کرلیتا ہے لیکن پڑھنے والوں کو اس کی تحریر سے انگریزی میں سفر suffer کرنا پڑتا ہے۔یعنی اردو قاری کے لئے ادیبوں کے سفرنامے کل ملا کر سفر نامہ کم اور suffer نامہ زیادہ ثابت ہوتے ہیں۔جیسے جیسے سفر کی سہولتیں بڑھی ہیں اردو کے ادیب بھی خوب سفر کرنے لگے ہیں۔چنانچہ حال ہی میں ایسے سفرناموں کی تعداد میں یک لخت غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔کبھی کبھی سوچتا ہوں بے چارے اردو ادب پر نثری نظموں کا عذاب ہی کیا کم تھا کہ اب اسے سفر ناموں کی اذیت بھی جھیلنی پڑ رہی ہے۔جسے دیکھئے ریلوے اسٹیشن یا بس اڈے سے دوڑا دوڑا گھر واپس آئے گا اور سامانِ سفر رکھتے ہی سیدھا قاری کی گردن پر سوار ہو جائے گا۔اردو کا کوئی ادیب مجھے ایک ہفتے تک کہیں دکھائی نہ دے تو بالعموم یہ سوچ کر اپنے اوپر فاتحہ پڑھ لیتا ہوں کہ یا تو وہ کسی سفر پر ہوگا یا سفر سے واپسی پر اپنی شان میں سفر نامہ لکھ رہا ہوگا۔

ویسے ادیبوں کے سفر کرنے یا سفرنامہ لکھنے پر ذاتی طور سے مجھے کوئی اعتراض نہیں، بشرطیکہ وہ اتنے ہی مختصر ہوں جتنے عموماً اردو کے ادیب اور ان کے سفر ہوتے ہیں۔لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ادیب کی حیثیت تو بس اتنی مختصر ہوگی کہ اسے اس کی گلی یا محلے کی مشہور شخصیتوں میں شمار کیا جاتا ہوگا لیکن سفرنامے سے یوں لگے گا جیسے جرمنی سے لے کر روس تک، ٹورنٹو سے ہونولولو تک اور نیویارک سے ٹانگانیکا تک تمام اردو اور غیر اردو زبانوں کے ادیب ابھی تک بس اسی کی راہ تک رہے تھے۔سفر کے دوران ہر جلسہ مصنف کے اعزاز میں ہوگا، ہر سیمینار اس کی شرکت کے بغیر ادھورا تصور کیا جائے گا اور ہر یونیورسٹی، میوزیم، لائبریری اور اکادمی میں اس کی آمد پر خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔

اسی طرح سفر چاہے تین دن کا رہا ہو یا پانچ دن کا لیکن سفر نامہ اس قدر تفصیل و اطمینان سے لکھا جائے گا کہ قاری بے چارا خوش ہو کر یہ سمجھنے لگے گا کہ گویا مصنف نے عمر کا بڑا حصہ زندہ رہ کر گزار لیا ہے اور اب انشا اللہ بہت جلد داغ مفارقت دے کر وہ ادب کو باغ باغ کر جائے گا۔اس طرح سادہ لوح اردو قارئین کے جذبات سے کھیلنا میرے خیال سے ایک اخلاق سوز حرکت ہے جس کی ہم سبھی کو مذمت کرنی چاہئے۔

پھر یہ بھی ہے کہ سبھی سفرنامے بالعموم ایک جیسے ہوتے ہیں۔کردار اور مقامات بدل دیئے جائیں تو آپ ان میں حیرت انگیز مماثلت پائیں گے۔اللہ معاف کرے کئی بار تو مجھے جرمنی کا سفر نامہ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوا ہے جیسے یہ سفر اس سے پہلے روس میں بھی کیا جا چکا ہے۔اسی طرح ایک مشہور ادیب کا سفر نامہ پڑھتے ہوئے نہ جانے کیوں یہ مفسدانہ خیال بار بار آتا رہا کہ اس سے ملتا جلتا سفر ایک دوسرا مشہور ادیب بھی کر چکا ہے۔بس فرق یہ تھا کہ وہ صاحب اپنے گھر سے تانگے میں ریلوے اسٹیشن گئے تھے جب کہ ان حضرت نے رکشہ لیا تھا۔اور اسٹیشن پہونچنے کے بعد رکشہ والے سے کرائے پر تکرار بھی ہو گئی تھی۔یقین کیجئے کہ میں خود جب پہلی بار لندن گیا تو یوں لگا جیسے میں پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں۔ظاہر ہے یہ کسی سفرنامے کی ہی کرامات تھی۔

www.taemeernews.com

عام طور سے سفرنامے کے پہلے باب میں مصنف اپنے سفر کی غرض وغایت بیان کرتا ہے اور تفصیل سے بتاتا ہے کہ اسے سفر کی ضرورت کیوں پیش آئی اور کن حالات میں سفر کا پروگرام بنا۔ مگر ایک سفرنامہ میں نے ایسا پڑھا جس میں اس باب سے پہلے بھی دو باب تھے جن میں مصنف نے بار بار اختصار سے کام لیتے ہوئے بتایا تھا کہ کل کتنی بار اس کا نام لندن کے سفر کے لئے ایک ادبی انجمن کی جانب سے طے ہوا اور اس کے کن کن حاسدوں نے لندن کو ادیب کے قدومِ میمنت لزوم سے محروم رکھنے کے لئے کیا کیا سازشیں کی تھیں۔

ان ابواب کے بعد مصنف اتنی تفصیل اور جزئیات کے ساتھ ہوائی سفر کے انتظامات، ویزا اور ٹکٹ کے حصول وغیرہ کی داستان سنائے گا گویا وہ دنیا کی تاریخ کے آخری ہوائی سفر پر جا رہا ہے اور اس کے بعد حکومتیں ویزا جاری کرنے اور فضائی کمپنیاں ہوائی جہازوں کے ٹکٹ بیچنے کا سلسلہ موقوف کر دینے والی ہیں۔ قدرت نے صرف اس کی ذات پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کے لئے یہ روداد بطور یادگار چھوڑ جائے کہ پرانے زمانے کے عہدِ جدید میں لوگ ویزا اور ٹکٹ لے کر غیر ملکی سفر کیا کرتے تھے۔

ٹکٹ کے بعد ایک باب گھر سے ہوائی اڈے تک یا اگر شہر میں ہوائی اڈہ نہ ہو تو بس اڈے یا ریلوے اسٹیشن تک پہونچنے کے بارے میں لکھا جاتا ہے جو عموماً یوں شروع ہوتا ہے: ''...صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ کتے رات بھر بھونک کر تھک چکے تھے اور بجلی کے کھمبوں کے نیچے آرام فرما رہے تھے۔ لگتا تھا پوری سڑک سوگئی ہے۔ مجھے فیض کے مصرعے یاد آ رہے تھے:

سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
ڈھل گئی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
گل کرو شمعیں...''

تب اچانک اسے یاد آئے گا کہ ان میں سے کچھ مصرعے فیض کے نہیں ہیں۔ اس کے باوجود آگے چل کر بھی وہ سفرنامے میں بار بار مختلف اوقات پر فیض کے کئی اشعار غلط یاد کرے گا اور اکثر بے موقع فیض کی یا کسی اور کی شاعری پر بحث کرنے لگے گا تاکہ قاری کو یاد آ جائے کہ وہ ایک ادیب کا سفرنامہ پڑھ رہا ہے نتھو رام حلوائی کا نہیں۔

اگلے باب میں ہوائی سفر شروع ہوگا جس میں مصنف کو ایک یا دو خوب صورت ائر ہوسٹس لازمی طور پر اپنی جانب متوجہ، ملتفت و ملتفت کریں گی۔ ہوان سانگ اور ابن بطوطہ وغیرہ کے سفرناموں کو چھوڑ کر میں نے آج تک کوئی ایسا سفرنامہ نہیں پڑھا جس میں کم از کم ایک ائر ہوسٹس کا ذکر نہ ہو۔ اور اگر قاری کی بد قسمتی سے اس کی بغل میں (یہاں مصنف کی بغل سے مراد ہے) کوئی خاتون بیٹھی ہو تو سمجھ لیجئے مصنف ایک باب صرف اس بارے میں لکھے گا کہ کیسے وہ اس کی جانب دیکھ کر مسکرائی، جس پر اس نے اسے اپنے بریک فاسٹ میں سے ایک کیلا پیش کیا جسے اس نے نو تھینکس کہہ کر لوٹا دیا اور پھر کھڑکی کی جانب چہرہ گھما لیا، جس سے مصنف یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ خاتون کے دل میں اس کی پیش کش نے یقیناً جذبات کا ایک تلاطم پیدا کر دیا تھا، اور اپنے چہرے، بالخصوص رخساروں پر اچانک ابھر آنے والی سرخی کو چھپانے کے لئے، جو لازماً مشرقی نسوانیت سے تعلق رکھتی تھی، چہرہ دوسری جانب کر کے بیٹھ گئی تھی۔ جب ہوائی جہاز کے لینڈ کرنے کے بعد خاتون مصنف کی جانب دیکھے بغیر اپنی راہ چل دے گی تو مصنف کا ردِ عمل کچھ اس طرح کا ہوگا:

''...اس کے دل میں خیالات کی کشمکش اور احساسات کی لہروں کا طوفان موجزن تھا، وہ مجھ سے میرا پتہ لینا اور مجھے اپنا پتہ دینا چاہتی تھی، مگر ظاہر ہے اس کے اور میرے درمیان، اخلاق و تہذیب کے اور سماجی بندھنوں کے ہزار فاصلے حائل تھے... کیلا قبول کرنے سے اس کا انکار ان تمام فاصلوں پر محیط تھا۔ یہ انکار نہیں تھا بلکہ احتجاج تھا ان منفی سماجی قدروں کے خلاف جنہوں

www.taemeernews.com

مسلم ووٹ

''سنئے جناب والا، کیا کہتا ہے منادی والا۔

''منادی سنئے غور سے۔ پھر بات کیجئے کسی اور سے۔تمام اہالیانِ علاقہ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ کل بروز جمعرات عید گاہ سلائر ہاؤس کے قریب مسلم ووٹوں کی ایک بڑی منڈی لگے گی۔ اس منڈی میں بھانت بھانت کے مسلم ووٹ دیش کے کونے کونے سے پکڑ کر لائے جائیں گے۔ جو بہت ہی سستی دروں پر دستیاب ہوں گے۔ تمام گاہکوں، آڑھتیوں ٹھیکیداروں اور کمیشن ایجنٹوں کو دعوت عام دی جاتی ہے۔ ایسا موقع بار بار نہیں ملے گا۔ ایک بار منڈی میں ضرور آئیں اور عمدہ نسل کے صاف ستھرے صحت مند اور قول کے پکّے مسلم ووٹ کوڑیوں کے بھاؤ لے جائیں!''۔ (مسلم ووٹ برائے فروخت، نئی دانم)

نے انسانوں کی بے قدری کی ہے، انہیں تقسیم کیا ہے، انہیں تباہ و برباد کیا ہے...آج یہ سطریں لکھتے وقت میں چشمِ تصور سے دیکھ سکتا ہوں کہ وہ حسینہ جہاں بھی ہوگی، رہ رہ کر اُسے اُس یادگار ہوائی سفر کی یاد آتی ہوگی، اور ایک آہِ سرد کے ساتھ وہ اس کیلئے کو بھی یاد کرتی ہوگی جسے قبول کرنے کی راہ میں یہ سماج حائل ہو گیا تھا...آہ یہ ظالم، نالائق، نا ہنجار اور آوارہ پاجی سماج...لعنت ہے اس پر...آخ تھو!''

یاد رکھئے آگے بھی سفر میں جہاں جہاں مصنف کو خواتین ملیں گی وہ لازمی طور پر حسین و جوان ہوں گی اور بے تابی سے مصنف کی منتظر ہوں گی کہ کب دور دیس سے ایک شہزادہ آئے اور انہیں سفید گھوڑے پر بٹھا کر سپنوں کی دنیا میں لے جائے۔ سفر نامہ پڑھ کر آپ کو لگے گا گویا ہندوستان سے باہر کی خواتین کو اب سے پہلے کبھی کوئی مرد نصیب نہیں ہوا تھا اور یہ کہ اگر موصوف نے یہ غیر ملکی سفر نہ کیا ہوتا تو بے چاری بے مرد و بے مراد اس دنیا سے چلی جاتیں۔

ان میں کوئی کسی ہوٹل کی ریسپشنسٹ ہوگی اور سر سے پاؤں تک ان کا جائزہ لیتے ہی معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے انہیں نہ صرف خوش آمدید کہے گی بلکہ یہ بھی بتائے گی کہ وہ انہی کی منتظر تھی۔اب حالانکہ موصوف جانتے ہیں کہ یہ سب ٹریول ایجنسی کے انتظامات کا حصہ ہے، مگر انہیں اس کی دل کش مسکراہٹ کے ساتھ چمکتی ہوئی نگاہِ جمال میں اپنا ہی عکسِ جمیل فروزاں نظر آئے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کمرے میں جانے کے بعد دروازے کی ہر دستک کو اُسی خاتون کی آمد کا اعلان تصور کرتے رہیں گے۔

اسی طرح کوئی خاتون کسی تاریخی عمارت کی گائیڈ ہوگی جو اچانک انہیں دیکھتے ہی باقی سیاحوں کو چھوڑ کر دعوتِ سخن دیتی ہوئی ان کی جانب متوجہ جائے گی اور پھر کسی دوسرے سے بات نہیں کرے گی۔ واپسی پر وہ ہاتھ ہلا کر 'بائے' bye کہے گی تو اس میں بھی مصنف کو ایک 'ہائے' کی گونج سنائی دے گی۔ مصنف اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والے کئی پر ہجوم جلسوں کا ذکر بھی ضرور کرے گا جو دراصل اس کے رشتے داروں یا دوستوں کے گھروں پر مختصر سے ڈرائنگ روم میں دیئے گئے گھریلو لنچ یا ڈنر ہوں گے، اور جن میں چند ہمسایوں نے بھی شرکت کی ہوگی۔ لیکن مصنف ان کی روداد اسی طرح لکھے گا کہ:''...ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور حاضرین کی اگلی صف میں ایک خوب صورت جرمن لڑکی نہایت غور سے مجھے تقریر کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنے پیغام تھے۔ کئی بار چشمہ لگا کر بھی دیکھا مگر کوئی پیغام سمجھ میں نہیں آیا۔ ظاہر ہے وہ جرمن تھی اور مجھے جرمن زبان بالکل نہیں آتی...''

اس طرح کے سفرنامے پڑھنے کے بعد میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری وزارتِ خارجہ اردو ادیبوں کو غیر ملکی سفر کی اجازت دینے سے پہلے ایک عدالتی حلف نامہ داخل کرنے کا قانون کیوں نہیں بنا دیتی جس میں ادیب کی جانب سے یہ تحریر ہو کہ میں سفر سے واپسی پر نہ تو کوئی سفرنامہ خود لکھوں گا نہ کسی اور سے لکھواؤں گا۔ اور اس حلف نامے میں مصنف کے دستخطوں کی تصدیق کسی غیر ادیب معزز شخص سے کرائی گئی ہو!

☆......☆......☆

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

اکیسویں صدی کی اٹھنّی

حضرات آج میں یہ اعلان و اعتراف کر کے آپ سب کو خبردار کر دینا چاہتا ہوں کہ میری نیت ٹھیک نہیں ہے، اس لئے ذرا مجھ سے بچ کر رہیں۔ دراصل نیک تو میں آپ کو اس لئے نظر آرہا ہوں کہ کوئی اچھی سی بدی کرنے کا موقع مجھے ابھی تک نہیں ملا ہے۔ جو بھی موقع ملا وہ ایسا تھا کہ اس میں مجبور آدمی سوائے نیکی کے کچھ کر ہی نہ سکے۔ ابھی تک خاکسار کی ساری زندگی اکاؤنٹ پے ای (account payee) چیک کی طرح گزری ہے جو صرف متعلقہ کھاتے میں جمع ہوسکتا ہے۔ کسی اور طرح اسے بھنایا نہیں جاسکتا۔

چنانچہ دفتر میں قلم گھسایا، دماغ کھپایا اور جو کچھ بھی ادھار یا نقد کمایا، سب کا سب گھر کے چولہے میں ڈپازٹ کر دیا کہ بقول شاعر:

میں نے جو کچھ کھویا ہے سب اس کا تھا
میں نے جو کچھ پایا ہے سب اس کا ہے

اور اگر کوئی موقع چھوٹی موٹی بدی کرنے کا ملا بھی ہے تو وہ بدی اتنی بری، حقیر اور غیر معیاری تھی کہ اسے کرنے کے خیال سے ہی طبیعت مکدر ہوگئی۔ مثلاً ایک بار سائیکل رکشا سے پرانی دہلی کے ایک بس اسٹینڈ پر بس پکڑنے کے لئے اترا تو سڑک پر ایک اٹھنّی پڑی ہوئی ملی۔

جی چاہا کہ فوراً اٹھالوں اور سچ پوچھئے تو لوگوں کی نظر بچا کر وہ چمکتی ہوئی اٹھنّی اٹھا بھی لی مگر ایک شخص پہلے ہی تاک رہا تھا۔ اٹھنّی اٹھانے کے بعد جیسے ہی اس سے آنکھیں چار ہوئیں، اس نے حقارت سے ناک سکوڑی اور ''ہنہ'' کہہ کر منھ پھیر لیا۔ تبھی ایک نابینا فقیر بھیک کا کٹورا بجاتا وہاں سے گزرا۔ میں نے عزت بچانے کے لئے جھٹ وہ اٹھنّی اس کے کٹورے میں ڈال دی۔ مگر صاحب وہ بھی بابا کا پہونچا ہوا فقیر تھا۔ کم بخت نے کٹورے میں سے اٹھنّی واپس نکالی، میرے ہاتھ پر واپس رکھی اور یہ کہہ کر چل دیا کہ: ''رکھ لیجئے بابو جی۔ کام آئے گی!''

کام آئے گی!؟ میں حیرت سے سوچنے لگا۔ واقعی اٹھنّی اب اکیسویں صدی میں کہاں کام آتی ہے۔ چونّی اٹھنّی تو بیسویں صدی کی یادگاریں ہیں۔ جب چوتھی پانچویں میں پڑھتا تھا اور ایک بار ان دنوں کا مقبول ترین گانا ''دل کی کہانی رنگ لائی ہے، اللہ دہائی ہے دہائی ہے...'' بآواز بلند گاتے ہوئے میں گھر کے سامنے والے چوک کے آخری سرے پر نالے کے اوپر سے کودا تھا تو دوسری طرف ایک اٹھنّی مٹی میں دبی ہوئی دکھائی دی تھی۔ غریب بچپن نے اسے اٹھا کر مٹھی میں دبالیا اور گھر والوں کے لاکھ منع کرنے پر بھی اس اٹھنّی سے تیسرے درجے میں نہ صرف 'مغلِ اعظم' دیکھ آیا بلکہ انٹرول میں ایک آنے کی چاٹ بھی کھائی۔ اس لئے کہ وہ بیسویں صدی کی اٹھنّی تھی۔ اکیسویں صدی کی نہیں جس نے اس روز ایک فقیر کے ہاتھوں بے عزتی کرادی تھی۔

ایک مرتبہ یوں ہوا کہ پنواڑی سے پان لیا اور جب باقی رقم واپس لے کر چلا تو پایا کہ اس نے بھول سے پانچ کا ایک نوٹ زیادہ دے دیا ہے۔ دل نے کہا۔ میاں موقع ہے۔ تھوڑی سی بدی کرلو اور چپ چاپ چلتے بنو۔

مگر دل کے اندر جو ایک اور دل ہوتا ہے نا! کم بخت وہ آڑے آگیا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے ڈانٹ دیا کہ: ''ابے او نامعقول۔ بس یہی بدی ملی تھی کرنے کو؟ لعنت ہے تجھ پر۔ آخ تھو!''

www.taemeernews.com

میں نے رومال سے منہ صاف کر کے پنواڑی کی زیادہ دی ہوئی رقم اسے واپس کر دی۔ پنواڑی نے خوشی خوشی رقم واپس لے کر مجھے فوراً یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ اس کے باقی سب گاہک اول درجے کے چور اور بے ایمان ہیں اور ایک میں ہی ایماندار گاہک آج تک اسے ملا ہوں۔ اس کے بعد وہ دیر تک میری تعریف کے پل، اور کئی ایکسٹرا پان باندھتا رہا اور پھر بڑی سی پڑیا تھما کر بولا: ''میری طرف سے یہ پانچ پان اور رکھ لیجئے اور ان کے پیسے بعد میں دے دیجئے۔ دیکھئے، انکار نہ کیجئے گا...''

وہ تو اپنی طرف سے اصرار کرتا رہا اور میں اپنی ایمانداری پر ہزار لعنت بھیجتے ہوئے دل ہی دل میں یہ حساب لگاتا رہا کہ تعریفوں کے اس پل اور پڑیا کی کتنی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

چنانچہ پیارے قارئین آج میں پوری نیک نیتی سے اپنی بدنیت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ اس دیش میں اب تک جو بڑے بڑے گھوٹالے ہوئے ہیں، مثلاً توپ گھوٹالا، چینی گھوٹالا، چارہ گھوٹالا، تہلکہ گھوٹالا وغیرہ... تو ان میں سے کسی میں بھی میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے اور اسی بات کا آج مجھے سب سے زیادہ دکھ ہے۔

آپ یقین کریں۔ اگر بوفورس توپ سودے کے وقت میں بھی کسی طرف سے سودے کی بات چیت میں شامل رہا ہوتا تو آج میرے بھی سوئس بنکوں میں کئی اکاؤنٹ ہوتے۔ سی بی آئی کی فردِ جرم میں میرا بھی نام ہوتا۔ اخبارات کے سرورق پر قتروچی اور مرحوم ون چڈھا کے ساتھ اس کم ترین کی تصویر بھی شائع ہوتی اور میں بھی کسی اونچی منڈیر پر چڑھ کر بصد غرور پوری دنیا سے کہہ سکتا ہے:

آج ہمالہ کی چوٹی سے پھر ہم نے للکارا ہے
دور ہٹو اے دنیا والو ہندوستان ہمارا ہے

اسی طرح جناب اشوک سنگھل، جناب مہنت اویدیہ ناتھ اور جناب پروین توگڑیا سے میرے تعلقات خوش گوار ہوتے تو رام مندر کے نام پر دنیا بھر سے آنے والے اربوں روپے کے چندے میں بندے کے ہاتھ بھی کچھ لگ گیا ہوتا۔ لیکن مجھ نا عاقبت اندیش نے ہمیشہ ان سے اپنے تعلقات خراب رکھے اور وہ بھی اس طرح کہ ان حضرات کو اس کی بھنک تک نہیں پڑی ہوگی کہ کھچڑی پور کالونی میں ایک شخص ان سے تعلقات خراب کئے بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے بے چاروں کو تعلق کی خبر ملتی تبھی تو ترکِ تعلق کا علم ہوتا۔ مجھ سے تو جناب اتنا بھی نہیں ہوا کہ کسی دن خود ہی ان کے پاس چلا جاتا۔ اپنا تعارف کراتا اور مطلع کر دیتا کہ جناب عالی میں آپ سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا کیونکہ میں آپ کے سخت خلاف ہوں۔ اس سے کم از کم وہ لاعلمی میں تو نہ رہتے۔ اور کیا عجب ہے کہ وہ ڈر کر مجھے کھچڑی پور بلاک بی جے پی کا جوائنٹ سیکریٹری ہی بنوا دیتے۔

اور تو اور مجھ نالائق نے جارج فرنانڈیز اور مدھوکوڑا سے بھی رسم و راہ نہ کی۔ کر لیتا تو بھلے ہی آج جارج صاحب کی جائداد کا دعویدار نہ بن پاتا کم از کم کوڑا صاحب کے کروڑ دو کروڑ تو ہاتھ لگ ہی جاتے۔

مگر آہ اے قارئین! لگتا ہے بدی اور بدعنوانی اس کم نصیب کی قسمت میں نہیں ہے۔ قلم گھستا آیا ہے، قلم ہی گھستا رہے گا اور اس دنیا میں بلا عنوان آیا تھا، بلا عنوان چلا جائے گا۔ بدعنوان ہونے کا قدرت موقع ہی نہیں دے گی۔ چنانچہ اب آپ ہی سے التجا ہے۔ آس پاس کوئی گھوٹالا ہو رہا ہو یا ہونے والا ہو، یا کوئی دور دراز کا اسکینڈل آپ کے علم میں ہو جو ہنوز جاری ہے تو از راہ کرم فوراً اس کی اطلاع دے کر غریب کی مدد فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ واضح ہو۔ خط و کتابت صیغۂ راز میں رکھی جائے گی۔ یقین کیجئے اگر یہ حقیر فقیر بے تقصیر کسی طرح پر تقصیر بننے میں کامیاب اور کسی اسکینڈل میں شرکت سے سرخ رو ہو گیا تو اطلاع دینے والے کا حصہ، بے ایمانی مکمل ہونے پر ایمانداری سے گھر پہنچا دیا جائے گا۔

نوٹ: مطلوبہ حصے کی شرح فیصد بھی چاہیں تو پیشگی لکھ دیں۔ تاہم خیال رکھیں کہ یہ 100 فیصد سے زائد نہ ہو۔ ناچیز پہلے ہی اپنی نیکیوں کے طفیل دریا برد ہونے کے نزدیک ہے۔☆

www.taemeernews.com

نمی دانم

نصرت ظہیر

منشی ثنا احمد صبر و عصر مرحوم

جہاں تک مجھے یاد ہے ابنِ انشا مرحوم نے اپنی لاجواب تحریروں میں کم از دو جگہوں پر مغربی اتر پردیش کے شہر سہارنپور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس شہر کی دو چیزیں بڑی مشہور ہیں۔ ایک یہاں کے آم اور دوسرا منشی ثنا احمد صاحب کا دیوانِ صبر و عصر، جس کا نام ہے 'بہارِ بے نظیر'۔

مجھے سہارنپور کی جن ہستیوں کو اُن کی زندگی میں دیکھنے پر فخر ہے ان میں شیخ مختار فلم ایکٹر، شاہ نور خاں کاتب اور بھورے ماسٹر ٹیلر اینڈ سنز کے علاوہ ایک نام منشی ثنا احمد صبر و عصر کا بھی ہے۔ چوتھائی صدی سے اوپر کا عرصہ ہوا، انہیں ایک ٹوٹے پھوٹے اور رفتہ رفتہ آپ ہی آپ منہدم ہوتے ہوئے ایک مکان میں نہایت ضعیفی کے عالم میں دیکھا تھا۔ بان کی بُنی کھرّی چارپائی پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ عمر پچھتّر کو پار کر چکی تھی۔ بصارت اور سماعت نے جواب دے دیا تھا۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا سوائے استاد عبدالقیوم شاعر کے جو اُن دنوں ساقی تخلص کرتے تھے، اور جو باقاعدگی سے ان کی خدمت کے لئے آتے رہتے تھے۔ نہ کوئی آمدنی تھی نہ ذریعۂ معاش۔ کئی جسمانی اور روحانی تکلیفوں میں مبتلا تھے۔ مگر مفلسی اور حالات کی چکّی میں پستے ہوئے بھی مشقِ سخن جاری تھی۔ کوئی بھولا بھٹکا ملنے چلا آتا تھا تو اُسے اپنا حال بعد میں تازہ اشعار پہلے سناتے تھے۔

ان کے مکان کے ڈیوڑھی میں جب میں داخل ہوا تو وہ استاد قیوم کو ڈانٹ رہے تھے۔

''ارے عبدالقیوم۔ کبھی کوئی ڈھنگ کا شعر بھی کہہ لیا کر۔ کیوں شاعری کا نام بدنام کر رہا ہے۔''

''اچھی بات ہے استاد۔ کوشش کروں گا۔'' استاد عبدالقیوم یقین دلا رہے تھے۔ اس دوران میں منشی جی کے پائنتی رکھے ایک اسٹول پر جا بیٹھا تھا، مگر ضعفِ سماعت و بصارت کے سبب انہیں میرے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔

''...اور دیکھ، اِس جدید وِدید شاعری کے چکّر میں ہرگز مت پڑیو۔ ایسی شاعری ہرگز مت کیجو جس سے استاد شاہ نصیر اور خاقانیٔ ہند استاد ذوق کی روح کو تکلیف پہونچے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجو کہ حشر کے روز جدید شاعروں کی مغفرت نہیں ہونے والی ہے۔ سب کے سب پکڑے جائیں گے۔'' استاد کا بیان جاری تھا کہ بوڑھی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے: ''بھئی یہ کیا رکھا ہے یہاں حقہ سا؟''

''حقہ نہیں استاد بچّہ ہے۔ آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے اور آپ سے ملنے کا مشتاق ہے۔'' استاد قیوم نے بتایا۔

''بھئی معاف کرنا میاں، بوڑھا ہوں ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا۔ اور سناؤ کیسے ہو۔ کچھ شاعری وغیرہ کرتے ہو یا...''

''جی بس ایسے ہی کچھ ٹوٹے پھوٹے مصرعے نکال لیتا ہوں۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''اصلاح کس سے لیتے ہو؟'' منشی جی نے کان پر ہاتھ رکھ کر میری بات سننے کے بعد پوچھا۔

''جی، کسی سے نہیں۔''

''کیا کہا...'' منشی جی نے کان پر ہاتھ رکھا۔ استاد قیوم نے بلند آواز میں میرا جملہ دوہرا دیا۔ سنتے ہی جیسے منشی جی اور ان کی چارپائی کو ساتھ ساتھ جھٹکا لگا۔ ''ہائیں۔ شعر کہتے ہو اور کسی سے

www.taemeernews.com

اصلاح نہیں لیتے۔یعنی بے استادے ہو!؟''

''جی ہاں۔''

''استغفراللہ۔میاں کچھ معلوم بھی ہے۔جو شخص کسی کو استاد بنائے بغیر شعر کہے تو سمجھو سیدھا اللہ میاں سے ٹکر لے رہا ہے۔بے استاد شاعری فقط اُس ذات باری کو زیب ہے۔انسان بے استادی کی راہ پر چلا تو سمجھو ابلیس اس کی رہنمائی پر ہے۔نیکی کے فرشتے اس کے قریب نہیں پھٹکتے۔اس لئے بہتر ہے کہ جلد سے جلد کسی کو استاد بنالو اور کفر سے بچو۔''انہوں نے کہا۔پھر دائیں طرف منہ کر کے استاد عبدالقیوم سے مخاطب ہوئے:''ارے عبدالقیوم!ابھی میرا خیال ہے کہ فی الحال اس لڑکے کو تم اصلاح دے دیا کرو۔بے چارہ کہیں جدیدیوں کے چکر میں پڑ کر عاقبت نہ خراب کر بیٹھے۔''

مگر قیوم بائیں طرف تھے۔چنانچہ اُدھر ہی سے بولے:''بہتر ہے استاد۔''

''اوفوہ تم اِدھر ہو۔''انہوں نے بائیں طرف گردن گھما کر کہا۔''نچلے تو بیٹھ ہی نہیں سکتے۔دیکھو اصلاح دینے میں تساہل کبھی نہ برتنا۔نو آموز شاعروں کو اصلاح دینا بڑے ثواب کا کام ہے۔''

''بجا ہے استاد!''

ایسے تھے منشی ثنا احمد صاحب۔کلاسیکی دور کی اردو شاعری کے آگے ان کے لئے ہر طرح کی شاعری جدیدیوں کی شاعری تھی۔حد تو یہ کہ ترقی پسندوں کو بھی وہ جدید یا ہی سمجھتے تھے اور یوں اپنی دانست میں انہوں نے اُس وقت کے سوویت یونین اور امریکہ کو ایک ہی پلڑے میں تول کر اپنا دشمن بنالیا تھا۔اس سب کے قطعِ نظر اُن کے لئے شاعری ہی اوڑھنا اور شاعری ہی بچھونا تھی۔شاعری وہ اس طرح کرتے تھے جیسے کوئی صوفی عبادت کرتا ہے۔دنیا کی تمام باتوں سے بے پرواہ۔نہ انہیں کھانے پینے کی فکر رہتی تھی نہ پہننے کی۔جو مل گیا کھالیا جو میسر آگیا پہن لیا۔نہیں تو صبر کر کے گزار دی۔دنیا دار صرف اس قدر تھے کہ کبھی کبھی پوچھ لیتے۔''آج کل وزیر اعظم کون ہے؟''یا زیادہ سے زیادہ اتنا کہ ''پاکستان میں کس کی حکومت چل رہی ہے۔''کسی نے بتایا کہ پاکستان کا وزیر اعظم آج کل فلاں ہے لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ حکومت کس کی چل رہی ہے تو اس پر بھی تعجب نہیں کیا۔صرف اتنا کہنے پر اکتفا فرمایا کہ''ہاں میاں بعض وزیر نکتے بھی نکل جاتے ہیں۔مغلوں میں بارہا ایسا ہو چکا ہے۔''غرض منشی ثنا احمد نے کبھی اپنی فکر نہیں کی۔نہ کبھی کسی کے آگے اپنا رونا رویا۔یوں ہی چپ چاپ اس دنیا سے چلے گئے۔اخبار میں بھی خبر نہیں چھپی۔

ان کا دین وایمان فقط شاعری تھی۔اور شاعری بھی ایسی ویسی نہیں۔سنگلاخ زمینوں،ادق مضامین اور دماغ چکرا دینے والے صنائع بدائع کی شاعری۔صنعتِ رقطا،فوق النقاط،تحت النقاط،واسع الشفتین،واصل الشفتین،اور دیگر متعدد صنعتوں کی شاعری،جس سے دیوانِ صبر وعصر بھرا پڑا ہے۔

جب میں نے پہلی بار ابوالبقا منشی ثنا احمد صبر وعصر کا نام سنا تو یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوئی کہ حسن لال بھگت رام اور کلیان جی آنند جی فلم موسیقاروں کی طرح کیا اب شاعروں کی بھی جوڑیاں پیدا ہونے لگی ہیں۔اور جب حقیقت کا علم ہوا تو ویسی ہی شرمندگی ہوئی جیسی بہت بعد میں سیٹھ مگن بھائی چھگن بھائی تیل والا سے ملاقات پر ہوئی۔انہیں بھی میں دو سیٹھ سمجھا تھا۔

دو تخلص رکھنے کا بھید دیوانِ صبر وعصر پڑھنے پر کھلا جس کا تاریخی نام'بہار بے نظیر'(1380 ہجری)تھا اور جو برقی پریس دہلی سے 1961 عیسوی میں شائع ہوا۔منشی جی نے یہ مجموعہ بڑی کاوشوں سے اور بعض لوگوں کے بقول اپنی تمام جمع پونجی بیچ کر طبع کرایا تھا۔ان کا خیال تھا کہ دیوان طبع ہوتے ہی ادبی دنیا میں ان کی دھوم مچ جائے گی،لوگ مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے،شاعری میں انقلاب آجائے گا،جدیدیوں کے منہ پر خاک اڑنے لگے گی..مگر افسوس ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔دیوان صبر کی ہزاروں جلدیں بوریوں میں بند پڑی رہیں اور اس کے وہ صفحات جن پر منشی جی کا تمام فن تقریباً چھ سو غزلوں کی صورت میں بکھرا ہوا تھا

www.taemeernews.com

چوہوں کی خوراک بنتے رہے۔

منشی جی شاہ نصیر، ذوق دہلوی، اور داغ دہلوی کے سلسلے کے شاعر تھے۔ چنانچہ ان کے یہاں سنگلاخ زمینیں بھی ہیں فلسفیانہ مضامین بھی اور زبان کی شوخیاں بھی۔ کہیں تصویر سے آگے بڑھ جا شمشیر سے آگے بڑھ جا، شراب درتہہ آب شباب درتہہ آب، کباب میں سانپ شراب میں سانپ، ساغر ہمہ تن گوش پتھر ہمہ تن گوش، آرام پسِ پشت الزام پسِ پشت اور بیاباں دوچار مسلماں دوچار جیسی مشکل اور سخت زمینیں ہیں تو کہیں، فانوس ومنحوس، ابروصبر، افلاک وادراک جیسے مشکل قوافی ہیں، تو کہیں، وہ نہیں میں کہ جو حوروں سے بہل جاؤں گا/ جستجو میں تری جنت سے نکل جاؤں گا، اور، صبر سجدوں سے جی نہیں بھرتا/ اس جبین نیاز نے مارا، جیسے خوب صورت اشعار ہیں۔ کہیں، دامِ بلا ہیں یار کے گیسو/ فرق نہیں ہے بال برابر، جیسی زبان کی شوخیاں ہیں تو، کہیں، بھاگوں تو جب ہو طاقتِ رفتار پاؤں میں/ زنجیر زندگی ہے گراں بار پاؤں میں، جیسی فلسفیانہ ادائیں ہیں۔لیکن اس مجموعے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عروض کی کتابوں میں جن جن صنائع بدائع کا ذکراب تک آیا ہے ان میں منشی جی کی کم از کم ایک مکمل غزل ضرور موجود ہے۔ اس نوع کی کوئی دوسری کتاب ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ مستقبل میں کبھی گزرے تو گزرے۔ مگر شاید میں اس سے وہ عقیدت نہ رکھ پاؤں جو مجھے منشی ثنا کی کتاب سے ہے!

مرزا غالب نے اپنے لئے دو تخلص استعمال کئے تھے۔ اسد اور غالب۔ میاں عبدالقدوس سے جو بڑے بھاری غالب پرست ہیں میں نے میں نے ایک بار پوچھا تھا، کیوں صاحب، اس میں کیا حکمت تھی؟ بولے، مرزا کی شاعری اتنی بڑی ہے کہ صرف ایک تخلص اس کا وزن نہیں اٹھا سکتا تھا۔ لیکن دیوانِ صبروعصر پڑھ کر معلوم ہوا کہ مرزا بھی یقیناً صنائع بدائع کی شاعری کا قصد رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ ایک تخلص تو انہوں نے ایسا رکھا جس میں نہ اوپر کوئی نقطہ ہے نہ نیچے اور نہ ہی زبان سے اس کی ادائیگی پر ہونٹ ملتے ہیں۔ جب کہ دوسرے تخلص میں اوپر نیچے دونوں طرف نقطے ہیں اور بولنے پر ہونٹ بھی مل جاتے ہیں۔ یہی حکمت عملی منشی ثنا احمد صبروعصر کے تخلصوں میں تھی۔ فرق بس اتنا رہا کہ غالب تو صنائع بدائع کی شاعری میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکے جب کہ منشی جی کا توسنِ قلم اس میدان میں خوب قلانچیں بھرتا پھرا۔

یوں تو منشی جی نے ہر صنعت میں ایک دو غزلیں ضرور کہیں لیکن صنعتِ رقطا میں جو غضب انہوں نے ڈھایا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس صنعت میں ایک حرف بے نقطہ اور دوسرا نقطہ دار ہوتا ہے اور یہ ایسی مشکل صنعت ہے کہ عروض کی کتابوں میں بھی اس کی مثال میں صرف ایک شعر ملتا ہے۔ اس کا بھی دوسرا مصرع کہتے ہیں کہ غلط ہے۔ منشی جی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس میں انہوں نے ایک دو نہیں پورے سات اشعار کی غزل کہی ہے، جس کا مطلع بڑا صاف اور برجستہ ہے:

میری ہی طبع پر یہ تعب ہے عتاب ہے
آخر یہ بات کیا ہے مجھی سے حجاب ہے

اب کچھ اور صنعتیں لیجئے۔ غیر منقوط، یعنی وہ صنعت جس میں مصرعے کا کوئی لفظ نقطہ دار نہ ہو۔ منشی ثنا کا شعر دیکھئے:

ڈر رہا اللہ کا اعمال کا کردار کا
وسوسہ ہر دم رہا دل کو مالِ کار کا

فوق النقاط، جس میں کسی لفظ میں نقطہ زیریں نہ آئے:

دل ہما را ہر طرح عاشق ہوا دل دار کا
ناز کا انداز کارفتار کا گفتار کا

تحت النقاط، جس میں کسی لفظ کے اوپر نقطہ نہ آتا ہو:

جبر پر مائل اگر دل بر ہوا
سب وہ مجھ پر یا مرے دل پر ہوا

واصع الشفتین وہ صنعت ہے جس میں پڑھنے پر ہونٹ نہیں ملتے۔ منشی جی کی غزل کا شعر ملاحظہ ہو:

عشق سی شئے اور کرے حاصل یہ انساں خاک کا
دیکھئے کیا ہے جگر اس کے دلِ صد چاک کا

www.taemeernews.com

اسی طرح صنعتِ واصل الشفتین ہے جس میں ہر لفظ پر ہونٹ ملنے چاہئیں۔ منشی ثنا فرماتے ہیں:

رب اکبر تمہیں انعام مروت بخشے
بانٹئے مہر و محبت کبھی احباب میں بھی

مفرد الحرفین بھی صنعت رقطا جیسی ہی کٹھن صنعت ہے۔ اس میں مصرعے کے ہر لفظ کا ہر حرف جدا ہونا چاہئے:

آرزوئے روح اے دل دار آ
روک درد و آہ وزاری اب ذرا

صنعت واصل الحرفین بھی ٹیڑھی بلکہ بہت ہی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ٹیڑھی یوں کہ اس صنعت کا ایک شعر میں نے ایک کاتب صاحب کو کتابت کرنے کے لئے دیا تھا تو وہ ایک مصرع لکھتے لکھتے ہی ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ احتیاطاً میں نے انہیں دوسرا مصرعہ لکھنے سے روک دیا کہ آدھے شعر میں ٹیڑھے ہو گئے ہیں تو پورے شعر پر کہیں ڈھیر ہی نہ ہو جائیں۔ بہر حال یہ صنعت وہ ہے جس میں ہر مصرعے کو قلم اوپر اٹھائے بغیر لکھا جا سکتا ہے۔ ذرا منشی ثنا احمد کا یہ شعر اپنے ہاتھ سے خود لکھ کر دیکھئے:

خلقتنےمجھےعتیقسمجھا
تمنےنہکبھیشفیقسمجھا

دیوانِ صبر و عصر میں، جس کے تاریخی نام 'بہار بے نظیر' سے اس کی اشاعت کا سال برامد ہوتا ہے، صنعتِ واصل الحرفین کی یہ سات شعری غزل، کسی نہایت سخت جان کاتب نے اسی طرح ٹیڑھے ہو کر کتابت کی اور آخر اپنے انجام کو پہونچا۔ ایک عقل مندی حضرت نے یہ کی ہر ٹیڑھے مصرعے کے نیچے اُسے سیدھا کر کے بھی لکھ دیا کیونکہ ظاہر ہے غریب قاری ان مصرعوں کو بیٹھ کر، لیٹ کر، آڑا ترچھا ہو کر بلکہ قلابازیاں کھا کر بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ چنانچہ آپ کے لئے بھی مصرعوں کو سیدھا کیا جاتا ہے، تاکہ آپ شعر کو سمجھ کر اپنی بے زاری کا اظہار کر سکیں:

خلقت نے مجھے عتیق سمجھا
تم نے نہ کبھی شفیق سمجھا

ایک اور صنعت، ذوالِلسان ہے جس کا شعر بیک وقت دو زبانوں میں سمجھا جا سکے۔ منشی ثنا نے اس میں جو اشعار کہے ہیں وہ بیک وقت اردو اور فارسی دونوں میں یکساں سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کا مطلع ہے:

قیامت اے نگاہِ یار کردی
کہ ہر ہستی جگر افگار کردی

غالب نے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس صنعت میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا ایک مطلع ہے:

شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا

بس، آیا اور آید پر موصوف اٹک گئے ورنہ پوری غزل اس صنعت میں آجاتی۔ کسی نے پوچھا اس شعر کا مطلب کیا ہے۔ کسی اور نے کہا، بڑا سیدھا سا مطلب ہے۔ بتِ مشکل پسند کو شمار سبحہ مرغوب آ گیا ہے اور وہ بیک کف بردن صد دل کا تماشہ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔ یہ سن کر اول الذکر آستین چڑھا کر کفِ افسوس ملنے لگا کہ اتنی سیدھی سی بات اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی تھی۔

خیر، اس طرح کی اور صنعتیں بھی ہیں۔ مثلاً صنعتِ موصّل، جس میں کسی لفظ کا کوئی حرف مفرد نہ ہو، جیسے محبت، تعلیم وغیرہ۔ خیفا، جس میں ایک لفظ نقطہ دار اور دوسرا بے نقطہ ہو۔ بااستثنائے عطف و اضافت، جس میں قافیہ مذکر اور ردیف مونث ہو جیسے، پیمانہ آتی ہے، مستانہ آتی ہے۔ یا برعکس ہو، جیسے صورت آتا ہے، قسمت آتا ہے۔

ایک بڑی ہی پرلطف صنعت کا نام اتنا خوب صورت ہے کہ انسان سنتے ہی جھومنے لگے۔ استخراجِ قافیۂ جدید از اندرونِ قافیہ۔ اس میں قافیے سے نیا قافیہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے معنی بدلنے کے علاوہ شاعر کا اپنا قافیہ بھی تنگ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی صنعتِ رقطا کی طرح ایک مشکل صنعت ہے جس میں منشی ثنا نے

www.taemeernews.com

بڑے مزے کے شعر نکالے ہیں:

منزل ہے دور رو نہ دلِ زار زار زار
ہمت نہ دیکھ عشق میں زنہار ہار ہار
روتا ہوں یادِ زلف میں جب میں سیاہ بخت
کرتی ہے دامن اپنا شب تارتارتار
محشر میں پھر ملے گی مجھے زندگی یہی
کیونکر اٹھاؤں گا یہ گرانبار بار بار
کالی بلا ہے گیسوئے شب رنگ کا خیال
اس سانپ کو تو اے دلِ بیمار مار مار
ہنستا ہوں دل ہی دل میں میں اے صبر کیا کہوں
کہتا ہے مجھ کو وہ بتِ عیار یار یار

ایک اور غزل کا شعر ہے:

اک دن گیا جو دیر سے کعبے میں برہمن
بولا پہن کے جامۂ احرام رام رام

(نوٹ: پہلے مصرعے میں دیر کو تاخیر کے معنوں میں نہ پڑھیں)

صنعتِ ذو بحرین میں بھی (جس میں ہر مصرعے کو دو بحروں میں پڑھا جاسکے) منشی ثنا نے ایک غزل کہی ہے۔ مطلع ہے:

ساتھ اشکوں کے مرا دل بھی مگر آ ہی گیا
میری آنکھوں میں لہو بن کر جگر آ ہی گیا
جستجو والے کو کیا ہے جو یہاں ملتا نہیں
ڈھونڈنے نکلے تھے ہم تیرا بھی گھر آ ہی گیا

اسے آپ، 'فعل فعلن فعل فعلن فعل فعلن فاعلن' کی گردان پر بھی پڑھ سکتے ہیں اور 'فعل مفعول مفاعیل فعولن فعلن' کی لَے پر بھی۔

مگر آہ! اب یہ فنی قلابازیوں والی صنائع بدائع کی شاعری قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔ بقول میاں عبدالقدوس، تُف ہے آج کے شاعروں پر جو اس صنعتی دور میں بھی صنعتی شاعری نہیں کرسکتے!

نامعلوم

ایک شخص بڑا ہی زبردست قول باز ہے۔ جن نامی گرامی دانش ور حضرات کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے ان سب نے مل کر بھی اتنے اقوال نہیں کہے ہوں گے جتنے اس ایک شخص نے تن تنہا کہہ ڈالے ہیں۔ اس پر ستم یہ ہے کہ ہزاروں دانش ورانہ قول کہنے کے باوجود زمانے نے کبھی اس کی قدر نہیں کی۔ اور سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ اس کا نام بھی کسی کو معلوم نہیں۔ اس شخص کے ہر قول کے آگے بس ایک ہی لفظ لکھا ملتا ہے۔ نامعلوم۔ یہ نامعلوم شخص کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے، کہاں تک پڑھا ہوا ہے، اس کی پارٹی کیا ہے، نظریہ کیا ہے، مذہب کیا ہے، رنگ اور نسل اور وطنیت و قومیت کیا ہے کوئی کچھ نہیں جانتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ شخص قول ہی نہیں کہتا، شاعری بھی کرتا ہے۔ اور شاعری میں بھی اس کا تخلص وہی ہے۔ نامعلوم۔ اردو کے پرانے رسالوں میں عموماً آپ نے اس کے اشعار پڑھے ہوں گے۔ ہر شعر ایسا برجستہ کہ آدمی سنتے ہی پھڑک جائے۔ اس کے باوجود آج تک اُسے کسی مشاعرے میں نہیں بلا گیا۔ ہمارے لال قلعے کے تاریخی مشاعروں میں ہر ایرے غیرے، سفارشی نتھو خیرے کو اسٹیج پر بلا لیا جاتا ہے مگر اس شاعر کو آج تک دعوتِ سخن نہیں دی گئی جس نے اب تک ہزاروں حاصلِ غزل اشعار کہہ دیے ہوں گے۔ ہمارے اس دانش ور فلسفی شاعر کی بے قدری کا عالم یہ ہے کہ اس پر کوئی کتاب لکھنا تو دور کی بات ہے آج تک کسی کو ایک مضمون تک لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی، جب کہ بے نام ادیبوں پر آئے دن کتابوں پر کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ ملک کی کسی اردو اکادمی نے اس مشہور و معروف نامعلوم شخص کو چھوٹا موٹا ایوارڈ دینے کے لائق بھی نہیں سمجھا۔ جب کہ وہ پکڑ پکڑ کر ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بہت سے لوگوں کو مجموعی خدمات کا ایوارڈ تھما دیتی ہیں جن کا نام پتہ ہوتے ہوئے بھی نہ کوئی اچھا شعر سنا گیا نہ کوئی ڈھنگ کا قول پڑھنے میں آیا۔ (ادب اور فلسفے کا نامعلوم آدمی)

www.taemeernews.com

نصرت ظہیر

کباڑی بازار کی سیر

اتوار کے اتوار لال قلعے کے پیچھے کبھی جو کباڑی بازار ہر ہفتے لگا کرتا تھا اس کی سیر کرنا ہمارا ایک ایسا ہفتہ وار معمول تھا جس میں صرف اس روز فرق آتا تھا جس روز اتوار نہ ہو۔ اور ظاہر ہے اتوار ہر ہفتے آتا تھا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہمارا پورا ہفتہ اس انتظار میں گزرتا تھا کہ کب اتوار آئے اور کب ہم کباڑی بازار کا رخ کریں۔

آپ پوچھیں گے کباڑی بازار ہی کیوں؟ اس میں ایسی کیا بات ہے کہ ہر ہفتے اس کے چکر لگائے جاتے تھے۔

تو جناب عرض یہ ہے کہ ڈی ٹی سی کی بسوں اور راشن کی لائن میں دھکے کھانے والے سیر کے لئے کباڑی بازار کے چکر نہیں لگائیں گے تو کیا تربھون داس بھیم جی زویری جویلرز کے چکر لگائیں گے جن کے شوروم کے سامنے سے کوئی شریف آدمی (یعنی مفلوک الحال ومخبوط الحواس انسان) دو بار بھی بلا وجہ گزر جائے تو وہ اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں کہ دیکھئے صاحب یہ دکان لوٹنے آیا ہے۔

ایسے لوگ تو صرف کباڑی بازار میں ہی محفوظ رہ سکتے ہیں جو اس قدر محفوظ ہوتا ہے کہ کوئی سیدھا سا معصوم دہشت گرد وہاں کوئی ٹائم بم بھی رکھ دے تو پولیس والوں کو خبر نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ اس وقت کباڑیوں میں لا اینڈ آرڈر برقرار رکھنے یعنی ہفتہ وصول کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ یہ کام وہ اتنے انہماک سے کرتے ہیں کہ کوئی آتنک وادی کندھے پر مشین گن یا اے کے سینتالیس لے کر بھی گزر جائے تو وہ یہ سوچ کر نظر انداز کر دیں گے کہ کوئی گاہک کسی کباڑی سے پرانے زمانے کی ولائتی بین، بیگ پائپر، خرید کر لے جا رہا ہے۔

کباڑی بازار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دنیا کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ پرانے ٹائر ٹیوب، تازہ بریانی اور سیکنڈ ہینڈ جوتوں سے لے کر رشیدہ کی کشیدہ کاری اور مسدسِ حالی تک ہر قدیم و جدید شئے اس بازار کے کباڑ میں آپ کو مل جائے گی۔ اور وہ بھی بہت سستے داموں۔ یہ اور بات ہے کہ گھر جانے پر ٹائر ٹیوب بوسیدہ نکلیں، بریانی موجب اسہال بن جائے، جوتوں کے تلے میں جوڑ پایا جائے اور وہ سیکنڈ ہینڈ کی بجائے تھرڈ ہینڈ جوتے نکلیں۔ رشیدہ کی کشیدہ کاری دراصل کشیدہ کی رشیدہ کاری یا ایسی ہی کوئی جعلی کتاب نکلے۔ اور مسدسِ حالی میں سائکل مرمت گائڈ با تصویر کے جز جڑے ہوئے ہوں۔

خیر کباڑی بازار کی بار بار سیر کرنے سے ایک بڑے کام کی بات ہماری سمجھ میں آگئی ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیا میں ایک چیز کباڑی ذہنیت بھی ہے۔ مختلف کباڑیوں سے تبادلۂ خیالات و رقومات کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ دنیا میں صرف دو طرح کی ذہنیتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ جو کباڑی ذہنیت ہے اور دوسری وہ جو کباڑی ذہنیت نہیں ہے۔

کباڑی کے فلسفے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا کی ہر شئے کباڑ ہے۔ چنانچہ کباڑی دنیا کی ہر چیز اسی طرح بیچ دیتا ہے جس طرح حبیب پینٹر قوال نے اپنی قوالی کے ایک پرانے ریکارڈ میں بیچ دی تھیں۔ ہم نے زندگی میں آج تک کسی کو ساڑھے تین منٹ میں اتنی چیزیں بیچتے نہیں سنا۔

دہلی کے مقبرۂ ہمایوں، مہرولی کی قطب مینار اور آگرے کے تاج محل کے حسن کی ماہرینِ فنِ تعمیر خواہ کتنی ہی تعریف کیوں نہ

www.taemeernews.com

کریں لیکن کباڑی کی نظر سے دیکھیں تو وہ پرانے سنگِ سرخ اور سنگِ مرمر کے انبار سے زیادہ کچھ نہیں جن کا زیادہ بہتر مصرف یہ تھا کہ انہیں توڑ پھوڑ کر بجری یا ماربل بنا لیا جاتا۔ کم از کم گھروں کے فرش اور کچن کے سلیب بنانے میں تو کام آتے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر نے تاج محل کو اسی کباڑی نظر سے دیکھ کر اس کی نیلامی لگوادی تھی۔ وہ تو لندن کے ہاؤس آف لارڈز میں اس پر ہنگامہ مچ گیا، ورنہ آج پتہ نہیں کتنے لوگ تاج محل پر تلا ہوا بیف اسٹیک اُڑا رہے ہوتے اور نا معلوم کتنی لیڈیاں قطب مینار پر رقص کناں ہوتیں۔

کباڑی دراصل دنیا کی ہر چیز کو صرف دو پہلوؤں سے دیکھتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کتنے میں خریدی جا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے کتنے میں بک جانا چاہئے۔ اس کے نزدیک ہر شئے کے یہی دو مصرف ہیں، یہی دو خوبیاں ہیں کہ وہ خریدی جا سکتی ہے اور بیچی جا سکتی ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو یہ کباڑی ذہنیت دنیا میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔

کہتے ہیں کباڑی بازار میں ایک نامعلوم دہشت گرد کسی کباڑی کی نظر بچا کر اس کی دوکان پر ایک ٹائم بم کھلا چھوڑ گیا۔ کباڑی غریب یہ سمجھا کہ وہ اس کے کباڑ ہی کا حصہ ہے۔ چنانچہ اس نے پرانی چیزوں کا شوق رکھنے والے ایک گاہک کو وہ ٹائم بم مغلوں کے زمانے کی سرمہ دانی کہہ کر بیچ دیا۔

گاہک مغلوں کی سرمہ دانی خرید کر بہت خوش ہوا۔ لیکن جلد ہی اس کی یہ خوشی کافور ہوگئی۔ کیونکہ جیسے ہی اس نے سلائی نکال کر مغلوں کا سرمہ اپنی آنکھ میں لگانے کی کوشش کی، چشم زدن میں وہ اور کباڑی دونوں، سیدھے مغلوں کے زمانے میں پہونچ گئے! (ہم حیران ہیں کہ اس قصے کا راوی خود اس وقت کہاں کھڑا تھا؟)

خود ہمیں بھی نئی چیزوں سے زیادہ پرانی چیزوں کا شوق ہے۔ اور یہی شوق ہمیں ہر ہفتہ کباڑی بازار لے جاتا ہے۔ کبھی ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں تو آپ پائیں گے کہ وہ غریب خانہ کم اور کباڑ خانہ زیادہ ہے۔ ہم آپ کو پچاس برس پرانی ایک بائیسکل دکھائیں گے جس میں کباڑی کے بقول اُس بزرگ و مرحوم سائیکل کے بھی کئی پرزے فٹ ہیں جس پر جناب پطرس بخاری نے مضمون لکھ کر نام کمایا تھا۔ اس نے تو ہمیں بھی یہ مشورہ دیا کہ کسی دن اس کی سواری کر کے دیکھئے کیسے روشن خیالات دماغ میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ساٹھ ستر سال پرانا ایک گراموفون باجا ہے جس پر اب کوئی ریکارڈ سیدھا نہیں گھومتا بلکہ الٹی طرف گھومتا ہے۔ چنانچہ ریکارڈ بجانے کے لئے ساؤنڈ بکس کی سوئی شروع میں نہیں بلکہ ریکارڈ کے آخر میں رکھنی پڑتی ہے۔ جہاں سے وہ ہندی فلم کا گانا، تیّیّو یا ملیالم زبان میں بجا کر شروع میں واپس آجاتی ہے۔ اس عمل سے آپ ترقی معکوس کے عمل کو بھی بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ زہرہ بائی، گوہر بائی اور حاتم طائی کے ریکارڈ بھی موجود ہیں جن میں سے بیشتر ٹوٹ چکے ہیں۔

پھر پرانے زمانے کا ایک دیو ہیکل کالا سیاہ ٹیلی فون ہے جو ہم نے اس لئے لگا رکھا ہے کہ بچے اور ہمسائے اس سے دور رہیں۔ یہ ٹیلی فون اس قدر خوفناک ہے کہ بچے اس سے ہول کھاتے ہیں اور ہمسائے کسی طرح ہمت جٹا کر اسے استعمال بھی کرنے لگیں تو ڈائل گھماتے وقت نمبر بھول جاتے ہیں۔ اوروں کی بات چھوڑیئے، ہم خود اس ٹیلی فون سے اس درجہ خائف رہتے ہیں کہ اسے کبھی استعمال میں نہیں لاتے۔ اپنے استعمال کے لئے ہم نے ایک خوب صورت سا نازنین صفت ٹیلی فون ایک خفیہ الماری میں چھپا رکھا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ٹیلی فون کا بل اور ہمارا دل دونوں قابو میں رہتے ہیں۔

کباڑی بازار میں ہم کسی چیز کی خوبیاں دیکھنے یا قیمت معلوم کرنے سے پہلے دکاندار سے اس کی عمر ضرور معلوم کر لیتے ہیں۔ بہت سی چیزیں ہم نے صرف اس لئے خریدی ہیں کہ وہ پرانی ہیں۔ آپ کو ہمارے ہاں دوسری جنگِ عظیم کا جرمن پنکھا مل جائے گا جو کسی زمانے میں بجلی سے چلتا تھا مگر اب بجلی کے بغیر ہی چلتا ہے۔ وہ ایسے کہ لکڑی کے بڑے

www.taemeernews.com

بڑے بلیڈ پنکھے سے الگ کر دیے گئے ہیں، اور جب گرمی میں بجلی چلی جاتی ہے تو ہر شخص ایک ایک بلیڈ ہاتھوں میں لے کر ایک دوسرے کو ہوا کرتا رہتا ہے۔ اس طرح بجلی کی بچت الگ سے ہو جاتی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کا ایک ریڈیو بھی ہمارے پاس ہے جو اتنا بڑا ہے کہ ریڈیو کم اور ریڈیو اسٹیشن زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ ان دونوں جنگوں کے بیچ کی ایک امریکی الیکٹرک پریس ہے جسے اب کوئلے کی انگیٹھی پر رکھ کر گرم کرنا پڑتا ہے، اور غالباً تیسری جنگِ عظیم کے بعد استعمال کے خیال سے بنایا گیا ایک جاپانی روم ہیٹر بھی موجود ہے، جو فی الحال صرف گرمی میں قابلِ استعمال ہے۔

کئی کباڑی حضرات اتنے کائیاں واقع ہوئے کہ بعض اوقات نئی چیزیں بھی ہم جیسے رجعت پسندوں کو پرانی کہہ کر بیچ دیتے ہیں۔ کئی اسپرے لیونڈر، پاکٹ کیلکولیٹر، اسٹیریو واک مین، اور کمپیوٹر ڈسک ہم کباڑیوں کے اس دعوے پر یقین کرتے ہوئے خرید کر لا چکے ہیں کہ قدیم انگریز تاجر یہ چیزیں افغانستان کے راستے سے ہندوستان لائے تھے۔ چونکہ ہماری تاریخ و جغرافیہ شروع سے کمزور ہیں اس لئے ایسی باتوں کا فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ یہاں تک ایک نقلی پارکر پین بھی کباڑی کے اس دعوے پر خرید چکے ہیں کہ شیخ سعدی نے گلستاں بوستاں کا پیش لفظ اور مولانا حالی نے مقدمہ شعروشاعری کے ابتدائی صفحات اسی سے تحریر کئے تھے۔ اسی کباڑی بازار کے ایک چاٹ والے نے ہماری قدامت پرستی سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہمیں تازہ دہی بڑے یہ کہہ کر کھلانے کی کوشش کی کہ اس میں جو دہی ہے وہ مرہٹوں کے زمانے میں جمائی گئی تھی۔ لیکن ہمیں کچھ شک سا ہونے لگا لہٰذا کھائے بغیر آگے بڑھ گئے۔ (میاں عبدالقدوس کا کہنا ہے کہ ہم اسی لئے زندہ ہیں۔)

ویسے کباڑی بازار میں آپ جائیں تو ہر قدم پر ہوشیار اور چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ ذرا سی غلط فہمی نقصان اور خطرے کا باعث بن جاتی ہے۔ جس طرح ایک مرتبہ ہمارے لئے بن گئی تھی۔

ہوا یہ کہ ہم ایک کباڑی کی دکان کے آگے کھڑے اس کے سامان کا معائنہ کر رہے تھے۔ کباڑی اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ بیٹھا دنیا بھر کی نئی پرانی چیزیں بیچ رہا تھا اور اس کی بیوی ایک پرانی سرمے دانی کو کپڑے سے چمکانے میں مصروف تھی۔ ہمیں سرمہ دانی بہت اچھی لگی۔ لہٰذا حسب عادت اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھ لیا۔ کتنی پرانی ہے؟

کباڑی نے چونک کر ہماری طرف دیکھا اور پوچھا، ''کیا؟''

ہم نے سرمہ دانی کی طرف انگلی اٹھا دی۔ ''وہ۔''

کباڑی کی آنکھوں سے اچانک غصہ جھلکنے لگا۔ بولا ''پرانی سے کیا مطلب؟''

ہم نے کہا، ''بھئی پرانی کا مطلب یہ کہ کب کی ہے؟ مغلوں کے زمانے کی تو نہیں؟''

اس پر کباڑی کا غصہ جاتا رہا اور وہ کسی قدر شرما کر بولا۔ ''ابھی تو تین مہینے بھی نہیں ہوئے بابو جی۔''

مگر جب ہم نے پوچھا ''کتنے میں دوگے؟'' تو جیسے زلزلہ ہی آگیا۔ کباڑی ایک لوہے کی سلاخ اٹھا کر ہمیں مارنے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ ہم بچنے کے لئے سرپٹ بھاگے۔ دوڑو، پکڑو کی آوازوں سے کباڑی بازار میں ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ گھبراہٹ میں کئی پولیس والوں کا ہفتہ ہاتھ سے گر گیا۔ وہ سمجھے کہ ویجیلنس والوں کی ریڈ پڑی ہے۔

آخر جب پولیس کو ہوش آیا اور وہ ہمیں اور کباڑی کو دہشت گرد ہونے کے شبہ میں پکڑ کر تھانے لے گئی تب کہیں جا کر تھانے دار کی مٹھی گرم ہونے کے بعد اور ہم دونوں پر پوتا لگنے سے پہلے یہ بھید کھلا کہ کباڑی کو غلط فہمی ہوگئی تھی۔ ہم اپنی دانست میں اس سے سرمے دانی کے دام پوچھ رہے تھے اور وہ سمجھ رہا تھا کہ ہمارا روئے سخن اس کی بیوی کی طرف ہے۔

اس حکایت سے دوسرا سبق یہ ملتا ہے کہ کباڑی کی بیوی خوبصورت نہیں ہونی چاہئے۔

☆......☆......☆

www.taemeernews.com

کلامِ نصرت ظہیر

غزلیں

بظاہر پاس وہ منزل بہت ہے
وہاں سے لوٹنا مشکل بہت ہے

تم اپنے گھر سلامت لوٹ جاؤ
مجھے پہلو میں میرا دل بہت ہے

ہم ایسی قربتوں میں کھو گئے ہیں
کہ جن میں فاصلہ شامل بہت ہے

یہ غم سرشار تو کردے گا لیکن
جو اس کا زہر ہے قاتل بہت ہے

خوشی کی انجمن تم ڈھونڈ لینا
ہمیں یہ درد کی محفل بہت ہے

یقیناً خوب صورت ہے وہ صورت
مگر رخسار کا اک تل بہت ہے

☆

مانا کہ کوئی ساز دکھائی نہیں دیتا
یہ تو نہ کہو کچھ بھی سنائی نہیں دیتا

خوابوں میں ہی کچھ شکل نظر آئے تو آجائے
وہ سامنے آکر تو دکھائی نہیں دیتا

خاموش ہے وہ اور ہمیں چپ سی لگی ہے
اک شور ہے اور کچھ بھی سنائی نہیں دیتا

لے دے کے وہی کوچہ وہی ایک گلی ہے
رستہ ہی کوئی اور سجھائی نہیں دیتا

سجدے یوں ہی بے کار پڑے رہتے ہیں در پر
بندوں کو یہاں کوئی خدائی نہیں دیتا

جو ظلم ہوا ہے تری مرضی سے ہوا ہے
بے وجہ کوئی اتنی صفائی نہیں دیتا

اُس شوق کو تسکین ملے گی بھی تو کیسے
صحرا بھی جسے آبلہ پائی نہیں دیتا

☆

یوں تو اس دنیا میں کیا کیا نہیں ہونے والا
کچھ مگر عشق میں اچھا نہیں ہونے والا

اے مرے دل ترا سوچا نہیں ہونے والا
وہ جو سب کا ہے وہ تیرا نہیں ہونے والا

کیوں پریشان ہے بس چھوڑ یہ سب چارہ گری
تیرا بیمار اب اچھا نہیں ہونے والا

دیکھنے والے رہے اب نہ دکھانے والے
لوٹ جا اب یہ تماشا نہیں ہونے والا

کس کو فرصت ہے یہاں عشق کی روداد سنے
فکر مت کر کوئی رسوا نہیں ہونے والا

تجھ سے مل کر جو گیا ہے وہ کہاں جائے گا
عمر بھر اب یہ کسی کا نہیں ہونے والا

بھیڑ میں بھی جو اکیلا سا کھڑا رہتا تھا
اب وہ خلوت میں بھی تنہا نہیں ہونے والا

کس لئے جاگ رہے ہو میاں نصرت صاحب
ہجر کی شب ہے سویرا نہیں ہونے والا

☆

www.taemeernews.com

شاخوں پہ درختوں کو قربان نہیں کرتے
انسان جو کرتے ہیں حیوان نہیں کرتے

اس شوخ کی صورت میں کچھ رنگ عجب سے ہیں
آئینے کو ہم یوں ہی حیران نہیں کرتے

جو جسم سے مرتے ہیں وہ شور مچاتے ہیں
جو جان سے جاتے ہیں اعلان نہیں کرتے

کتنا دلِ سادہ کو سمجھایا تھا مت الجھو
انجان سے لوگوں سے پہچان نہیں کرتے

الجھے بھی تو الجھیں گے خود اپنے ہی دامن سے
اوروں کا جنوں والے نقصان نہیں کرتے

اتنا نہ اسے چاہو، کچھ سمجھو میاں نصرت
اس عمر میں وحشت کے سامان نہیں کرتے

نظمیں

ایک نظم اپنے لئے

یادوں کا ہے ایک جھروکا
جس کے دونوں جانب میں ہوں
دونوں جانب حیرانی سے
میں ہی خود کو دیکھ رہا ہوں
میں ہی خود کو سوچ رہا ہوں

میں ہی اپنی انگلی تھامے
گھوم رہا ہوں اُن گلیوں میں
اُن صحنوں اور دالانوں میں
جن میں دفن ہیں
کانچ کے ہیرے، آنکھ کے موتی،
پیر مکوڑے شاہ کی قبریں
ننھا سا چڑیا کا بچہ
اور اک روئی کے بالوں والی
نرم سی گڑیا
وہیں پڑے ہیں نل کے پیچھے
ملتانی مٹی کے کچھ گیلے سے ٹکڑے
وہیں ابھی تک دیواروں سے لپٹی ہیں
پُر رعب صدائیں
وہیں طاق میں رکھی ہوں گی
کچھ بوڑھی معصوم دعائیں

میں ہی اپنا ہاتھ پکڑ کر
کود رہا ہوں اس چھجے سے اس چھت پر
اور ڈھونڈ رہا ہوں وقت کی چرخی سے لپٹے
مانجھے کے بر دوں کو
جن کی پتنگیں
ظالم موسم لوٹ چکے ہیں

میں ہی اپنے کندھے چڑھ کر
دیکھ رہا ہوں کب سے دنیا کے میلے کو
جس میں کبھی اک بار گیا تو
واپس ہی پھر لوٹ نہ پایا
بچھڑ گیا خود سے بھی اک دن

وہی جو بچھڑا تھا میلے میں
اب جا کر وہ مجھے ملا ہے
ایک جھروکے سے میں اس کو دیکھ رہا ہوں
سوچ رہا ہوں
میں خود کتنا بدل گیا ہوں
لیکن وہ اب بھی ویسے کا ہی ویسا ہے

www.taemeernews.com

اس کے چہرے کی شادابی
اس کی آنکھوں کی مہتابی
مجھ سے زیادہ چمک رہی ہے
مجھ سے زیادہ مہک رہی ہے
مجھ سے شگفتہ ذہن ہے اس کا
مجھ سے کشادہ اس کا دل ہے
میں اس کا دھندلا ماضی
وہ میرا روشن مستقبل ہے!

☆

ہمسفر

جلتی دھوپ
سلگتی راہیں
آگ اگلتے ہوئے فاصلے
میں نے اس سے کہا
بس اب تم لوٹ چلو
مجھے یہاں سے تنہا آگے جانا ہے

لیکن وہ خاموش رہا
میری طرح سر اپنا جھکائے
میرے قدم سے قدم ملائے
ہاتھوں کو ہاتھوں سے تھامے
میرے ساتھ ہی چلتا رہا
گرتا اور سنبھلتا رہا
میں نے سوچا ہاتھ چھڑا لوں
لیکن اس نے ہاتھ نہ چھوڑا
بہت کہا اب ساتھ نہ آنا
لیکن اس نے ساتھ نہ چھوڑا
تب میں چونکا
آنکھیں کھول کے غور سے دیکھا
وہ میرا ہی سایا تھا
جانے کہاں سے آیا تھا!

☆

گریز

محبت اب نہیں ہوگی
نہ کوئی آرزو ہوگی نہ کوئی امتحاں ہوگا
نہ دل پر درد ٹھہرے گا نہ کچھ غم کا بیاں ہوگا
لہو آنکھوں سے ٹپکے گا نہ خامہ خونچکاں ہوگا
تمہیں مجھ سے مجھے تم سے شکایت اب نہیں ہوگی
محبت اب نہیں ہوگی

کبھی اظہار الفت کو تماشا بھی بنایا ہے
بہت آنسو بہائے ہیں بہت دل کو دکھایا ہے
بہت دیوانگی کی ہے بہت تم کو ستایا ہے
چلو اب مطمئن رہنا یہ وحشت اب نہیں ہوگی
محبت اب نہیں ہوگی

کبھی شیریں لبی کرنا کبھی زہراب ہو جانا
کبھی خوابوں میں گم رہنا کبھی بے خواب ہو جانا
کبھی بے چین کر دینا کبھی بے تاب ہو جانا
بہت کچھ ہو چکا جاناں یہ حالت اب نہیں ہوگی
محبت اب نہیں ہوگی

گھٹن تنہائی بے چینی دکھوں کے نام ہیں کتنے
کہانی ایک تھی اپنی مگر انجام ہیں کتنے
تمہیں گھر لوٹ جانا ہے مجھے بھی کام ہیں کتنے
بہت شرمندہ رہتے تھے ندامت اب نہیں ہوگی
محبت اب نہیں ہوگی

www.taemeernews.com

میری کارٹون نویسی

جس طرح مجھے فکر تونسوی صاحب کے ساتھ چار سال کی دفتری رفاقت، ان کی شفقت اور ان سے اپنی عقیدت و محبت کے باوجود کبھی یہ محسوس نہیں ہو سکا کہ میں بھی تھوڑی بہت طنز و مزاح نگاری کر سکتا ہوں، اسی طرح مزاح نگاری شروع ہونے کے برسوں بعد تک مجھے انداز ہ نہیں ہو سکا کہ میں کارٹون نویس بھی بن سکتا ہوں۔ ہمارے ہاں نیشنل ہیرالڈ میں کبھی کبھی کارٹون چھپا کرتے تھے، مگر قومی آواز میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ ایک روز ہیرالڈ کے نوخیز و جواں سال کارٹونسٹ پریش ناتھ سے بات ہو رہی تھی۔ میں نے ان سے کہا، یار آپ کی اسکیچنگ میں تو بڑی جان ہے مگر کارٹون کا جو آئیڈیا ہوتا ہے وہ اتنا جاندار نہیں ہوتا۔ پریش ناتھ اڑیسہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت ہی دل کش اڑیا لہجے میں اردو بولتے ہوئے انھوں نے شرما کر سر جھکا لیا اور میں ان کی باتوں سے صرف اتنا سمجھ سکا کہ وہ کہہ رہے ہیں، ایڈیٹوریل والے کوئی دل چسپی ہی نہیں لیتے اس لیے مجھے بھی کام میں مزہ نہیں آتا۔ میں نے تجویز رکھی کہ کیوں نہ ہم مل کر کام کریں۔ کارٹون سوچوں میں اور اسے اسکیچ میں ڈھالیں آپ۔ وہ جھٹ مان گئے۔ اگلے روز میں نے ایک نہیں کئی کارٹون سوچے۔ پریش کو سنائے تو وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ میں سمجھ گیا۔ کام بن رہا ہے۔ پھر ہم نے کچھ دیر کارٹونوں کے کرداروں پر بحث کی۔ ایک دو گھنٹے بعد بڑی محنت سے وہ ان کارٹونوں کے بے حد عمدہ اسکیچ بنا کر لائے۔ مجھے تحت اللفظ کی یومیہ کالم نگاری چھوڑے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے اور 'بقلم خود' ہفتہ وار لکھا کرتا تھا۔ اگلے روز سے پہلے صفحے پر 'تحت اللفظ' یومیہ کارٹون کالم کی شکل میں شروع ہو گیا۔ اس پر ہم دونوں کا نام ساتھ جاتا تھا۔ اس روز فلمی موسیقار جوڑی کلیان جی آنند جی کی مانند اردو کی بھی ایک کارٹون ساز جوڑی وجود میں آ گئی۔ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ اردو کی تاریخ میں اس نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ ایڈیٹر موہن چراغی کو چھوڑ کر باقی تقریباً سبھی لوگوں نے اس جوڑی کے کارٹون پسند کیے۔ چراغی صاحب کو اس لیے پسند نہیں آئے کہ وہ ہنستے بولتے تو خوب تھے لیکن صرف اپنے لطیفوں پر۔ بہر کیف ایک ڈیڑھ سال تک اس جوڑی کے کارٹون چھپتے رہے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا، چراغی صاحب نے یہ سلسلہ بند کرا دیا۔ اس دوران نائن الیون اور گجرات کے سانحے ہو چکے تھے۔ ادھر ٹائمس آف انڈیا میں بھی 'جگ سریا اور نیلابھ' کی کارٹون ساز جوڑی سامنے آ گئی تھی، جس نے 'دوبیا مین' Dubyaman کے الٹ پٹے نام سے، جو کہ جارج ڈاکر بش کی عرفیت Dubya سے تراشا گیا تھا، اپنی کارٹون سیریز شروع کی۔ یہ محض اتفاق تھا یا اور کچھ، میں نہیں جانتا۔ مگر اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نصرت اور پریش کی کارٹون ساز جوڑی جگ سریا اور نیلابھ کی جوڑی سے بہر حال سینئر تھی۔ قومی آواز اور نیشنل ہیرالڈ کے بند ہونے کے ساتھ ہم دونوں کے مل کر کام کرنے کا سلسلہ پوری طرح بند ہو گیا۔ اس بیچ پریش نے بین الاقوامی سطح پر اپنی الگ پہچان بنا لی، انھیں یوروپ امریکہ اور خلیج کے کئی انگریزی اخباروں اور کارٹون ساز تنظیموں نے گراں قدر اعزازات دیے۔ میرے حصے میں بس ان دنوں کی سنہری یادیں آئی ہیں جن کے پریش ناتھ بھی شریک ہیں۔ آج بھی میری دلی خواہش ہے کہ پریش ناتھ یا کسی اور کے ساتھ مل کر کسی اچھے اردو اخبار کے لیے کارٹون سازی کروں۔ لیکن اول تو اردو کے اخبار اسے اہمیت ہی نہیں دیتے، اور اگر دیتے بھی ہیں تو معاوضے کے نام پر بدک جاتے ہیں!

نصرت ظہیر

نصرت ظہیر ۔ پریش ناتھ

کارٹونوں کا انتخاب

گجرات زدہ کارٹون: قومی آواز کے صفحۂ اول پر شائع ہونے والے وہ کارٹون جو سانحۂ گجرات کے دنوں میں تیار کیے گئے

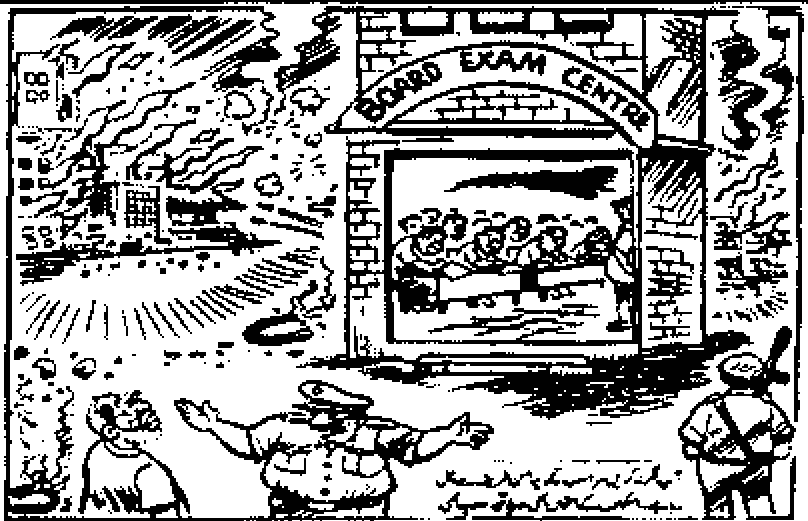

آج کل یہ ٹی وی خبریں زیادہ دیکھنے لگا ہے، صبح سے گجرات کا نقشہ دکھا کر بار بار پوچھ رہا ہے اس میں انڈیا کہاں ہے؟

پہلے نیوٹن کا تیسرا قانون اور اب فورسٹر کا مضمون، یہ دونوں آر ایس ایس کے پرچارک تو نہیں تھے؟

جس سے نفرت ہے اسے ۔ ووٹ دو ۔ یہ ڈائلاگ تو شیکسپیئر کے مرچنٹ آف وینس میں بھی ہے!

پولیس افسر تو بدل دیے گئے صاحب، اب یہ بتائیے ننگے بجڑ کانے کے لیے کسے پکڑا جائے؟

مودی جی کو ہٹانے سے کچھ نہیں ہوگا ضرورت ان حالات سے نمٹنے کی ہے جو ان کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں!

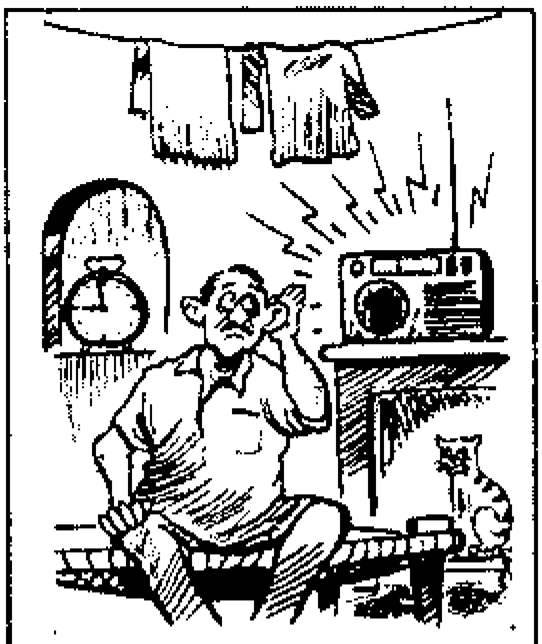

گجرات کے بعد ملین کے آخر میں پیش ہیں ہندوستان کی کچھ مختصر خبریں...

تحت اللفظ

یومیہ کارٹون کالم: نصرت ظہیر - پریش ناتھ

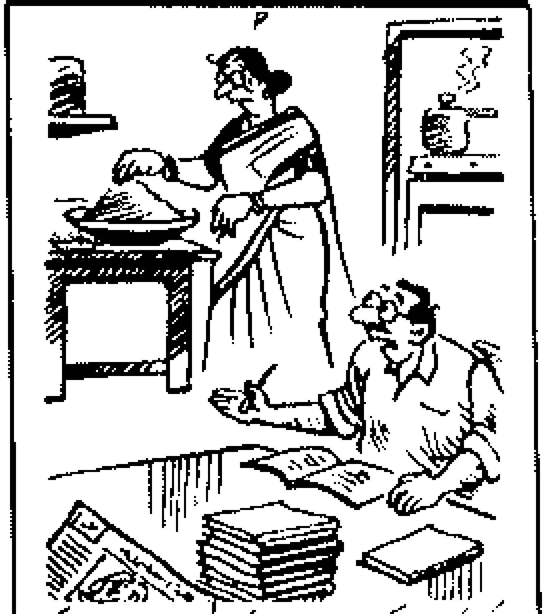

ڈاکٹر کلام کے نام سے بچے الجھ رہے ہیں، ایک بچے نے امتحان کی کاپی میں لکھا ہے، ابوالکلام پہلے مجاہد آزادی ہیں جنھوں نے ایٹم بم بنایا!

متاثر ہیں تو ہے مگر مطلوبہ اور پسندیدہ کا فرق نہیں جانتا، ازدواجی کو لکھ رہا ہے کہ پاکستان سے مطلوبہ افراد میں مہدی حسن اور شعیب اختر کو بھی شامل کرلیں!

قد و قامت کا فرق!

مجھے یقین ہے میرے بیان پر کافی شور مچے گا، لہٰذا ابھی سے تردید نامہ تیار کرلو کہ میرا بیان توڑ مروڑ کر چھاپا گیا ہے!

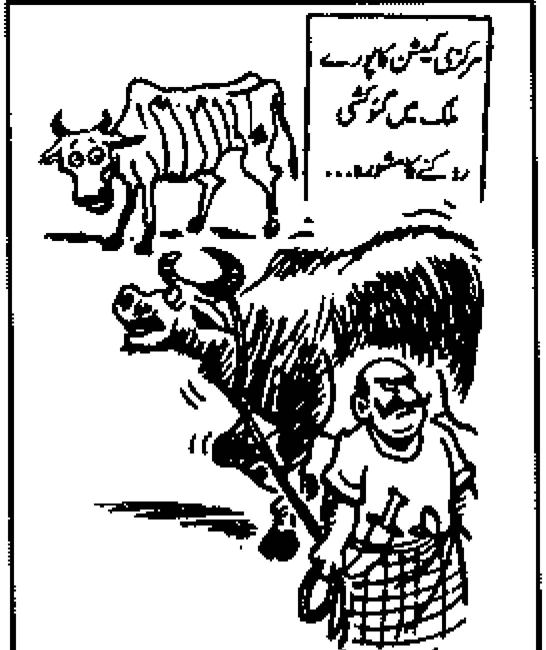

سمجھ میں نہیں آتا لوگ بھینس کشی پر پابندی کی بات کیوں نہیں کرتے، جب کہ میں زیادہ دودھ دیتی ہوں!

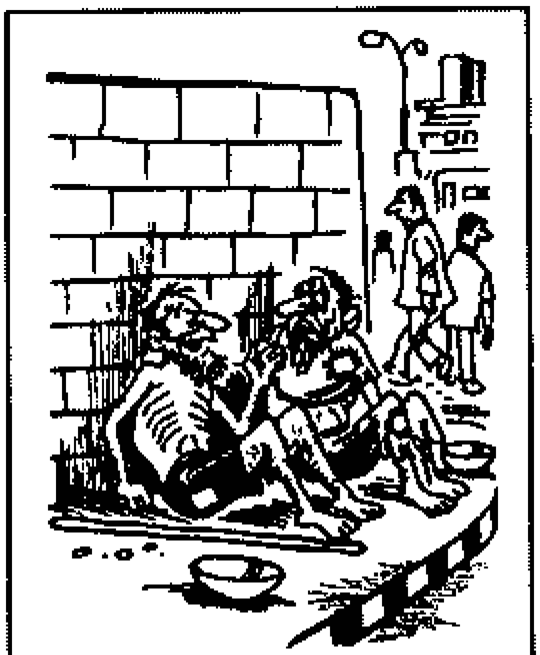

اچھا ہے ہم غریبی کی سطح کے نیچے رہتے ہیں ورنہ بجٹ سے ہونے والی مہنگائی ہمیں برباد کردیتی!

دونوں پارٹیوں میں خاص فرق یہ ہے کہ ایک نے ہمارا جغرافیہ تبدیل کیا، دوسری ہماری تاریخ بدل رہی ہے!

میں کہتی ہوں چھتری کے ساتھ اپنا پرانا تیراکی کا لباس بھی لیتے جاؤ...

بیچارا ہماری ویب سائٹ سے بڑا متاثر ہوا ہے، کہتا ہے کمپیوٹر کیلئے قرض دلوا دیجئے تاکہ بستی میں پانی نہ آنے کی شکایت انٹرنیٹ پر درج کراسکوں!

www.taemeernews.com

تحت اللفظ

یومیہ کارٹون کالم: نصرت ظہیر - پریش ناتھ

آجکل بازار میں ہر چیز کے ساتھ کچھ مفت دینے کا رواج ہے، میں بھی ایک بکرے کے ساتھ دو زندہ مرغے مفت دے رہا ہوں!

مہاراج ہاتھ دیکھ کر صرف اتنا بتا دیجیے کہ آج رات کالونی میں بجلی آئے گی یا نہیں!

ٹھہرو ٹھہرو، اصلی نتیجہ آ گیا ہے۔ ہم صرف ایگزٹ پول میں جیت رہے تھے!

اللہ میگھ دے، پانی دے، مچھر دے...

یہ کیا، ان میں تو سب امیدواروں پر جرائم کے مقدمے چل رہے ہیں، میرا خیال ہے اسے ووٹ دے دو جس پر سب سے کم مقدمے ہیں!

آپ کے علاقے میں پانی بھرا ہے تو میں کیا کروں، ہم خود سیلاب میں گھرے ہیں...

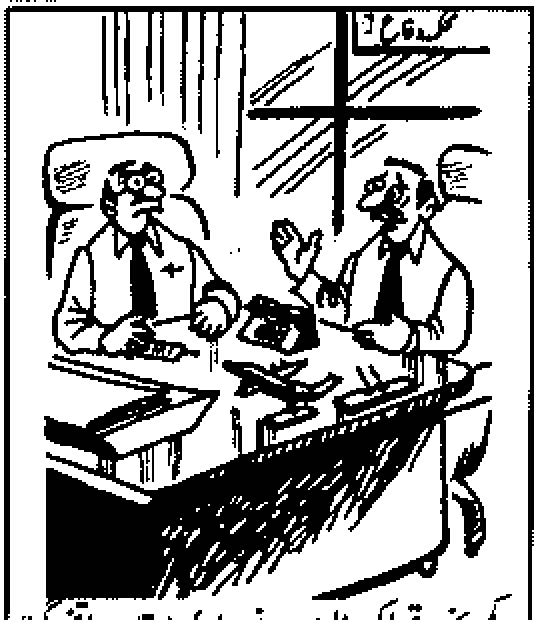

کم بخت تہلکہ والوں نے ہماری اوقات اتنی گھٹا دی ہے کہ کل ایک اسلحہ ایجنٹ 400 روپے دے کر کہنے لگا، چالیس کروڑ کا آرڈر دلا دو!

خشک سالی پر ریاستی وزیروں کی میٹنگ بہت کامیاب رہی۔ لنچ بھی عمدہ تھا...

صاحب یہ بڑا گھسا ہوا سٹہ باز ہے۔ دفتر موسمیات جو پیشین گوئی کرتا ہے یہ اس پر الٹی بولی لگا کر رقم جیت لیتا ہے!

تحت اللفظ

یومیہ کارٹون کالم: نصرت ظہیر - پریش ناتھ

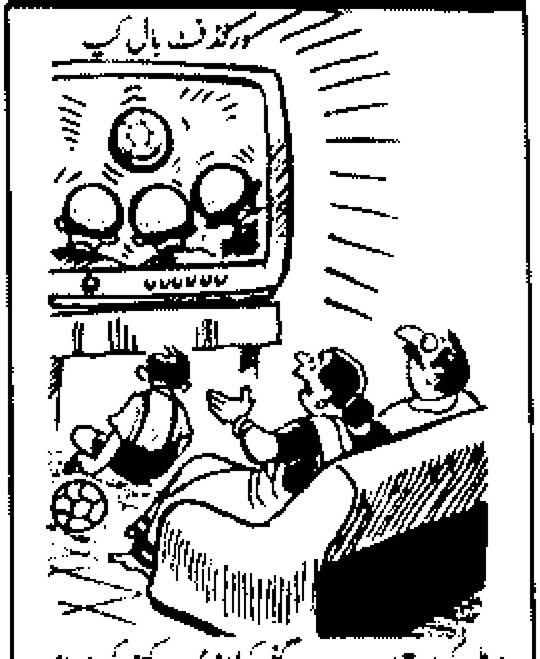

برازیل کو اتنے سارے گنجے کھلاڑی رکھنے کی اجازت نہیں ملنی چاہیے! کئی بار پتہ نہیں چلتا گیند کون سی ہے!

شکر ہے اس اشتہار کے لیے بھی جگہ نکل ہی آئی!

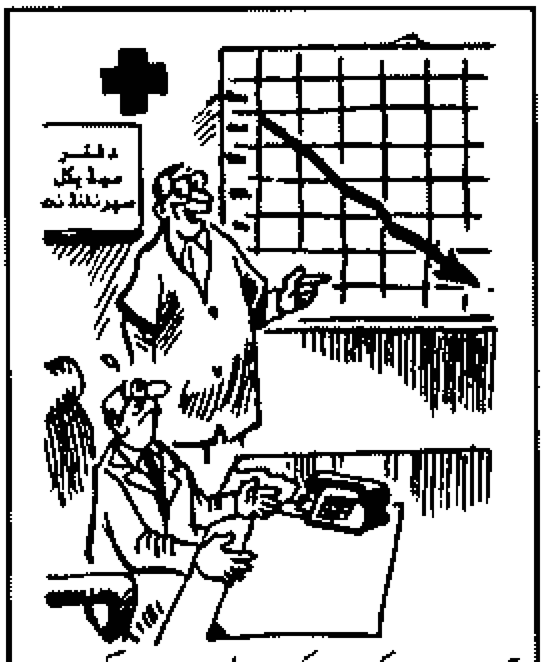

آ ئے دن ڈاکٹروں کی ہڑتال سے اور کچھ ہو نہ ہو، ہماری شرح اموات ضرور گھٹ جاتی ہے!

اس روز لاٹھی چارج کے لئے پولیس والے ان کی لاٹھی بھی لے گئے تھے سر!

حضور آپ یقین کیجئے میں صدر پرویز مشرف بول رہا ہوں۔ وہ وعدہ آپ سے میں نے نہیں جنرل پرویز مشرف نے کیا تھا!

شکر ہے ترنگا لہرانے سے متعلق قوانین میں ترمیم ہوگئی، نہیں تو یہ قومی توہین ہو جاتی!

دی گریٹ ساؤتھ ایشیا سرکس

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری...

www.taemeernews.com

دے کے خط...... (مراسلے)

محترم ڈاکٹر سید مصطفی کمال صاحب

فروری 2013ء کا ''شگوفہ'' دو تین ہفتے قبل مل گیا تھا۔ رسید کی ترسیل میں اس لیے تاخیر ہوئی کہ میں اس دوران اپنی تازہ ترین (22ویں) کتاب کی تیاری میں مصروف تھا جو الحمدللہ اب پریس میں ہے۔ میری یہ کتاب (''پورب سے یورپ تک'') اس سفر نامے پر مبنی ہے جو ''شگوفہ'' میں دو سال تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔

میری نظر میں مذکورہ بالا شمارے کا سب سے عمدہ مضمون ''غالب کی دِلّی'' (سید ضمیر حسن دہلوی) ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میں اس طنز کا سزاوار ہوں جو رجب علی بیگ سرور (لکھنوی) نے میر امّن (دہلوی) پر کیا تھا یعنی 'دلّی کا روڑا'۔ ''تصویر کا دوسرا رخ'' (رؤف خوشتر) ایک عمدہ مضمون ہے۔ اس کا ایک جملہ ''کیمرہ ٹھیک کر کے حسب عادت میں نے (مرنے والے سے) کہا 'ذرا مسکرایئے'۔ اس پر لڑکے برہم ہو گئے تھے'' مجھے مزاح کے شاعر بے بدل، انور مسعود کی طرف لے گیا۔ دیکھیے کیا خوب شگوفہ چھوڑا ہے۔

ایسی نہیں ہے بات جسے یاد رکھ سکیں
بہتر یہی ہے آپ بھی پھر بھول جایئے
اخبار کا یہ فوٹو گرافر بھی ہے عجیب
میّت سے کہہ رہا ہے ذرا مسکرایئے

''لو ہم بھی فلویاب ہو گئے'' (واجد ندیم) دلچسپ تحریر ہے لیکن اختتام پر دیے ہوئے شعر کے پہلے مصرعے میں ضم کا اتنا زبردست پہلو ہے کہ میں یہاں مصرع دہرانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ ''کوئی ان سے...'' (ڈاکٹر محمد اسد اللہ) ہلکا پھلکا ہونے کے ساتھ ساتھ مقصدی اور اصلاحی بھی ہے۔ مجھے اس کا یہ جملہ بہت اچھا لگا ''عورتیں اندیشہ ہائے دور دراز پر بھی توجہ دیں اور اپنے لباس کو مردوں کے لیے کھلا دعوت نامہ نہ بننے دیں۔'' تاہم ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں جو شعر لکھا ہے اس میں وہ چُوک گئے۔ اکبر الہ آبادی کا یہ پرلطف شعر اپنی درست حالت میں درج ذیل ہے۔

مجھی سے سب یہ کہتے ہیں کہ نیچی رکھ نظر اپنی
کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر

یہ شعر اسی طرح ''کلیاتِ اکبر'' (مرتبہ نارنگ ساقی) کے صفحہ 32 پر موجود ہے۔ بلال سیوہاروی پر صابر علی سیوانی کا مضمون بہت وقیع ہے۔ مضمون میں بلال (مرحوم) کی 1964ء میں لکھی گئی نظم کا حوالہ برمحل ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ اس خطّے کے تینوں ممالک میں آج نصف صدی بعد بھی حالات جوں کے توں ہیں۔ زاداورنگار نے صحیح کہا تھا کہ حالاتِ حاضرہ کو کئی سال ہو گئے۔ ''اداریہ'' میں آپ نے جن سیاسی/معاشرتی مسائل کا احاطہ کیا ہے وہ بھی ہم سب کے مشترک ہیں۔ مصائب و مسائل کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں مزاح نگار روشنی کی کرن دکھاتے ہیں۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ ''اودھ پنچ'' سے لے کر ''شگوفہ'' تک مزاح نگاری کی ایک طویل تاریخ ہے اور یہ تاریخ گواہ ہے کہ مزاح نگاروں نے مزاح کے تئیں ہمدردانہ و مشفقانہ جذبہ سے کام لیا ہے۔''

شعری حصے میں ڈاکٹر ظفر کمالی، اسد رضا، افتخار وصی، کرشن پرویز اور عرفان بارہ بنکوی کی تخلیقات خاص طور پر پسند آئیں۔ موخرالذکر کی نظم 'ایک بیوی کا خط' پروفیسر عنایت علی خان کی نظم 'ابھی نہ آؤ چھوڑ کر، کہ گھر ابھی بھرا نہیں' سے متاثر لگتی ہے۔

میں ''شگوفہ'' کی ترقی اور کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ ایک مضمون بعنوان 'ہمارا آشتی ادب' ارسالِ خدمت ہے۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، کراچی

ڈیر ڈاکٹر مصطفی کمال

السلام علیکم، شگوفہ کے زیر اہتمام یہاں جلسے ہوئے جس میں خاکسار کو آنر کیا گیا۔ مبارکباد کہ شگوفہ یہاں خوب کھل رہا ہے۔ پھول رہا ہے اور پھل لا رہا ہے اور آپ کی لگن اور محنت کا چرچا عام ہے۔ یہاں آنے پر ایک مضمون لکھا ہے، شگوفہ میں امکانی اشاعت کے لیے بھجوا رہا ہوں امید کہ پسند خاطر ہوگا۔ اس مضمون کو E-mail پر بھیج رہا ہوں۔

آپ سے مشتاق ملاقات۔

منظور الامین، جدہ

www.taemeernews.com

محبی مصطفیٰ کمال

مہینے کی ۱۳ تاریخ گزرنے نہ پائی کہ ہمیشہ کی طرح 'شگوفہ' آ موجود ہے۔ مصطفیٰ شہاب نے بڑے ہی اہم موضوع پر احباب کی توجہ دلائی ہے۔ اس پر ہم سب کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ موصوف بڑے ہی شائستہ اور پرخلوص شخصیت کے حامل ہیں۔ لندن میں رہ کر حیدرآبادیوں کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ شاعری دیر سے شروع کی لیکن اچھی کی۔ 'میرے رونے نے کہہ دیا سب کچھ' میں بہت سی آرزوئیں اور ہدایتیں پوشیدہ ہیں۔

جاوش میسری کا تعارف کرواتے ہوئے انہوں نے تکلف سے کام لیا ہے۔ دیکھیے سیدھے سادے عام موضوعات پر کتنے اچھے شعر ہیں۔

ہم نے ملا کے تار سے کچھ تار
اپنا گھر روشن کیا تو شہر کی بجلی چلی گئی

دوسرا شعر ہے

ٹکرا گئی تھی میری سائیکل سے بس
اتنے سے حادثہ میں جوانی چلی گئی

بھلے سے ان اشعار کے کچھ اور معنی تلاش کیے جائیں۔ میں تو سوچتا ہوں کہ پہلے شعر میں کرپشن کو اور صاحب اقتدار کے رویے کو۔ دونوں کو علاحدہ رکھتے ہوئے یا پھر ایک ساتھ شہر کی حالت زار سے جوڑا جاسکتا ہے اور ماتم کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے معنی چار پہیوں والی بس سے بھی وابستہ ہوسکتے ہیں۔ ایک انجانے سیکل سوار نوجوان کی سیکل 'بس' سے ٹکرا گئی تو انجام کار سارے اعضا کو مفلوج کر گئی۔ غلطی سیکل راں کی ہو کہ یا بس ڈرائیور کی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دوسرا لطیف پہلو عشق کا ہے جو شاید فن کار کے ذہن کے مطابق ہے۔ بس اتنی سی بات تھی کہ وہ سیکل سے ٹکرا گئی (ضروری نہیں کہ وہ پہلے سے محبوبہ ہو) پر وہ اپنے ساتھ اہل دل کی جوانی نچوڑ لے گئی۔

یہی تو کمال ہے کہ ایک اردو داں جو شعری آہنگ سے واقف ہو اپنے حقیقی جذبات کا اظہار غزل میں حسن وخوبی سے کرسکتا ہے۔ البتہ بعض غزل گو ساری عمر غزل لکھتے رہے لیکن ایسا دل گداز شعر نہ کہہ سکے۔۔۔

قدیر زماں، حیدرآباد

محترمی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب

مارچ کا شمارہ پڑھا اور پڑھتا گیا۔ عطاالحق قاسمی کا طنزیہ، مزاح نگاری ایک دیو کے ساتھ ہاتھا پائی کا نام ہے، حقیقت کا آئینہ رہا۔ کافی دیر تک ہنستے رہے۔ فیاض احمد فیضی نے 'ایک خط۔ چھوٹے بھائی کے نام' میں کچھ ایسے تعزیتی خطوط درج کیے ہیں۔ جس میں گہری تنقید ہے طنز ہے مگر مزاح کا رنگ نہیں۔ نادر خاں سرگروہ کا 'چوڑی اور چلن'، کاش یہ چلن ابھی باقی رہتا۔ مضمون نے پرانے دور کی یاد دلادی۔ ڈاکٹر فرزانہ فرح کا 'کار جہاں دراز ہے'۔ میں کار کا ذکر ہے۔ آج کار رکھنا ہاتھی پالنے کے برابر ہے۔ مضمون چٹ پٹا لگا۔ سید اعجاز شاہین نے آہٹ نورانوی کی کتاب 'چھپکلیوں کا جلوس' کا تبصرہ Extra Ordinary طور پر کیا ہے۔ ویسے ہم کرناٹک کے باشندے رہ کر آہٹ کرناٹکی سے واقف نہیں تھے۔

مسیح انجم نے 'شرعی شادی؟' کی بربادی کا خوب نقشہ کھینچا تھا۔ ڈاکٹر حمیرہ سعید کے 'ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں' کا مشورہ معقول لگا۔ زبان کو کنٹرول میں رکھئے گا۔ ورنہ انجام برا ہوگا۔ رشید عباس نے 'پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار' آج کے دور کا المیہ ہے۔ کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ ذہنی وجسمانی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مضمون میں طنز کے ساتھ ساتھ مزاح کا پہلو بھی نظر آیا۔ جاوید نہال حشمی کی 'ہائے ہائے یہ مجبوری' ایک عدد بغیر نخرے دکھائے کوئی کام والی کہاں مل سکتی ہے۔ اس مجبوری کو طنز ومزاح کے ذریعہ خوب اظہار خیال کیا ہے۔

ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی نے 'کمپیوٹر اور وائرس' میں وائرس سے دور رہنے کی بات کہی ہے مگر بھلا آج کون سنتا ہے۔ مضمون مزہ دے گیا۔ منظور عثمانی کا تبسم بھرا مضمون 'ہم تبسم میں نہاں اشک رواں رکھتے ہیں' میں تبسم کی جھلک نظر آئی۔ عابد مرزا کا پریشانی سے مقابلہ ہاتھی سے مقابلہ کرنے کے برابر ہے۔ مضمون سکون دے گیا۔ ابن صفی کی قسط ۱۸ 'تزک دو پیازی' دل بہلا گئی۔ چورن (منظومات) tasty لگے۔۔۔

ضیا جعفر، بنگلور، کرناٹک

www.taemeernews.com

اداریہ

شگوفہ کی یہ روایت رہی کہ ہر سال جنوری میں سالنامہ اور زندہ دلان حیدرآباد کی تقریبات کے موقع پر سوونیر شائع ہو۔ اس کے علاوہ ۴۴ سال کے عرصے میں طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقی سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہوئے ۷۰ سے زائد گوشوں پر مشتمل شمارے شائع کیے گئے۔ نیز طنز و مزاح کے مختلف موضوعات پر 30 خصوصی نمبر بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں وہ خصوصی اشاعتیں بھی شامل ہیں جن میں نامور اور معروف طنز و مزاح نگاروں کی منتخب تخلیقات شامل کی گئیں اور ان پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اردو نثر میں باضابطہ طنز و مزاح نگاری کی ابتدا غالب کی نثر کے اعلیٰ معیار سے ہوئی۔ طنز و مزاح نگاروں پر شگوفہ کی خصوصی اشاعتوں کے سلسلے کا آغاز بھی 'حیوان ظریف غالب نمبر' (ڈیڑھ ماہی مارچ اپریل ۱۹۶۹ء) سے ہوا۔ جسے رشید حسن خاں نے غالب صدی تقاریب کے موقع پر شائع ہونے والے برصغیر کے خصوصی نمبروں میں اپنے طرز کا واحد اور بے مثال نمبر قرار دیا تھا۔ اس کے بعد بھارت چند کھنہ (ڈیڑھ ماہی جنوری فروری ۱۹۷۲ء) نریندر لوتھر (ستمبر ۱۹۷۳ء) سلیمان خطیب (دسمبر ۱۹۷۵ء) تخلص بھوپالی (نومبر ۱۹۷۷ء) ابراہیم جلیس (مئی ۱۹۷۸ء) کنھیا لال کپور (جنوری ۱۹۸۱ء) خواجہ عبدالغفور (جون ۱۹۸۴ء) اکبری اقبال (اپریل ۱۹۸۶ء) مجتبیٰ حسین نمبر (نومبر ۱۹۸۷ء) رشید احمد صدیقی (دسمبر ۱۹۹۵ء) یوسف ناظم (جون ۲۰۰۴) اور بعض دیگر ممتاز مزاح نگاروں پر خصوصی نمبر یا شمارے شائع کئے گئے۔ اس کے علاوہ برق آشیانوی، شوکت تھانوی، دلیپ سنگھ، اسمعیل ظریف، مسیح انجم، عاتق شاہ، شفیق الرحمٰن، شفیقہ فرحت، وجاہت علی سندیلوی، یوسف ناظم اور طالب خوندمیری کے نام ایک مکمل شمارہ وقف کرتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

طنز و مزاح کے موجودہ منظر نامے میں نصرت ظہیر اس عہد کے نمائندہ طنز و مزاح نگار ہیں جو کوئی تیس سال سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ وہ سیاست کے پیچ و خم سے واقف ایک مقبول عام کالم نگار، سماج کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے والے طنز نگار، ہمدردانہ شعور کے حامل اپنی اور اپنے معاشرے کی کمزوریوں پر ہنسنے والے مزاح نگار ہیں۔ زیر نظر "نصرت ظہیر نمبر" شگوفہ کے خصوصی نمبروں میں کئی اعتبار سے ایک اہم اضافہ ہے۔ اس شمارے میں نصرت ظہیر کے فن اور شخصیت پر پوری توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ مشاہیر و نقادوں کے مضامین کے مطالعہ سے نصرت ظہیر کے مزاج اور مزاح اور تخلیقی رجحان کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ایک اہم طنز و مزاح نگار کی تخلیقی صلاحیتوں کا ہم نے اب تک موزوں اعتراف نہیں کیا تھا۔ نصرت ظہیر کی بیشتر تحریریں کالم کی وساطت سے سامنے آئی ہیں۔ یہ کالم عصری مسائل کا انبار اٹھائے ہوئے ہیں۔ نصرت ظہیر نے خود اعتراف کیا ہے کہ ناسٹالجیا ان کی کمزوری ہے لیکن دراصل وہ اپنی تحریروں میں اپنے عہد کے ساتھ چلتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر صحافی ہیں، ایسے صحافی جو عوامی مسائل کے درمیان جیتے ہیں اور ان واقعات کو قلم بند کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کے قاری کا تعلق ملک کے لسانی نقشے میں جائز مقام سے محروم زبان اردو سے ہے۔ اس زبان کے بولنے والے نا آسودگی و نارسائی کے ماحول میں پل رہے ہیں لیکن محرومیوں کے ہجوم میں جینا ہنسنا بولنا اور اپنا حق حاصل کرنا سیکھ لیا ہے۔ کالم نگار نصرت ظہیر اس طبقے کے لیے لکھتے اور اس کے جذبات کی ترجمانی و تسکین کے سامان مہیا کرتے ہیں۔

www.taemeernews.com

طنز و مزاح کی صورت گری و فروغ میں اردو صحافت نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ نصرت ظہیر اس روایت کے امین و نقیب ہیں۔ وہ کسی کے مقلد نہیں، اپنی راہ آپ بنائی ہے۔ بعض نقادوں نے فکر تونسوی کے ساتھ ان کا نام لیا ہے۔ سیاسی سماجی موضوعات پر دونوں نے کالم لکھے ہیں، دونوں کے کمٹ منٹ میں یکساں توانائی ہے۔ دونوں کی تحریروں پر طنز حاوی ہے۔ لیکن ان کے اظہار کا انداز مختلف ہے۔ فکر تونسوی کے ہاں کس قدر یکسانیت نظر آتی ہے جب کہ نصرت ظہیر نے خود کو دہرایا نہیں اور کالم کے کینوس کو وسیع سے وسیع تر کیا ہے۔ اتنا وسیع کہ اس کی حدیں ادب کی سلطنت میں داخل ہوگئیں۔ ادبی ہیئتوں کے وہ پابند نہیں۔ انہوں نے نثری پیروڈیاں خوب لکھی ہیں۔ انشائیے کم اور خاک اڑانے کا کام کالم ہی میں کر جاتے ہیں۔ اسی طرح سفرناموں، روداد وں، رپورتاژ، نقد و تبصرہ و تاثرات کو بھی وہ کالم میں سمیٹ لیتے ہیں۔ مزاح پیدا کرنے کی وہ شعوری کوشش نہیں کرتے۔ اس کا اہتمام کرتے تو شاید شہرت زیادہ حاصل ہوتی!۔ ادب کے چسکے کے ساتھ صحافت سے وابستگی کے باوجود نصرت ظہیر نے اظہار کے فطری رویہ کو اپنایا۔ مصنوعی فضا میں سانس لینا انہیں پسند نہیں ہے۔ وہ ثقیل زبان کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں۔ سادگی ان کی تحریروں پر سایہ فگن ہے اور آج کی عام زبان اپنی تخلیقات میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں جس میں انگریزی کے لفظ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ ریڈیو اور ٹی وی کے لیے بھی خوب لکھتے رہے ہیں۔ کارٹون سازی سے بھی انہیں دلچسپی رہی ہے، جس کے نمونے اس شمارے میں شریک ہیں۔ نصرت ظہیر شاعر کی حیثیت سے بھی مقبول ہیں۔ چنانچہ چند سنجیدہ غزلیں و نظمیں اس خصوصی نمبر میں شامل کی گئی ہیں۔۔

''نصرت ظہیر نمبر'' طنز و مزاح کی تنقید کا ایک اہم باب ہے، جس کی مہمان ادارت کے لیے میں نے نصرت ظہیر کے دیرینہ قریبی رفیق پروفیسر ظفر الدین، جن کے ساتھ اردو یونیورسٹی میں میں نے کوئی سات سال گذارے، کی خدمات حاصل کی تھیں تاکہ نصرت ظہیر کی شخصیت اور فن کار کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہے۔ خصوصی نمبر کے مطالعہ پر قاری محسوس کریں گے کہ ہم اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے ہیں۔ طنز و مزاح کے قاری اور نقاد یقیناً اس خصوصی نمبر سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس شمارے میں طنز و مزاح کے فروغ پر اٹھائے گئے بعض سوالات پر آئندہ ہم تفصیل سے غور کرسکیں گے۔

● حیدرآباد کے رفقائے ادب میں علی ظہیر، شمشیر کوڑنگلی، نصرت محی الدین اور محمد علی منگلی پچھلے ایک ماہ میں ہم سے بچھڑ گئے۔ علی ظہیر سے میرے قریبی مراسم تھے۔ وہ کامیاب انجینئر تھے، لیکن ان کا زیادہ وقت اردو والوں کی نظر ہو جاتا تھا۔ علم دوست اور باخبر انسان تھے۔ حیدرآباد میں جدید ادب کے فروغ میں ان کا اہم حصہ تھا۔ ادارہ 'حلف' سے وابستہ تھے۔ شمشیر کوڑنگلی کا تعلق آندھرا پردیش کے ضلع محبوب نگر سے تھا۔ برسوں قبل انہوں نے اپنی نظموں سے زندہ دلان حیدرآباد کے کل ہند مشاعروں میں زندگی پیدا کی تھی۔ مسلسل کئی سال تک ان مشاعروں میں پابندی سے شریک رہے۔ مخدوم محی الدین کے صاحبزادے نصرت محی الدین نے ۱۹۶۹ اور ۱۹۷۰ء میں اردو تحریک میں نوجوانوں کی قیادت کی تھی۔ انجمن ترقی اردو اور کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن تھے۔ ناانصافیوں اور استحصال کے خلاف ہر قسم کی سرگرمیوں میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ ان حضرات کے انتقال پر ادارہ شگوفہ سوگوار ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔۔ آمین۔

● یہ خصوصی شمارہ میرے عرب امارات کے ۱۶ روزہ دورے کی وجہ سے کسی قدر تاخیر سے شائع ہو رہا ہے، لیکن مئی کا شمارہ وقت پر ارسال ہوگا۔۔

Registered with Registrar of
News papers for India
Under RNI No. 15822/68
Vol. 46, Issue : 4, April 2013

45th Year of Publication
SHUGOOFA MONTHLY
Nusrat Zaheer Number
10-4-771/82/A/1, Masab Tank, Hyderabad - 500 028.

Postal Reg No.
H-HD-GPO / 014/ 2012 - 14
Pages : 184 Price : Rs.300/-

FAROOKY
TOOTH POWDER

فاروقی ٹوتھ پاؤڈر

قدرتی اجزاء اور آزمودہ یونانی فارمولہ سے تیار کیا گیا
جو آپ کے دانتوں اور مسوڑھوں کی
مکمل حفاظت کرتا ہے۔

تیار کردہ : کارخانہ زندہ طلسمات، عنبرپیٹ، حیدرآباد۔